عُلمائے اہلِ سُنّت کی بَصیرت وقیادت

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دهلی ۲۵

بانیِ رُکن المجمعُ الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

موبائل نمبر: 09350902937

طابع وناشر

مجلسِ فِکرِ رضا۔ ۱۰۹۰ البستی جو دِھیوال، لُدھیانہ، پنجاب (انڈیا)

موبائل نمبر: 09417049590

09815130892

سلسلۂ مطبوعات (۲۷)

نام کتاب	عُلمائے اہلِ سُنّت کی بَصیرت وقیادت
مؤلف	یٰسٓ اختر مصباحی
طبعِ اول	۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء۔
زیرِ اہتمام	دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
طابع وناشر	مجلسِ فکرِ رضا، لُدھیانہ، پنجاب
صفحات	چار سو بتّیس (432)
قیمت	دو سو اسّی روپے (=/280)

کمپوزِنگ: محمد شمس الدین مصباحی/محمد وسیم مصباحی دارُالقلم، دہلی

رابطہ کا پتہ

دارُالقلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر (جوگا بائی ایکسٹینشن)

جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025 (انڈیا) فون: 011-26986872

کتاب ملنے کے پتے

(۱) کتب خانہ امجدیہ۔ ۴۲۵۔ اردو مارکیٹ، مٹیا محل، دہلی ۶

(۲) نوری کتب خانہ۔ سنی نوری جامع مسجد، شیوپوری، لُدھیانہ، پنجاب

(۳) فیضی کتاب گھر، مہسَول چوک۔ سیتامڑھی۔ بہار

(۴) رضوی منزل۔ دَھر ہَر وَا۔ وایا پریہار۔ سیتامڑھی۔ بہار

(۵) مفتی احسنُ الہدیٰ مصباحی۔ خطیب وامام مسجد غریب نواز۔ لُدھیانہ۔ پنجاب

تهدیه! بخدمت

مُجدِّدِ الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی (ولادت ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء۔ وصال ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء)

اِمامُ المحدِّثین شاہ عبدالحق مُحدِّث دہلوی (ولادت ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء۔ وصال ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء)

اِمامُ الھند شاہ ولی اللہ مُحدِّث دہلوی (ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء۔ وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)

بَحرُ العلوم علاَّمہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوَی (ولادت ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء۔ وصال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)

شمسُ العارِفین سید شاہ آلِ احمد اَچھے میاں قادری برکاتی مارَہروی (ولادت ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۶ء۔ وصال ۱۲۳۵ھ/جنوری ۱۸۲۰ء)

سراجُ الھند شاہ عبدالعزیز مُحدِّث دہلوی (ولادت ۱۱۵۹ھ/۱۷۴۵ء۔ وصال ۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء)

امامُ الحکمۃ والکلام علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی (ولادت ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء۔ وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)

سیفُ اللہ المسلول علاَّمہ فضلِ رسول عثمانی بدایونی (ولادت ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء۔ وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)

خاتمُ الاکابر سید شاہ آلِ رسول احمدی برکاتی مارَہروِی (ولادت ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء۔ وصال ذوالحجہ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء)

استاذُ العلماء مفتی ارشاد حسین مُجدِّدی رام پوری (ولادت ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء۔ وصال ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)

تاجُ الفحول علاَّمہ عبدالقادر عثمانی قادری برکاتی بدایونی (ولادت ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء۔ وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء)

حافظِ بخاری خواجہ سید عبدالصَّمد مودودی چشتی سَہسوانی (ولادت ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء۔ وصال ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء)

خاتمُ الحکماء علاَّمہ ہدایت اللہ رام پوری ثُمَّ جون پوری (وصال یکم رمضان ۱۳۲۶ھ/۲۷ ستمبر ۱۹۰۸ء)

امامِ اہلِ سنَّت مفتی الشاہ محمد احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی (ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء۔ وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)

رئیسُ المحدِّثین سید دیدار علی شاہ اَلوَرِی ثُمَّ لاہوری (ولادت ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء۔ وصال ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء)

شیخُ المشائخ سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (ولادت ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء۔ وصال ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء)

عارفِ حق سید شاہ مہر علی چشتی گولڑوِی پنجابی (ولادت ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء۔ وصال ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء)

صدرُ الشریعہ مولانا حکیم مفتی محمد امجد علی اعظمی رضوی (ولادت ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء۔ وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء)

صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (ولادت صفر ۱۳۰۰ھ/جنوری ۱۸۸۳ء۔ وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء)

انتساب

سَوادِ اعظم اہلِ سُنَّت کی عظیم مرکزی درس گاہ

الجامعۃُ الاشرفیہ

مبارک پور

کے نام

جس کی تعلیم وتربیت اور دینی وعلمی وفکری ودَعوتی ماحول کی یہ تاثیر اور فیضانِ عام ہے کہ

جو ذَرَّہ یہاں سے اُٹھتا ہے وہ نَیِّرِ تاباں ہوتا ہے

یکے از فرزندانِ اشرفیہ

یٰسٓ اختر مصباحی، دارُالقلم، دہلی

فہرستِ کتاب

شَذرات ولَمُعات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

وَمَااَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَيۡدِيۡکُمۡ وَيَعۡفُوا عَنۡ کَثِيۡرٍ۔
(سورۂ شُوریٰ: ۴۲۔آیت: ۳۰)

اور تمہیں جو مُصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا۔اور بہت کچھ تو وہ معاف فرمادیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰـهَ لَايُـغَيِّرُ مَا بِقَومٍ حَتّٰى يُغَيِّرُ وامَابِاَ نۡفُسِهِمۡ ۔(سورۂ رَعۡد :۱۳۔آیت:۱۱)

بے شک !اللّٰہ کسی قوم سے اپنی نعمت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دیں۔

تِـلۡکَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ لَهَا مَاکَسَبَتۡ وَلَکُمۡ مَاکَسَبۡتُمۡ وَلاتُسۡئَلُوۡنَ عَمَّا کَانُوا يَعۡمَلُوۡنَ۔(سورۂ بقرہ:۲ ۔آیت: ۱۴۱)

وہ ایک گروہ ہے کہ گذر گیا ۔ان کے لئے اُن کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی۔اوران کے کاموں کی تم سے پُرسش نہ ہوگی۔

حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَکِيۡلُ(سورۂ آلِ عمران:۳۔آیت:۱۷۳)

اللّٰہ ہم کو بس ہےاور کیا اچھا کارساز ہے۔

لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِی رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌحَسَنَةٌ۔(سورۂ اَحزاب:۳۳۔آیت:۲۱)

بےشک !تمہیں رسول اللّٰہ کی پیروی بہتر ہے۔

کُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ۔(سورۂ آلِ عمران:۳۔آیت:۱۱۰)

تم بہتر ہو اُن سب اُمّتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں ۔ بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو۔اور اللّٰہ پر ایمان رکھتے ہو۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نورِ بَصِیرت

فَردومعاشرہ، ملک ومِلّت ،قوم ووطن، تنظیم وجماعت وغیرہ کا آفتابِ اِقبال طُلوع وغُروب ہوتا رہتا ہےاوران کے اَحوال وظُروف اُلٹتے پلٹتے اوراَدلتے بدلتے رہتے ہیں۔ گردشِ ایام کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ تنزُّل واِنحطاط اورعُروج وترقی کے اَدوار آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہی نظامِ کائنات ہے ۔اور خالقِ کائنات کی مَشیِّت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔مگر دین، وہ دین جس کا نام اسلام ہےاور جورَب تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے،اس میں کبھی کوئی تغیُّر وتبدُّل نہ ہُوا اَورنہ ہوسکتا ہے۔اس کے اصول محکم اوراس کے ارکان مستحکم ہیں۔اس کی اَساس پائدار اوراس کی بنیاد غیرمتزلزل ہے۔

اورشریعتِ محمدی جوآخری شریعتِ اسلامی ہے وہ بہت ہی جامع ، بہت ہی حقیقی وفطری،اور بے حدنُمو پذیر ہے۔اس کے اندرنہ ایسی حُرِّیّتِ مُطلَقہ ہے کہ جوچاہے وہ اپنے جی سے کچھ بھی گڑھ لے اور نہ ایساجُمودِ مَحض ہے کہ رفتارِ زمانہ کونظرانداز کر کے اس سے بِالکل غافل وبے نیاز ہوجائے اورعصری تقاضوں کی جائز تکمیل پرقادِرنہ ہوسکے۔

یہ شریعت چوں کہ دائمی ہےاس لئے اس کی اَساس اوراس کا نظام بھی دَوَامی ہےاور اس کی اہمیت واِفادیت بھی لاابُدِّی ہے۔اس شریعت کا سَرچشمہ کتابُ اللہ اورسُنَّتِ رسولُ اللہ ہے۔اوریہی کتاب وسُنَّت ہدایتِ انسانی کامنبع اوراس کامَخزن ہیں۔جن کے نقوش وآثار پیغمبرِ اِسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام وتابعین وتبع تابعین

رِضوانُ اللّٰہِ عَلَیہِم اَجمَعِین کےاَعمال واَفعال اوراِرشادات واَقوال میں ملتے ہیں اوران کی مبارک ومسعود زندگیاں خیرُ القرون کےانوار وتجلّیات سے روشن ومنوَّر رہیں۔

اس شریعتِ مطہَّرہ کوسمجھنے سمجھانے،اس کےاصول وقوانین مُرتَّب کرنے،ہرشعبۂ حیات میں اس سے رہنمائی حاصل کرنے،اورنوعِ انسانی کواس کی روشنی میں خوب وناخوب، جائز وناجائز اورحلال وحرام کی تمیز سکھانے میں ائمۂ مجتہدین وفُقَہا وعُلَماے راسخین نے اپنے دل و دماغ کی ساری توانائیاں نچوڑکر کےاُمَّتِ مسلمہ کوایسا اَثاثہ اورسرمایہ فراہم کردیا ہےجس سے دنیا کی دیگراَقوام ومِلَل محروم وتہی دست ہیں اورساری دنیا کےنمائندگانِ مذاہب کے سامنے یہ اُمَّتِ مسلمہ دعویٰ کرسکتی ہےاوراس کادعویٰ بجاطور پرمکمل صحیح اورصدفی صد درست ہوگا کہ:

شریعتِ اسلامیہ جامِعُ الشَّرائِع بھی ہےاور خاتِمُ الشَّرائِع بھی ہے۔

فَلِلّٰہِ الحمدُوَالشُّکرُ ولَہُ الْمِنَّۃُ والاِحسَانُ ومِنہُ التَّوفِیقُ والغُفرَانُ، وعَلیہِ التُّکلاَن۔ وھُوَ المُوَفِّقُ والمُستَعَان۔

علمِ دین کی تحصیل واِکتساب سے بہرہ وَرہونا بڑی سعادت واَرجمندی کی بات ہے اورعالمِ دین وعارفِ حق کافضلِ الٰہی وتوفیقِ ربانی سے سرفراز ہونا اس سے بڑی نعمت اور دارین کی فلاح وکامرانی کی قابلِ رشک ضمانت ہے۔

سرزمینِ ہند کےاکابرصوفیہ ومشائخِ کرام اوراَجِلّۂ عُلماےِکرام **بِحمدہٖ تَبارک وتَعالیٰ** اس عظیم سعادت سے سرفراز تھےاوران کے دم قدم اور فیضان وبرکت سے ہردور میں ہندوستان کے اندراسلام کی شمع روشن رہی اورایمان کی بادِبہاری سےاس کا ہرخِطّہ لہلہاتا اوراس کی آب وہَوااِعطر بیز ومُشک بارہوتی رہی ہے۔عَہد بہ عَہد شمعِ ایمان کی لَو اوراس کی روشنی تیزتر ہوتی گئی اورچراغ سے چراغ جلتے چلے گئے ہیں۔

اُن کا سایہ اک تجلی، اُن کا نقشِ پا چراغ
وہ جِدھر گذرے، اُدھر ہی روشنی ہوتی گئی

دُعاۃ ومُبلِّغینِ اسلام اورصوفیہ ومشائخِ کِرام نے اپنے اَخلاق وکرداراور روحانی

جَذب وکشِش سے لاکھوں انسانوں کے قلوب کو اپنا گرویدہ اور پھر انہیں حلقہ بگوشِ اسلام بنادیا۔علُماے کرام نے اپنےعلم واِستدلال کی قوت سے نہ جانے کتنے انسانوں کی عقلوں کو مسخَّر و مطمئِن کر کے انھیں یقین و اذعان کے اُجالے میں لا کھڑا کیا اور اسلامی ہدایات وتعلیمات سے اُن کا رِشتہ جوڑ کر اُن کی بے سَمت زندگی کا صحیح رُخ متعین کر دیا۔

انسانی زندگی کے شب وروز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جب زلزلہ آتا ہے،طوفان اُٹھتا ہے، تیز وتند آندھی چلتی ہے تو بہت سے سَر بفلک محلاّت اور سنگین قلعے مِسمار اور ریزہ ریزہ ہوکر زمین پر بکھر جاتے ہیں۔ بڑے بڑے پیڑ جڑ سے اُکھڑ جاتے ہیں۔ان کی شاخیں اپنے تنے سے جُدا ہوکر زمین پر آجاتی ہیں۔لیکن ایسے حادثات عموماً اُسی وقت ہوتے ہیں جب ان چیزوں کی جڑیں زمین کے اندر دور تک پیوست نہ ہوں۔ان کا رِشتہ اپنی اصل کے ساتھ بہت زیادہ جُڑا ہُوا نہ ہو۔ان کی شاخوں کا اپنے تنے سے اور رگ وریشے کا ایک دوسرے سے بہت مضبوط رِشتہ نہ ہو۔

یہی حال اُس وقت ہوتا ہے جب کسی دور کے عُلما کے سامنے انقلابات کی آندھیاں چلتی ہیں۔نت نئے تقاضوں کا ہجوم ہوتا ہے۔جدید مسائل ومباحث سَر اُٹھاتے ہیں۔اَوہام وشکوک کے بادل چھا جاتے ہیں۔مذہب کے گرد خطرات منڈلانے لگتے ہیں۔اصولِ شریعت کو بالائے طاق رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔حالات کے دھارے میں بَہنے پر زور دیا جاتا ہے۔قومی وملّی عِزَّت ووقار کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔غیروں کی طرف لپک بڑھتی ہے۔اپنوں کی اَن دیکھی کی جانے لگتی ہے اور اَحکامِ شریعت ومَفاداتِ مِلَّت کو داؤ پر لگایا جانے لگتا ہے۔

طبقۂ عُلما میں جو دینِ قویم پر مُستقیم،شریعتِ اسلامی سے سرتاپا مُنسلِک ومتعلّق اور اس کے اصول وقواعد سے وابستہ اور ان پہ قائم رہنے کے ساتھ ایمانی فہم وفراست کے مالک اور بصیرت واِستقامت کے حامل ہوتے ہیں وہ کوہِ وقار کی طرح اپنی جگہ جَمے رہتے ہیں۔ خطرات کی زد میں شمعِ ایمان کی لَو مَدّھم نہیں ہونے دیتے اور اصولِ شریعت پر اِستقامت کا غیر معمولی جرأت مندانہ مظاہرہ اور اپنی قوم ومِلّت کی صحیح قیادت ورَہبری کرتے ہوئے اپنے

دَور کی تاریخ میں عزیمت واِستقامت کا ایک نیا باب رَقم کرتے ہیں۔

دینی خیالات میں تزلزل کی ایک عبرت ناک اور دین پر استقامت کی ایک فکر انگیز تاریخ عہدِ اکبری سے وابستہ ہے۔جو اِس طرح ہے کہ مغل باشاہ جلال الدین محمد اکبر کی علم سے دوری اور صحیح تربیت وصحبت سے محرومی نے فکری اِنحراف اور ذہنی آوارگی کے اپنے دَور میں ایک بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

مؤرخین اس کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے مختلف اَدیان ومذاہب کے عُلما کو اپنے دربار میں جمع کرکے ان کے لئے فتح پور سیکری میں ۹۸۲ھ/۱۵۷۵ء میں ایک ایسا جماعت خانہ بنا رکھا تھا جس میں جمع ہو کر وہ سب مذھبی بحث ومباحثہ کیا کرتے تھے۔اور اکبر اس مباحثہ کو بڑے غور سے سنا کرتا تھا۔یہیں سے اس کا ذہن انتشار وآوارگی کی طرف مائل ہوا۔

دوسرا سبب مؤرخین یہ بتاتے ہیں کہ اس نے جے پور (راج پوتانہ) کے راجہ بہادر مَل کی پیش کش پر اس کی بیٹی جُودھابائی سے شادی کر لی تھی جس نے اکبر کی گمراہی اور ہندوؤں کی طرف حد سے زیادہ مَیلان کی راہیں ہموار کیں۔تبدیلی کے اس عمل میں بعض دوسری رانیوں کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔بقول ملاّ عبد القادر بدایونی:

''دُخترانِ راجہاے عظیم ہند نے بادشاہ کے کان بھرے کہ اس نے ملاّؤں کو ایسا سَر چڑھا لیا ہے کہ وہ منشاے سلطانی کی بھی پروا نہیں کرتے۔'' (ص۸۳۔منتخبُ التواریخ۔جلدِ سوم)

دونوں نقطہ ہاے نظر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل دو تحریریں ملاحظہ فرمائیں:

''اکبر کے لئے ایک بڑی آزمائش کی بات اور اسلام سے اس کے مزاج کے مُنحرِف ہونے کا ایک قَوِی سبب یہ تھا کہ:

اس نے اِستحکامِ سلطنت کے لئے راج پوت راجاؤں کے ساتھ رِشتے ناطے کیے اوران کا اعلیٰ ترین منصب پر تقرر کیا۔اوران کا پورا اعتماد حاصل کرنے اور ان کو شیر وشکر کرنے کے لئے بہت سے ایسے کام کیے جو اس سے پیش رَو سلاطین نے ابھی تک نہیں کیے تھے۔مثلاً

ذبح گاؤ کی ممانعت، آفتاب کے رُخ بیٹھ کر جھَروکہ درشن، داڑھی منڈانا، بھدرا کرنا، قشقہ لگوانا، ہندورانیوں کے ساتھ مل کر تمام ہندوانہ رسوم میں حصہ لینا۔

ان ہندو رانیوں کا اوران کے واسطہ اور رشتہ سے ان کے بھائیوں اورعزیزوں کا اکبر پر خاصا اثر تھا۔ اور یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ دین کے ایوان میں سب سے پہلا تزلزل جو واقع ہواوُہ اسی تعلق کا نتیجہ تھا۔''

(ص ۱۰۷۔ تاریخِ دعوت وعزیمت ۔ حصہ چہارم ۔ مؤلّفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ مطبوعہ مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اسلام ۔ ندوۃ العُلما۔ لکھنؤ)

''اکبر کوگمراہ کرنے میں اُن عُلما کا زیادہ حصہ تھا جوسابقہ حکومتوں میں حکمرانوں کی سرپرستی سے مستفیض اور بہ حیثیتِ حاکم دوسروں پر حکومت چلانے کے عادی تھے۔

ان عُلما نے مَہدویت کی مخالفت سے پیدا ہونے والے حالات اورعوامل سے بھی چشم پوشی کی اور مُستزاد یہ کہ عُلما آپس میں ایک دوسرے کی تحقیر، تضحیک وتنقید کرتے تھے۔''

(ص ۱۱۱ و۱۲۱۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا کردار۔ مؤلّفہ ایچ ،بی۔ خان۔ مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ وثقافت۔ اسلام آباد، پاکستان۔ ۱۹۸۵ء)

ان تشویشناک اورسنگین حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیخ مبارک ناگوری نے اکبر کا ذہن مسموم کر کے اسے اسلام ہی سے برگشتہ کردیا اور اکبر کے مؤیّدانہ رُجحانات کو دیکھتے ہوئے اس نے اسے یہ باور کرادیا کہ وہ خود اپنے تدبر وبصیرت کے لحاظ سے ان عُلما سے فائق وبرتر ہے۔ اور پھر اگست ۱۵۷۹ء میں اس نے اکبر کی طرف سے ایک مَحضر نامہ جاری کرادیا کہ اکبرہی امامِ وقت، امامِ عادل اور مجتہدُ العصر ہے۔ اس کے بعد اکبر نے اپنے کچھ ضوابط وقواعد مرتّب کراکے اور مختلف مذاھب کے احکام ومسائل جمع کر کے حکومتی سطح پر اس کے نفاذ کی کوشش شروع کردی۔ یہ مَحضر اور مجموعۂ احکام ۱۵۸۲ء میں اکبر نے جاری کیا جسے تاریخ میں ''آئینِ اکبری'' یا ''دینِ الٰہی'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

سرزمینِ ہند پہ کے قویُّ الایمان اَصحابِ عزیمت میں مجدّدِ الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی

سرہندی (وصال صفر ۱۰۳۴ھ/دسمبر ۱۶۲۴ء) اِمامُ المحدِّثین شاہ عبدالحق محدّث دہلوی (وصال ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/جون ۱۶۴۲ء) کے اَسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔ جنھوں نے ''آئینِ اکبری'' و''دینِ الٰہی'' کا بڑی پامردی وجراَتِ ایمانی کے ساتھ مقابلہ کیا اور عہدِ اکبری وجہانگیری کے اِلحادو اِنحراف وکفر وضلال کی اُن تیز وتُند آندھیوں اور طوفانوں کا رُخ پھیرنے کی کامیاب جِدّ وجُہد کی جو حکومت اور اِقتدار کی سَرپرستی وپُشت پناہی میں اُٹھی تھیں اور دین وشریعت کے اصول ومبادی کو پامال کر کے ملّتِ اسلامیہ کی شناخت ختم کرنے اور نئے دین کا ''مَعجُونِ مُرَکَّب'' تیار کرنے کے درپے تھیں۔ شعائرِ اسلام کی تحقیر واستخفاف اور شعائرِ کفر وشرک کی بالادستی اوران کی ترویج واشاعت پرآمادہ وکمربستہ تھیں۔

دورِ مابعد کی ایسی ہی مقتدر شخصیات میں ایک نام امامُ الھند شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اوران کے صاحب زادۂ جلیلُ القدر سراجُ الھند شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء) کا ہے جنھوں نے نشر واشاعتِ علمِ حدیث میں نمایاں کردارادا کیا، اسلام کی حکیمانہ ہدایات وتعلیمات، پیغمبر اسلام (صَلَّی اللّٰہ علیہِ وسلَّم) کے فرامین وارشادات کو درس وتدریس وتصنیف وتالیف کے ذریعہ اپنی علمی وفکری قوت کے ساتھ پیش کرنے کی سرزمینِ ہند میں ایک نئی طرح ڈالی۔

ان حضرات نے ایمان واسلام، سُنَّت وشریعت، تصوُّف وطریقت سب کا اپنے علم وقلم اورافعال واَقوال کے ذریعہ تحفُّظ ودِفاع کیا۔ سَر برآوردہ اُمَرَا وَحُکَّامِ وقت کو دین وشریعت کی طرف راغب کیا۔ اُمَّتِ مسلمہ کے مفادات کے تحفظ کی طرف انہیں متوجہ کیا۔ اِنحراف وگمرہی سے دور رہنے کی انہیں تلقین کی۔ اسلام کے اِعزاز واِکرام اور شریعتِ مطہَّرہ سے منسلک رہنے کی انہیں دعوت دی۔ اورنازک ترین لمحات واوقات میں وہ کشتیِ اُمَّت کے ناخدا اوراس کے محافظ ونگہبان بن گئے۔

بِالخصوص شیخِ محقّق شاہ عبدالحق محدِّث دہلوی (وصال ۱۰۵۲ھ ربیع الاول جون ۱۶۴۲ء) نے مدارجُ النبوہ واَشِعَّۃُ اللَّمعات ولَمعاتُ التنقیح وماثَبَتَ بِالسُّنَّۃِ وجَذبُ القلوب نیز دیگر کتب

ورسائل کے ذریعہ اُمّتِ مسلمہ کو ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے اپنا رشتۂ ایمان واِخلاص مضبوط و مستحکم کرنے کی دعوت دی۔ اورآپ کی محبت واِتباع کو کمالِ ایمان اور ذریعۂ نجات قرار دے کر اس متاعِ بے بہا کو اپنے سینے سے لگائے رکھنے اور اپنے دل کو اس سے روشن ومنوّر رکھنے کی تاکید و ہدایت کا روح پرور اور تاریخ ساز فریضہ انجام دیا۔ اسی طرح علمِ حدیث کے درس وتدریس کے ذریعہ سنّت وسیرتِ رسولِ اکرم صلّی اللّٰہُ علیہ وسلّم سے وابستگی واستحکام کی، مسلمانانِ ہند کو دعوت دی ۔ اوران سے شیفتگی وتعلّقِ خاطر کا ایمان افروز ماحول بنا کر انھیں دین کا صحیح شعور بخشا اور روحانی لذّت وحلاوت سے انھیں شادکام کیا۔

سراجُ الہند شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء) وبحر العلوم علاّمہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) نے اپنے درس وتدریس وکتب و رسائل اور اپنے تلامذہ کے ذریعہ اپنے عہد وعصر میں خدمتِ اسلام ومسلمین کی نہایت گراں قدر خدمت انجام دی اور اسلامیانِ ہند کی تاریخِ علم وفن کا درخشاں باب بن کر عرصۂ دراز تک آفاقِ ہند پہ چمکتے اور جگمگاتے رہے۔ اوران کے باکمال تلامذہ نے ہندوستان کے بے شمار خِطّوں کو علمِ دین کی گراں مایہ دولت سے مالا مال کردیا۔

شمسُ العارفین حضرت سید شاہ آلِ احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارَہروی (وصال ۱۲۳۵ھ/ جنوری ۱۸۲۰ء) اور خاتم الاکابر سید شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی مارہروی (وصال ذو الحجہ ۱۲۹۶ھ دسمبر ۱۸۷۹ء) نے تزکیہ واِحسان وتصوف وطریقت کی جو بساط بچھائی تھی اور فیض کا اُمنڈتا ہوا دریا رواں کیا تھا وہ بھی اپنے عہد کی اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

تقدیسِ اُلوہیّت وتعظیمِ نبوت پر حرف زنی وانگشت نمائی کی بادِسَموم جو بادیۂ نجد سے چل کر دہلی پہونچی تھی اس کا رُخ پلٹنے اور اس کے خلاف سینہ سپر ہونے والے شاہ مخصوصُ اللّٰہ دہلوی (وصال ۱۲رذوالحجہ ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۶ء) وشاہ محمد موسیٰ دہلوی (وصال رجب ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) فرزندانِ شاہ رفیع الدین دہلوی (وصال شوال ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء) فرزند شاہ ولی اللّٰہ محدّث دہلوی (وصال محرم ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور امامُ الحکمت والکلام علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی

(وصال ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) ومفتی صدرُ الدین آزردہ دہلوی (وصال ربیع الاول ۱۲۸۵/ ۱۸۶۸ء) وشاہ منورالدین دہلوی (وصال ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) ومولانا رشیدالدین خان دہلوی (وصال محرم ۱۲۴۳ھ/۱۸۴۹ء) ومولانا حیدر علی فیض آبادی (وصال ۱۲۹۹ھ/۸۲-۱۸۸۱ء) وغیرھُم تلامذۂ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے زرّیں کارناموں سے کون وسیعُ المطالعہ عالم ومؤرّخ واقف نہیں؟

۱۸۵۷ء اوراس سے پہلے کے سنگین ایام وواقعات میں تلامذۂ سلسلۂ عزیزی ولیُّ اللّٰہی ودیگر عُلماے اہلِ سنّت نے جس طرح مسلمانانِ ہند کی فکری قیادت کی اس سے مؤرخین اچھی طرح واقف ہیں۔

۱۸۵۷ء کے معرکۂ حَرب وضَرب تک بقیدِ حیات رہ جانے والے معروف عُلماے اہلِ سنت وتلامذۂ سلسلۂ عزیزی ولیُّ اللّٰہی نے اپنی فکر وبصیرت سے اسلام اور مسلمانوں کے پیچیدہ مسائل سُلجھانے اور مسلمانانِ ہند کی صالح قیادت ورہنمائی ورہبری کرنے میں اپنا صحیح کردار ادا کیا اور انگریزی تہذیب وتمدن نیز مغربی اِلحاد وبے دینی سے انھیں محفوظ رکھنے کی ممکن کوشش کے ساتھ انگریزی مظالم کا بھی مَردانہ وار مقابلہ کیا۔

اگر یہ عُلماے کرام اپنی بصیرت وفراست کے ساتھ اس طوفان کا مقابلہ نہ کرتے تو نتائج نہ جانے کتنے خطرناک ہوتے اور برطانوی اِستعمار، اس کے اِستحصال، پُرفریب اعلانات اور شاطرانہ اقدامات کا سیلاب نہ جانے کہاں جا کر رُکتا اور نہ جانے کن کن چیزوں کو اپنی رَو میں بہالے جاتا۔

کتاب کے آئندہ صفحات میں انگریزی مظالم اور عُلماے اہلِ سنّت کی مَساعی کا نہایت اِجمال واِختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے حقیقت اچھی طرح روشن ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی۔ اورآپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے عُلماے اہلِ سنّت ہی کی فکری بصیرت اور انھیں کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ لڑی گئی۔ اوراس سلسلے میں پروپگنڈہ کے ذریعہ جس ’’سلسلۂ اسمٰعیلی‘‘ (منسوب بہ شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی فرضی

تاریخ کو باور کرانے کی ایک طویل مدت سے منظّم مُہم جاری ہے اس کا حقائق وواقعات سے کوئی تعلق اور دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔جن حضرات کو تحقیق درکار ہو وہ راقم (یٰسٓ اختر مصباحی) کی اِن تین کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں جو دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں: (۱) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی اور انقلابِ ۱۸۵۷ء (۲) ممتاز عُلماے انقلاب ۱۸۵۷ء (۳) ۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر۔

سیفُ اللہ المسلول علاّمہ فضلِ رسول عثمانی قادری بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کی جلالت مآب شخصیت شہرۂ آفاق ہے اور آپ سیفُ الجبار و بوارقِ محمدیہ جیسی ایمان افروز و باطل سوز کتابوں کے اَثرات پورے ملک میں واضح طور پر محسوس کیے گئے۔

حضرت مولانا نقی علی قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) حضرت مولانا عبدالقادر عثمانی قادری برکاتی بدایونی (وصال ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری ہاشمی (وصال ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) حضرت مفتی ارشاد حسین مجدِّدی رام پوری (وصال ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء) جیسے عُلماے کرام اور حضرت سید شاہ ابو الحسین احمد نوری مارَہروی (وصال رجب ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) وحضرت سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (وصال ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) وحضرت سید جماعت علی شاہ محدِّث علی پوری سیالکوٹی (وصال ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء) جیسے مشاہیر صوفیہ و مشائخِ عِظَام کی بے مثال تعلیمات و اِرشادات وخدمات کے نقوش آج بھی زندہ وتابندہ ہیں۔

متحدہ ہندوستان کے اندر مذہب اہلِ سُنّت اور اس کے جلیلُ القدر عُلما ومشائخ وصوفیۂ کرام کا تاریخی تواتُر وتسلسل راقم سُطور اپنی ایک زیرِ تدوین وترتیب کتاب ''سَوادِ اعظم اور سلسلۂ ولیُّ اللّٰہی عزیزی'' میں تفصیل کے ساتھ پیش کر رہا ہے جس کے صفحات تقریباً پانچ سو ہوں گے۔اِس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کے بعد قارئین اس کا مطالعہ ضرور کریں جس کے ذریعہ بہت سے حقائق روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائیں گے۔اِن شاءَ اللّٰہ تبارکَ وتعالیٰ۔

نمائندۂ عُلماے عصر و نمونۂ اسلاف واکابرِ اسلام فقیہِ اسلام امام اہلِ سُنّت مولانا الشاہ المفتی احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کی ہمہ گیر شخصیت اور متعدِّد ذُوالجہات خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے کہ:

فرض شناس ودیدہ وَر عالمِ دین اور صاحبِ بصیرت وفراست فقیہِ اسلام کی حیثیت سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے مختلف دینی وعِلمی خدمات کے ساتھ اِحقاقِ حق واِبطالِ باطل کا مسلسل فریضہ انجام دیا اور عالمِ اسلام کے ملّی واجتماعی معاملات سے بھی ہمیشہ دل چسپی برقرار رکھی اور اِصلاحِ اَحوال ومفادِ ملّت کی راہ میں ایسی عِلمی وعَملی جدوجہد فرماتے رہے جو ایک بالغ نظر عالم وقائدِ اہلِ اسلام اور راسخُ العلم فقیہِ اسلام کے شایانِ شان ہے۔

چنانچہ جنگِ طرابلس وجنگِ بَلقان (۱۲-۱۹۱۱ء) کے دوران آپ نے مسلمانوں کی تائید وحمایت اور بلقان وطرابلس میں تُرک مسلمانوں کی کامیابی کی دُعا کے ساتھ خود بھی مالی تعاون پیش کیا اور دیگر مسلمانانِ ہند کو بھی بلقان وطرابلس کے مسلمانوں کا مالی تعاون کرنے اور ان کے حق میں دُعا کرتے رہنے کی اپیل کی۔

اس سلسلے میں آپ کے تلمیذِ رشید اور سوانح نگار ملکُ العُلما مولانا محمد ظفرالدین قادری رضوی عظیم آبادی (ولادت ۱۰ محرمُ الحرام ۱۳۰۳ھ/ ۱۹/ اکتوبر ۱۸۸۰ء۔ وصال ۱۹ جمادی الآخرہ ۱۳۸۲ھ/ ۱۸ نومبر ۱۹۶۲ء) سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، بہار لکھتے ہیں:

''وہ (امامِ اہلِ سُنّت مولانا احمد رضا بریلوی) ہزار دل و جان سے مسلمانوں کی خیر خواہی چاہتے تھے۔ہمیشہ ان کے لئے دُعا فرمایا کرتے تھے اور وقتِ ضرورت مالی اِمداد سے بھی دریغ نہ فرماتے بلکہ دل کھول کر خود بھی چندہ دیتے اور مُریدین ومُعتَقِدین کو بھی اس کی طرف متوجہ فرماتے۔

جس وقت جنگ روس وروم کی نمودار ہوئی، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا کا عُنفوانِ شباب تھا۔صرف ہندوستان نہیں بلکہ ساری دنیا تُرکوں کے ساتھ تھی۔اس وقت تُرکوں کی حفاظت کے لئے جو چندے بریلی میں ہوئے تھے اس میں اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سُنّت اور

ان کے والد ماجد حضرت مولانا نقی علی خاں بریلوی رحمۃُ اللہ علیہما کا بہت بڑا حصہ تھا جو کسی دوسرے مولوی کا نہ تھا۔

اسی طرح جب روم و یونان میں جنگ کا اعلان ہوا تو حضرت ابوالوقت سیفُ اللہ المسلول مولانا شاہ ہدایت رسول بوالحسینی رضوی (لکھنوی) رحمۃُاللّٰہ علیہ جو اعلیٰ حضرت کی زبان وقلم تھے یعنی اعلیٰ حضرت کے خیالات واعتقادات وارشادات کو اپنے مواعظِ حسنہ و تحریراتِ فصیحہ وبلیغہ سے ظاہر فرماتے تھے، انہوں نے بمبئی کے ایک اخبار ''مسلم ہیرالڈ،، میں مسلسل مضمون ٹرکی کے سلطانُ المعظّم کی حمایت میں لکھنا شروع کیے اور اپنے وعظوں اور نجی گفتگو میں سلطانِ معظّم کی مدحت وثنا فرمایا کرتے۔

یہ سب اعلیٰ حضرت ہی کے خیالات تھے جو اُن کی زبان وقلم سے ظاہر ہوتے تھے جو ''اخبار وطن،،، لاہور میں شیدائے سلطانُ المعظّم، مولوی انشاء اللہ مرحوم کے ملاحظہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔

جب ۱۳۲۷ھ میں انور بے وغیرہ نے سلطانُ المعظّم عبدالحمید خاں کے خلاف سازش کی اور ان کو تخت چھوڑنے پر مجبور کیا اور سلطانُ المعظّم نے دوراندیشی سے کام لیا اور بغیر ایک قطرہ خون بہائے، ملک میں اس انقلابِ عظیم کو ہونے دیا۔ اگرچہ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت انور بے وغیرہ کی اس حرکت کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے (کیوں کہ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ ان ٹرکی نوجوانوں میں محض یورپ کی نقّالی ہے اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرَىٰ کا ذِکر محض مسلمانوں کو مُو ہنے کے لئے کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتِ ٹرکی کو تباہ کیا گیا تو وہ خود بھی تباہ و برباد ہوگیا) مگر سلطانُ المعظّم کی بہت تعریف کرتے تھے کہ مسلمانوں کے خون کی قدر کی اور اپنی سلطنت واِقتدار کی پرَوا نہ کی۔ اور شاعر کے اس مصرع۔ نیر زد کہ خونے چکد برزمیں۔ کو سچا کر دکھایا۔

اسی طرح جب ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۱ء) میں اٹلی نے طرابلسُ الغرب پر حملہ کر دیا تو اس سے ساری دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف رنج وغم کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص بقدرِ حیثیت اس

میں حصہ لینے لگا۔ حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صاحب (صدر شعبۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ کالج) بریلی تشریف لائے اور مسلمانانِ بریلی کو اس کی طرف متوجہ فرمایا۔

ان دِنوں ''مسجد بی بی جی،، میں جہاں اعلیٰ حضرت کا مدرسہ ''منظرِ اسلام'' تھا، مسلمانانِ اہلِ سُنّت بریلی کا اجتماع ہوا۔ اور حضرت مولانا سید سلیمان اشرف نے پُر زور تقریر فرمائی۔

اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سُنّت مولانا االشاہ احمد رضا نے اپنی طرف سے مبلغ پانچ سو (=/۵۰۰) روپئے عنایت فرمائے۔ پھر کیا تھا، چندوں کی بارش شروع ہوگئی اور موسلا دھار بارش کی حیثیت ظاہر ہوئی۔ تیرہ ہزار روپئے (=/۱۳۰۰۰) جمع ہوگئے۔

اورصرف یہی نہیں بلکہ اسی زمانہ میں حامیِ دین وملّت، ناصرِ اہلِ سُنّت جناب حاجی محمد لعل خاں صاحب قادری رضوی (مدراسی) منیجر حاجی عبداللہ علی رضا، زکریا اسٹریٹ، کلکتہ، خلیفۂ مجاز اعلیٰ حضرت کے ایک سوال کے جواب میں پُر زور تحریر حوالۂ قلم فرمائی اور مسلمانانِ ٹرکی کی امداد کی صورتیں بتائیں۔،، الخ (ص ۴۳۴ تا ۴۳۶۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت مکمّل۔ مؤلّفہ مولانا ظفرالدین قادری رضوی، مطبوعہ مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور ۲۰۰۳ء۔ سالِ تصنیف ۱۹۳۸ء)

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ٹرکوں کے خلاف بغاوت کی جس کی برطانیہ نے حمایت کی۔ جب کہ مسلمانانِ ہند مظلوم ٹرکوں کے حامی تھے۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کے خلاف اپنی سخت ناراضی ظاہر کی اور ٹرکوں کی ہم دردی وحمایت کا عام ماحول ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوا۔

جنگِ طرابلس وبلقان (۱۲-۱۹۱۱ء) کے زمانے میں ٹرکوں سے مسلمانانِ ہند کے جذباتی لگاؤ کا واضح اظہار ان کے حق میں پُرزور تحریک واحتجاج اور مالی امداد وتعاون کی صورت میں ہوا۔

دہلی کے نقشبندی مُجدّدی شیخِ طریقت شاہ ابوالخیر عبداللہ محی الدین خیر فاروقی مجدّدی معروف بہ حضرت شاہ ابوالخیر فاروقی مجدّدی دہلوی (ولادت ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ/جنوری ۱۸۵۶ء۔ وصال ۲۹/جمادی الآخرہ ۱۳۴۱ھ/۱۶/فروری ۱۹۲۳ء) کے اَحوال وآثار وخدمات پر مشتمل کتاب ''مقاماتِ خیر'' مؤلّفہ مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی دہلوی (وصال

۱۹۹۳ء) کے بیان کردہ اس واقعہ سے مسلمانانِ ہند کے جذباتِ نُصرت و اعانت وتائید وحمایتِ تُرک کا کچھ اندازہ ہوتا ہے:

''۱۹۱۲ء میں دِلّی کے مسلمانوں نے تُرکیہ کو طبی وفد بھیجنے کے لئے چندہ جمع کیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کو وفد کا رئیس تجویز کیا گیا اور اس وفد کو رخصت کرنے کے لئے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر جلسہ منعقد کیا گیا۔

جامع مسجد کے جنوبی دالان اور سیڑھیوں اور اس کے سامنے کا میدان لوگوں سے بھرا ہوتھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور حکیم محمد اجمل خاں نے تقریریں کیں۔ اس جلسے میں آپ (حضرت شاہ ابوالخیر فاروقی مجدّدی دہلوی) کو بھی خاص طور سے بلایا تھا کہ دُعا فرمائیں۔

اس عاجز (ابوالحسن زید فاروقی) سے ان لوگوں نے بیان کیا جو اس موقع پر موجود تھے کہ:

تمام میدان اور سیڑھیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس بھیڑ میں سے کسی کا گذرنا نہایت مشکل تھا۔

جب آپ کی تشریف آوری ہوئی اور مولانا محمد علی جوہر اور حکیم محمد اجمل خاں کی نظریں آپ پر پڑیں تو خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور جس طرح کائی پھٹتی ہے اسی طرح مجمع پھٹا اور آپ کے واسطے ایک راستہ بن گیا۔

آپ سیڑھیوں کے اوپر سے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں اَرکانِ وفد، مولانا محمد علی جوہر اور حکیم صاحب و دیگر عمائدین کھڑے تھے۔

''حیاتِ اجمل'' میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی ایک تحریر ہے۔ جس میں انھوں نے اس کیفیت کا بیان کیا ہے۔ یہ عاجز اُن کی تحریر کا ایک حصہ نقل کرتا ہے:

''دِلّی کے عام مسلمانوں میں ایک ایسی روح پیدا ہوگئی تھی کہ تنہا انھوں نے پچاس ساٹھ ہزار روپیہ جمع کیا۔

وفد کو رخصت کرتے وقت جامع مسجد اور اس کے سامنے کے میدان میں آدمیوں کے سَروں کے سِوا کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی تھی۔ یہ مجمع نہ صرف آدمیوں کی تعداد اور ان کے

جوش کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا، بلکہ دِلّی میں شاید شاہانِ مُغلیہ کے بعد اپنے تزک و احتشام میں یکتا تھا۔

حکیم صاحب اور محمد علی صاحب کی ابتدائی تقریروں نے اور مولانا شاہ ابوالخیر کی رُخصتی کی دُعا نے ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ تمام عمر کوئی نہیں بھول سکتا۔'' الخ

(ص ۲۶۹۔ مقاماتِ خیر۔ مؤلّفہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی فرزند وخلیفہ شاہ ابوالخیر فاروقی مجدّدی۔ مطبوعہ شاہ ابوالخیر اکاڈمی، چتلی قبر۔ دہلی ٦۔ طبعِ دوم ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء)

مَوقع کی مناسبت سے علی برادران کے اظہارِ عقیدت سے متعلق یہ تحریر بھی ملاحظہ فرمائیں:

''۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ:

آپ روشن آرا باغ (دہلی) حسبِ معمول بَرائے تفریح بگھی میں تشریف لے جا رہے تھے۔ اس سال آپ کی سواری لال کنواں، کھاری باؤلی، قطب روڈ ہو کر جاتی اور آتی تھی۔

ایک دن جب آپ کی سواری لال کنواں پہنچی تو وہاں راستہ کے شرقی کنارے پر ایک بڑے اِجتماع میں چار پانچ گز اونچے اسٹیج پر مولانا شوکت علی و محمد علی کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ یہ دونوں دسمبر ۱۹۱۹ء میں قیدِ فرنگ سے رہا ہوئے تھے۔ یہ جلسہ ان کے اِعزاز میں کیا گیا تھا۔

ان دونوں بھائیوں کی نظر جب آپ کی طَلْعَتِ نورانی پر پڑی، فوراً اِسٹیج سے اُترے اور دوڑتے ہوئے آپ کی سواری کے پاس آئے۔ آپ کے مبارک ہاتھوں کو بڑی محبت سے بوسہ دیا۔

آپ نے ان کی خیریت دریافت کی اور آپ کی سواری روانہ ہوئی۔ رَحمۃُ اللّٰہِ عَلَیھِمَا وغَفَرَ لَھُمَا۔

(ص ۳۰۸۔ مقاماتِ خیر۔ مؤلّفہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی فرزند وخلیفہ شاہ ابوالخیر فاروقی مجدّدی۔ مطبوعہ شاہ ابوالخیر اکاڈمی، چتلی قبر۔ دہلی ٦۔ طبعِ دوم ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء)

تُرکوں کی اِمداد کا ایک طریقہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی ۱۹۱۲ء میں یہ بتاتے ہیں کہ:

''اب بھی اگر تمام ہندوستان کے جُملہ مسلمان، امیر، غریب، فقیر، رئیس، اپنے سچے

ایمان سے ہر شخص اپنی ایک ماہ کی آمدنی دے دے تو گیارہ ماہ کی آمدنی میں بارہ ماہ گذر کر لینا کچھ دشوار نہ ہو۔اور اللہ عزّ وجلّ چاہے تو لاکھوں پونڈ جمع ہو جائیں۔'' (ص ۴۴۳-۴۴۴۔حیاتِ اعلیٰ حضرت، مطبوعہ مکتبہ نبویہ لاہور ۲۰۰۳ء۔ سالِ تصنیف ۱۹۳۸ء)

جب کہ فقہ و اصولِ فقہ سے لاعلمی اور قلّتِ تدبُّر کی وجہ سے مشہور مؤرّخ و مصنّف مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) مؤلّفِ سیرۃ النبی، اردو۔ بانیِ دار المصنفین اعظم گڑھ (یوپی ،انڈیا) نے تُرکوں کی اِمداد کا یہ طریقہ بتایا کہ:

ہندوستانی مسلمان عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی نہ کر کے اس کی قیمت تُرکوں کو بھیج دیں۔''

ملاحظہ ہو۔مکتوبِ شبلی بنام ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار لاہور۔ص ۸۹۸۔حیاتِ شبلی مؤلّفہ سید سلیمان ندوی، مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔یوپی۔

حالاں کہ اِرَاقَۃُ الدَّم یعنی جانور کی قربانی واجب ہے اور اس کی قیمت کا صدقہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔اس کی تفصیل کتبِ فقہ مثلاً ہدایہ وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

شبلی نعمانی صاحب کے ''اِجتہاد،، کی تائید خود اُن کے شاگرد سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) بھی نہ کر سکے۔

۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ/۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو مسجد مچھلی بازار کان پور کا حادثہ جس میں کئی مسلمان شہید اور بہت سے مسلمان شدید زخمی ہوئے، اس واقعہ نے بھی ہندوستان کی مسلم سیاست کو کافی گرم کیا۔اس مسجد کا وضوخانہ توڑ کر حکومت نے اسے سڑک میں شامل کر لیا تھا جس کے خلاف مسلمانانِ کان پور نے شدید احتجاج کیا اور جلوس کی شکل میں مسجد پہنچ کر وضوخانہ کو چُننا شروع کیا جس کی روک تھام کے لئے مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے پولیس کا اور پھر فوج کا استعمال کیا۔حالات کی نزاکت واہمیت کے پیشِ نظر وائسرائے گورنر جنرل لارڈ ہارڈِنگ نے کانپور کا دورہ کیا۔مسجد مچھلی بازار کا معائنہ کیا۔

مسلمانوں کے شدید احتجاج کے بعد ایک طرف وائسرائے گورنر جنرل نے اس حادثہ میں گرفتار مسلم قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا تو دوسری طرف اہلِ سنّت کے ایک جلیلُ القدر

عالم حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) نے عُجلت پسندی میں وضوخانہ چھوڑنے کا اعلان کیا۔

حادثۂ کانپور سے متأثر ہو کر مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے پُر جوش نظمیں لکھیں جو الہلال، کلکتہ۔ ہمدرد، دہلی۔ اور زمیندار، لاہور میں شائع ہوئیں۔ایک نظم کے دو اشعار یہ ہیں:

عَجب کیا ہے جو نو خیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ بچے ہیں۔سویرے، ان کو سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور سَر علی امام ممبر وائسرائے کونسل و راجہ محمود آباد کے درمیان مصالحتی گفتگو کچھ اس طرح جاری تھی کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔مظلوموں کی مالی امداد کی جائے۔لیکن مسجد کا جو حصہ توڑ دیا گیا ہے وہ اب اسی طرح چھوڑ دیا جائے اور مسلمان اس کی تعمیرِ جدید پر اِصرار نہ کریں۔

اس مصالحتی فارمولہ کی خبر منظرِ عام پر آتے ہی مولانا شبلی نعمانی صاحب نے کہا:

لوگ کہتے ہیں کہ حُکّام ہیں آمادۂ صلح
یہ اگر سچ ہے تو جُز خُوبیِ تقدیر نہیں
لیکن انعامِ گراں قدر و وَظائف کی طمع
یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
''مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے''
دِیَتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
داد خواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ وفا
ورنہ ان کو گِلۂ سختیِ تقدیر نہیں
ہم سے خود ذوقِ اسیری نے یہ کانوں میں کہا

که خمِ طُرّۂ محبوب ہے، زنجیر نہیں
جُزوِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں: وضوخانہ تھا، مسجد تو نہ تھی؟
یہ بجا مسئلۂ فقہ کی تعبیر نہیں
آپ اس بحث میں تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ
حاملِ فقہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں

حیرت ہے کہ مذکورہ گفتگو ''صلح'' کے نام سے جب اخبارات میں چھپ کر مشہور ہوئی تو اس کی تائید میں مضامین لکھے گئے، جابجا تہنیتی جلسے ہوئے۔ وائسرائے کے نام سے اعلانِ صلح ہوتے ہی شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے بھی ان کی خدمت میں شکرگذاری کا یہ تحفہ پیش کیا:

اے ہمایوں گہر وافسرِ اَورَنگِ شہی
''وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے''
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفر مندیِ سلطانی ہے
تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ اُنبوہ وہ جوش
گر چہ زائد نہ سہی، فطرتِ انسانی ہے
تیرے لطف وکرمِ عام نے یہ دے دی صدا
کوئی مُجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زِندانی ہے
تو نے اِک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازؤں میں ترے یہ زورِ جہاں بانی ہے
بات رکھ لی تری تقریر نے حُکّام کی بھی
گرچہ لازم انہیں اِظہارِ پشیمانی ہے

گرچہ مدحِ اُمَرا میں نے کبھی کی ہی نہیں
شکرِاحسان مگر فطرتِ انسانی ہے
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اَوراقِ سپاس
ان میں یہ ''پیشِ کشِ شبلیِ نعمانی'' ہے

قارئین غور فرمائیں کہ مسجد کا ٹوٹا ہوا وضوخانہ دوبارہ اس مسجد میں شامل بھی نہیں ہوا جس کی بازیابی مسلمانانِ کانپور کا اصل مقصد تھا اور اسی لئے انھوں نے اپنی جان ومال کا نذرانہ پیش کیا اور قید و بند کے مصائب برداشت کیے۔ اور اسی کو اصل مسئلہ قرار دیتے ہوئے شبلی نعمانی صاحب نے بھی پہلے یہی کہا تھا کہ:

''مایۂ بحث اگر ہے تو فقط مسجد ہے''
دیتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں

لیکن وائسرائے کے پُرفریب اعلانِ صلح کے بعد ان کا لہجہ ونظریہ کچھ اس طرح متأثر ہوا کہ اس کی مدح سرائی میں یوں گویا ہوئے:

اے ہمایوں گہر وافسرِ اَورنگِ شہی
''وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے''
تیرے لطف وکرمِ عام نے دے دی یہ صدا
کوئی مُجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زِندانی ہے
تو نے اِک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازؤں میں یہ ترے زورِ جہاں بانی ہے

۱۹۱۳ء کے حادثۂ مسجد مچھلی بازار کان پور کے بارے میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے مسلمانوں نے اِستفتا کیا تو آپ نے صاف وصریح الفاظ میں فتویٰ جاری کیا کہ مسجد کا وضوخانہ جُزوِ مسجد ہے جسے مسجد سے کسی قیمت پر الگ نہیں کیا جاسکتا ہے اور ایسی کسی مصالحت کو قبول کرنا جس میں وضوخانہ سے دست برداری ہو، کسی مسلمان کے

لئے جائز نہیں۔ یہ مصالحت نہیں بلکہ ظلم وتعدّی ہے اور حقِ مسجد کو غصب کرنا ہے۔

تفصیل اور فقہی تحقیق کیلئے ملاحظہ فرمائیں: **اِبانۃُ المُتَوارِی فی مُصالحۃِ عبدِالباری**۔ مطبوعہ بریلی۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ۱۲۔۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس وجنگِ بلقان اور پھر ۱۹۱۳ء کے حادثۂ مسجد مچھلی بازار کان پور کے مواقع پر جو مَوقف اختیار کیا، جو فتویٰ دیا، مسلمانوں کے حق میں جو عملی کارروائی کی اور ان کے علاوہ آپ کی جو دینی وعلمی خدمات ہیں ان سب کے بارے میں آپ کی حیات ہی میں ۱۹۱۵ء میں خواجہ حسن نظامی دہلوی (متوفی ۱۹۵۴ء) کے تحریر کردہ خیالات وتأثرات کے چند اقتباسات یہاں موقعہ کی مناسبت سے ملاحظہ فرمائیں:

’’بریلی کے مولانا احمد رضا خاں صاحب جن کو ان کے مُعتقِد ’’مُجَدِّدِ مأۃِ حاضِرہ ‘‘ کہتے ہیں، درحقیقت طبقۂ صوفیۂ کرام میں باعتبارِ علمی حیثیت کے ’’منصبِ مجدّد‘‘ کے مستحق ہیں۔ ان کی تصنیفات وتالیفات کی ایک خاص شان اور خاص وضع ہے۔

یہ کتابیں بہت زیادہ تعداد میں ہیں اور ایسی مدلّل ہیں جن کو دیکھ کر لکھنے والے کے تجرِ علمی کا جیّد سے جیّد مخالف کو اقرار کرنا پڑتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی خصلت ہے جس کی ہم سب کو پیروی کرنی چاہیے۔

جماعتِ صوفیہ علمی حیثیت سے مولانا موصوف کو اپنا بہادر، صف شکن، سیفُ اللہ سمجھتی ہے۔ اور انصاف یہ ہے کہ بالکل جائز سمجھتی ہے۔

جس طرح دیوبند کے تذکرے میں، مَیں نے قومی کارناموں کا ذکر کیا ہے، اس موقع پر بھی نہایت فخر سے حضرت مولانا کی اس خدمتِ قومی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے جنگِ طرابلس، بلقان، اور کانپور میں کی۔

میرے نزدیک مولانا صاحب کی جرأت ودِلیری عُلمائے دیوبند، فرنگی محل لکھنؤ اور تمام

لیڈرانِ سرد وگرم سے بڑھ کر ہے۔

انہوں نے جو کام کیا وہ ایک سے بھی نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہوسکا۔ اور وہ ان کے بے باکانہ فتوے ہیں جو اِن مواقع پر انہوں نے لکھے۔ اور باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کی۔ ‘‘ (ہفت روزہ خطیب دہلی۔ مورخہ ۲۲ / مارچ ۱۹۱۵ء)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اور خانوادۂ فرنگی محل لکھنؤ کے عظیمُ المرتبت عالمِ دین حضرت مولانا محمد قیامُ الدین عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) ایک دوسرے کی دینی وعلمی عظمت واہمیت سے اچھی طرح واقف اور ایک دوسرے کے قدرداں تھے۔ باہمی تعلقات وروابط بھی اچھے تھے۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی ایک بار ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں بریلی تشریف لائے تھے۔ بریلی میں آپ سے ملاقات کا ذکر مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ۱۹۲۱ء کی مُراسلت میں خود کیا ہے اور اسی ملاقات (۱۳۳۱ھ/ در بریلی) کا ذکر کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

’’اصل واقعہ یہ ہے کہ جناب ۳۱ھ میں غریب خانہ پر تشریف لائے تھے۔‘‘ الخ۔ فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ۔ ۲۶۔ ذوالقعدہ ۱۳۳۹ھ۔

(ص ۱۲۔ اَلطّارِیُّ الدّارِی، حصہ سوم۔ مؤلّفہ مولانا محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی۔ مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء)

اسی طرح ۱۹۱۷ء میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی دعوت پر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اپنے چند تلامذہ وخُلَفا کو لکھنؤ بھیجا تھا۔ جس کا دَاعِیہ یہ تھا کہ مسٹر مانٹیگو برطانوی وزیر نے اپنے دورۂ ہند کے وقت لکھنؤ میں عُلما کی ایک مِیٹنگ بسر کردگیِ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی طلب کی تھی تاکہ ہندوستان کے مسلم مسائل پر تبادلۂ خیال ومشورہ کیا جاسکے۔ ہندوستان کے اندر مسٹر مانٹگو نے اسی طرح کی میٹنگوں کی روشنی میں اپنے خیالات وتجاویز کا مجموعہ ’’اِصلاحاتِ ہند‘‘ کے نام شائع کیا تھا۔

مذکورہ مِٹنگ کا ذِکر کرتے ہوئے حُجۃُ الاسلام مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) خَلفِ اکبر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''حضور پُرنور اعلیٰ حضرت رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہُ نے مجھے مولوی عبدالباری صاحب کی دعوت پر اس جلسے میں بھیجا تھا جس کے دعوت نامے میں مولانا عبدالباری صاحب وغیرہ عُلماے فرنگی محلی کے ساتھ مجتہدینِ روافض کے بھی نام تھے۔ اور یہ اس وقت ہے جب مانٹی گو ہندوستان آیا تھا اور سیلف گورنمنٹ کا ہندوستان میں ایک شور و غوغا مَچا ہوا تھا۔

.... میرے ہمراہ حضرت مولانا ظہور حسین رامپوری صدر دارالعلوم (منظرِ اسلام، بریلی) اور جناب مولوی رحم الٰہی صاحب (منگلوری، سہارن پوری) اور صدرُ الشریعہ مولانا امجد علی صاحب خُلَفائے اعلیٰ حضرت بھی تھے۔ اور ہمیں اس جلسے میں جانا پڑا تھا جس میں رَوافض و وَہابیہ وغیرہ بھی شریک تھے۔'' الخ (مَظاھِرُ الحَقِّ الْاَجلیٰ (۱۳۶۰ھ/۱۹۴۰ء) طبعِ اول مطبع نابھہ اسٹیم پریس، نابھہ، پنجاب۔ کتب خانہ اہلِ سنّت محلّہ بھورے خاں۔ پیلی بھیت۔ و مشمولہ فتاوٰی حُجّۃُ الاسلام بنام ''فتاوٰی حامدیہ''۔ مطبوعہ بریلی)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) و تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) کے ہنگامہ خیز دور میں جب حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی و دیگر خلافتی و موالاتی عُلما و قائدین کی طرف سے بعض غیر شرعی اُمور قولاً و فعلاً صادر ہوئے تو امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ان کا شرعی مؤاخذہ فرمایا۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مولانا ریاست علی شاہجہاں پوری (وصال ربیع الآخر ۱۳۴۹ھ) شاگردِ حضرت مولانا مفتی ارشاد حسین مجدِّدِی رام پوری (متوفی ۱۳۱۱ھ) کو اَواخرِ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں لکھنؤ سے بریلی بھیجا۔ انہوں نے امام احمد رضا سے ملاقات کر کے مولانا عبدالباری کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ بریلی آ کر آپ سے ملاقات و تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔

امام احمد رضا نے جواب دیا کہ: جن اُمور پر شرعی مؤاخذہ ہے اُن سے وہ توبہ کر لیں تو میں خود لکھنؤ پہنچ کر ان سے ملاقات کروں گا۔''

مولانا ریاست علی شاہجہاں پوری لکھنؤ واپس گئے اور سارا ماجَرا مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے گوش گزار کیا۔ پھر مولانا ریاست علی نے لکھنؤ سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرف سے یہ پیغام بھجوایا کہ آپ کی نظر میں جو کفری اَقوال سَرزد ہوئے ہیں، اُن سے مطلع کر دیں تو اُن سے توبہ کر کے اس توبہ کی اِشاعت کر دی جائے گی۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے فوراً اس اہم معاملے کی طرف اپنی پوری توجہ مَبذُول کر کے ایک نہایت جامع تحریر (مختصر و متوسط و مفصل) سپردِ قلم فرمائی جس میں کفری اَقوال کی صراحت اور ان سے رُجوع و توبہ کا ذِکر و مطالبہ تھا۔ اس تحریر کو آپ کے حکم سے آپ کے مندرجہ ذیل تَلامذہ و خُلَفا نے حضرت مولانا عبدالباری سے لکھنؤ میں ملاقات کر کے ان کے حوالے کیا۔ یہ واقعہ جمادی الآخرہ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کا ہے۔

(۱) صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء)
(۲) صدرُ الشریعہ مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء)
(۳) مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی (وصال ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء)
(۴) مولانا حشمت علی قادری رضوی لکھنوی ثم پیلی بھیتی (وصال ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء)

حضرت مولانا قیامُ الدین عبدالباری فرنگی محلی چوں کہ اہلِ سُنَّت و جماعت کے مقتدر عالمِ دین اور اہلِ سُنَّت کے نہایت قابلِ احترام دینی و علمی خانوادۂ فرنگی محلی کے چشم و چراغ تھے اس لئے امام احمد رضا کو ان سے تعلُّقِ خاطر تھا اور اسی تعلُّقِ خاطر کی وجہ سے مولانا فرنگی محلی کی لَغزِشوں سے آپ کو سخت اِضطراب تھا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مولانا ریاست علی شاہجہاں پوری (وصال ۱۳۴۹ھ) شاگردِ حضرت مفتی ارشاد حسین مجدِّدی رام پوری (وصال ۱۳۱۱ھ) کے ساتھ بھی تھا اور ان سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام اپنے ایک مکتوب میں حضرت امام احمد رضا بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''اس فتنۂ ھائلہ میں لغزشیں یا دانستہ لرزشیں بہتیروں سے ہوئیں اور ہیں۔ مگر اپنے قلبی تعلق سے مجبور ہوں۔ جو قلق آپ اور مولوی ریاست علی خاں صاحب کی نسبت سے تھا، کسی کے لئے نہیں تھا۔

مولیٰ تعالیٰ نے آپ کی طرف سے اطمینان کا سامان پیدا فرمایا۔ وہی اس کی تکمیل پر بھی قادر ہے۔ پھر آپ کے ذریعہ سے اِن شاءَ اللّٰہُ تعالیٰ مولوی ریاست علی خاں صاحب بھی ''ایاب اِلیٰ الصَّواب،، فرمائیں گے۔ اور مجھے حُزنِ دوستانہ کی قید سے بِاِذنِہٖ تعالیٰ نجات ہوکر اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کا موقع ملے گا:

وقد اَحسَنَ بِی اِذْاَ خرَجَنِی مِنَ السِّجنِ ۔الخ۔الآیۃ

محرَّرہ ۱۹؍ رمضان المبارک ۲۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء۔ (ص۱۴و۱۵۔ اَلطَّارِئُ الدّارِی، حصہ دوم۔ مرتّبہ مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا قادری برکاتی بریلوی۔ مطبوعہ حسنی پریس، بریلی ۱۹۲۱ء)

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے تحریر فرمایا:

''جو کلمات یا اَفعال کفریہ مجھ سے جناب کے نزدیک سَر زَد ہوئے، ان کو جناب تحریر فرمادیں۔ ان سب میں جن کلمات اور جن شرائط سے جناب تحریر فرمائیں، اس طریق سے میں توبہ طبع کرادوں،، (ص۳۔ الطَّارِئُ الدَّارِی، حصہ اول۔ مطبوعہ بریلی ۱۹۲۱ء)

امام احمد رضا بریلوی نے (۱) تحریر مختصر (۲) تحریر متوسط (۳) تحریر مفصَّل جن پر ایک درجن مشاہیر عُلمائے اہلِ سنَّت کے تائیدی دستخط تھے، یہ تحریر مؤرخہ ۳؍ شعبان المعظم ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء آپ نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے پاس لکھنؤ بھیجی۔ اس تحریر سے متأثر ہوکر حضرت مولانا قیامُ الدین عبدالباری فرنگی محلی (متوفی ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) نے الگ سے اپنا یہ اِجمالی توبہ نامہ شائع کرایا:

''اے اللہ! میں نے جواُمور قولاً وفعلاً وتحریراً بھی کیے ہیں جن کو گناہ نہیں سمجھتا تھا، مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان کو کفر یا ضلال یا معصیت ٹھہرایا ہے، اُن سب سے اور ان کے

مانند اُمور جن میں میرے مُرشِدین اور مَشائخ سے کوئی قُدوَہ میرے لئے نہیں ہے، محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کرکے توبہ کرتا ہوں۔

اے اللہ! میری توبہ قبول کر۔'' (مطبوعہ روز نامہ ہمدم لکھنو۔ شمارہ ۱۱؍ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء۔ وعلی گڑھ گزٹ۔ شمارہ ۲۴؍ جون ۱۹۲۱ء)

حضرت مولانا قیامُ الدین عبد الباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) کے اس توبہ نامہ کی اشاعت کے بعد امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) اپنے تلمیذِ رشید ملکُ العُلما مولانا ظفرالدین رضوی عظیم آبادی (وصال دوشنبہ ۱۹؍ جمادی الآخرہ ۱۳۸۲ھ/ ۱۸؍ نومبر ۱۹۶۲ء) کے نام کوہِ بھوالی (نینی تال) جس کے ایک پُر فضا مقام پہ بغرضِ حصولِ صحت اپنی زندگی کے آخری ایام میں آپ قیام پذیر تھے، مبارک بادی کے اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نَحمَدہٗ ونُصَلّی عَلیٰ رسولِہِ الکرِیم۔

وَلَدِی اَلاَعَزّ مولانا المُکرَّم مولوی ظفر الدین صاحب جَعلَہُ اللّٰہُ کاِسْمِہٖ ظَفرَ الدِّین ۔

السَّلامُ علیکم ورحمۃُ اللّٰہ وبَرکاتُہٗ۔ مبارک ،مبارک ،مبارک۔

مولانا مولوی عبدالباری صاحب نے ان ایک سوایک اور ان کے اَمثال سے توبہ چھاپ دی ہے۔ ملاحظہ ہو، ہمدم ۱۱ رمضان المبارک، روز جمعہ، ۲۰ مئی ۱۹۲۱ء ص: ۳۔ ک ۴۔

''میں نے بہت گناہ دانستہ کیے اور بہت سے نادانستہ۔ سب کی توبہ کرتا ہوں۔

اے اللہ! میں نے جو اُمور قولاً وفعلاً وتقریراً بھی کیے ہیں۔ جن کو میں گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان کو کفر یا ضلال یا معصیت ٹھہرایا، ان سب سے اور ان کے مانند اُمور سے جن میں میرے مُرشدین اور مشائخ سے میرے لئے کوئی قُدوَہ نہیں ہے محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کرکے توبہ کرتا ہوں۔

اے اللہ! میری توبہ قبول کر۔ فقیر عبدالباری عفی عنہ۔"

فقیر کی رائے میں فوراً ایک جلسۂ تہنیتِ توبہ مولانا مولوی صاحب لکھنوی چھاپ کر اُس کی تہنیت کا جلسہ وہاں بھی کیا جائے۔ اور اس میں وہ تحریر جو میں نے انہیں توبہ کے لئے بھیجی تھی، پڑھ کر سنائی جائے۔ اس کی نقل اِن شاءَ اللّٰہُ تعالیٰ عن قریب حاضر کرتا ہوں۔ پھر اُن کے یہ الفاظِ توبہ پڑھ کر سنائے جائیں اور جلسہ کی طرف سے ان کی مبارک باد کا تار مولوی عبد الباری صاحب کو دیا جائے۔

اور مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ اس طرف عالم کہلانے کے مستحق ایک یہی تھے۔ مولیٰ تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ مُشرِکوں سے اِتحاد اور وہابیہ وغیرھُم بے دینوں کے میل سے توبہ فرما کر خالص سُنی ہو گئے۔

ہمارے سُنی بھائی جو غلطی میں پڑے ہوئے تھے، انہیں فوراً واپس آنا چاہیے۔ ہنود و دیابنہ و جدید بد مذہباں سے قطعِ تعلق کر کے خالص سُنی جماعت انصارُ الاسلام میں کہ حمایتِ سلطنتِ اسلام و اَماکنِ مقدسہ کے لئے قائم ہوئی ہے، شریک ہو جائیں۔" والسّـــلام۔ فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ،

کوہِ بھوالی، پیشِ ڈاک خانہ، شب ۱۵/ ماہِ مبارک (رمضان ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء)

(حیاتِ اعلیٰ حضرت جلد دوم، مؤلّفہ محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی۔ ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء۔ سالِ تالیف ۱۹۳۸ء)

اپنے دوسرے مکتوب بنام ملکُ العُلَما مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی محرَّرہ ۲۳/ رمضان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء از کوہِ بھوالی، نینی تال میں تحریر فرماتے ہیں:

..........مولوی عبدالباری صاحب سے میرا کچھ مکاتبہ بھی ہو رہا ہے، بِـاِذنِـہٖ تـعالیٰ اس کا نتیجہ حسبِ مُراد ہوا تو ان کو بلاؤں گا یا بعونہٖ تعالیٰ تحریر ہی کافی ہو گی۔

میں نے مبارک بادِ توبہ کا تار انہیں بھیجا تھا جس کے جواب میں دو شُقّے انہوں نے لکھ کر بھیجے۔ ان کا جواب یہاں سے ۱۹/ ماہِ مبارک کو بھیج چکا ہوں۔ اب یہ انتظار ہے کہ کیا پہلو

اختیار کرتے ہیں۔ وحَسْبُنَا اللّٰہُ ونِعْمَ الْوَکِیل۔

(ص: ۴۴۳، حیاتِ اعلیٰ حضرت، جلد دوم، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام مکتوب (مختصر، متوسط، مفصل) محرَّرہ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء اِرسال فرمایا۔ اور اصولِ شریعت کے مطابق انہیں عمل کرنے کی طرف مخلصانہ طور پر متوجہ فرمایا اور اس کا سلسلہ جاری رکھا۔

امام احمد رضا بریلوی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے درمیان مُراسَلت کا ریکارڈ اَلطّـــارِیُّ الدَّارِی مرتّبہ مفتیِ اعظم مولانا شاہ مصطفیٰ رضا نوری بریلوی۔ مطبوعہ حسنی پریس، بریلی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں مطبوع و موجود ہے۔ ۱۴/ ذوالحجہ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد قیامُ الدین عبدالباری فرنگی محلی (وصال ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) نے اور ۲/ صفر ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء کو امام احمد رضا بریلوی (وصال ۲۵/ صفر ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) نے ایک دوسرے کو آخری خط لکھا اور پھر ہمیشہ کے لئے اس سلسلے کا اِختتام ہو گیا۔ رَحِمَھُمَا اللّٰہُ تَبارکَ وتَعالیٰ۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے جس اِخلاص و درمندی اور دل سوزی کے ساتھ حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی سے مُراسَلت کی تھی، اس کا ایک نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

بملاحظۂ گرامی

مولانا المُکرَّم ذی المَجْدِ والکرَم۔ اَلسَّلامُ علیکم ورَحمۃُ اللّٰہِ وبرَکاتُہٗ

نامی نامہ تشریف لایا، اِن شاءَ اللّٰہُ العزیز آپ اس فقیر کو اُن بندگانِ خدا میں پائیں گے کہ لاَ یُحِبُّونَ اِلَّا لِلّٰہِ وَلَا یُبْغِضُونَ اِلَّا لِلّٰہِ۔

اَب میرے قلب میں وقعتِ سامی بحمدہٖ تعالیٰ پہلے سے بھی زائد ہے۔ میرا قلب صاف ہے۔ امید ہے کہ قلبِ گرامی ایسا ہی صاف ہو۔ وَما ذالِک عَلَی اللّٰہِ بعَزیز۔

مولانا! میں چراغِ سحر ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں، اگر آپ بھی چاہیں نہیں نہیں۔ بلکہ وہ چاہے جس کا چاہنا، چاہنا ہے کہ آپ میں، مجھ میں کوئی وجہِ خلاف باقی نہ رہے۔ میں آپ کی

طرف سے سلیم الصَّدر رہاؤں۔

میں جو رَطب ویابِس خیال میں ہوگا ،عرض کروں گا۔محض دوستانہ ،خالص مخلصانہ۔
آپ سے گذارش کرتا رَہوں گا۔

اورامید ہے کہ آپ ایسے ہی خلوص واخلاص سے جوقابلِ تسلیم ہو،تسلیم فرماتے
رہیں۔جس سے جواب ہو،جواب بتاتے رہیں۔اورمجھ پرحقِ محبت اورحقِ انصاف کے لئے
لازم ہے کہ جوقابلِ قبول ہو،قبول کروں۔اورویساہی مخلصانہ جواب دوں ۔یہاں تک کہ
باذنِہٖ تعالیٰ تمام حجاب مُرتفع ہوجائیں اورمیں اورآپ پیشتر سے بیشتر یک جان ویک دل
ویک زبان ہوکرحمایتِ دین ونکایتِ مُفسِدین باذنِہٖ تعالیٰ بجالائیں۔

اللہ اللہ!وہ ساعت کیسی مبارک ساعت ہوگی۔

وَمَاذَالِک عَلٰی اللّٰہِ بِعَزِیز ۔اِنَّ ذَالِک عَلٰی اللّٰہِ یَسِیرُ ۔اِنَّ اللّٰہُ عَلٰی کلِّ شَیءٍ قَدِیر۔

فقیراحمدرضا قادری عُفِیَ عنہٗ۔

(مکتوب محرَّرہ ۱۹؍رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ/از بریلی۔بنام مولانا عبدالباری فرنگی
محلی لکھنوی۔ص۱۲۔الطَّارِیُّ الدَّارِی۔مرتّبہ مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضانوری بریلوی۔
مطبوعہ حسنی پریس،بریلی۔۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء)

اِختتام واقعہ بوقت اجلاسِ خُدَّامُ الحرمین لکھنؤ ۱۹۲۵ء کے سلسلے میں مفتیِ آگرہ حضرت
مولانا عبدالحفیظ حقّانی خطیب وامام شاہی مسجد آگرہ (وصال ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء۔کراچی)
تحریرفرماتے ہیں:

’’میں خود مدرسہ نظامیہ فرنگی محل (لکھنو) کا ادنیٰ طالب علم ہوں ۔حضرت مولانا
عبدالباری رحمۃُ اللّٰہِ علیہِ سےخاص طورسے’’شرحِ چغمینی،،پڑھی ہے۔مگرزمانۂ
(تحریکِ) خلافت میں کچھ باتیں ان سے سَرزد ہوگئیں،جن پراعلیٰ حضرت (امام احمد رضا
بریلوی) نے گرفت فرمائی۔

آخرکار وصال سے کچھ پہلے’’خُدَّامُ الحرمین،،کے جلسے میں عُلمائے بریلی شریک
ہوئے۔اس وقت حُجۃُ الاسلام مولانا حامدرضاخاں صاحب رحمۃُ اللّٰہِ علیہِ نے مولانا
عبدالباری صاحب رحمۃُ اللّٰہِ علیہِ سے مصافحہ نہ کیااوران کے یہاں قیام سے بھی اِنکار
کردیا۔اورفرمایا کہ:اعلیٰ حضرت رحمۃُ اللّٰہِ علیہِ نے آپ پر جواِعتراضات کیے ہیں،
ان باتوں سے رجوع کیجیے۔

چنانچہ حضرت صدرُالافاضل مولانا محمد نعیم الدین رحمۃُ اللّٰہ علیہ کی کوششوں سے
تحریردی۔اس کے بعد حضرت مولانا حامدرضاخاں صاحب رحمۃُ اللّٰہِ علیہِ فرنگی محل گئے۔
دونوں میں مصافحہ ومعانقہ ہوا۔حضرت مولانا حامد رضا خاں صاحب نے حضرت
مولانا عبدالباری کے ہاتھ چومے،اس لئے کہ وہ صحابی کی اولاد ہیں۔اوروہیں قیام فرمایا۔

فقیراس موقع پرحاضرتھا۔اس خوشی میں دارُالشفا(لکھنو) کی برفیاں آئیں اورباقاعدہ
فاتحہ ہُوااورتقسیم ہوئیں۔‘‘(ص۹۳و۹۴۔شمعِ ہدایت ازمحمدعبدالحفیظ حقّانی۔مطبوعہ کراچی)

ان مباحث ومراسلات اور بارگاہِ الٰہی میں رجوع وتوبہ کے بعد رفتہ رفتہ حَسبِ سابق
حضرت مولانا فرنگی محلی اورعُلمائے اہلِ سنّت کے درمیان خوش گوار تعلقات ہوتے گئے
جس کا سلسلہ کچھ پہلے ہی سے شروع ہوگیا تھا۔چنانچہ مولانا محمود احمد قادری رفاقتی اپنی ایک
تازہ ترین کتاب میں یہ واقعہ تحریرکرتے ہیں کہ:

’’۱۳۴۰ھ میں غوثِ زماں،مَخدومُ الاولیا حضرت شاہ علی حسین اشرفی میاں قُدِّسَ
سِرُّہٗ کی اجازت سے ان کے فرزندِ اکبرعلاّمہ امام عارف مولانا سید شاہ احمد اشرف نے
بُرھانُ العلم والعمل حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری ،سرخیلِ عُلمائے فرنگی محلی لکھنؤ
وفخرالعُلما مولانا سیدشاہ محمد فاخرالہ آبادی کےتعاون سے’’جامعہ اشرفیہ‘‘(کچھوچھہ مقدسہ)
کی بنیادڈالی اورفرمایا:خدانے چاہاتو جامعہ اشرفیہ(کچھوچھہ مقدسہ)کو’’اَزھَرُالھِند‘‘بنا
دوں گا۔لیکن مَشیتِ الٰہی سے ۱۳۴۷ھ میں ان کا وصال ہوگیا‘‘الیٰ آخرہٖ
(ص ۲۹۸۔سوانحِ رفاقتی۔مؤلّفہ مولانا محمود احمد قادری رفاقتی مظفرپوری،طابع وناشر

محمد زاهد اشرف ،فرزندِ مؤلّف ۔۱۴۳۱ھ/نومبر۲۰۱۰ء ۔خانقاہِ رفاقتی ۔اسلام آباد۔بھوانی پور۔ضلع مظفرپور۔بہار)

جناب ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم قادری برکاتی سابق ریڈر شعبۂ تاریخ جامعہ ملّیہ اِسلامیہ، نئ دہلی وسابق ڈائرکٹر ذاکرحسین اسلامک انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئ دہلی ۲۵ نے تاجُ العُلما سیداولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ) اورمولانا عبدالباری فرنگی محلی (وصال ۱۳۴۴ھ) کے درمیان مسئلۂ خلافت وموالات پر ہونے والی مُراسلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جانشینِ تاج العُلما حضرت احسنُ العُلما سید شاہ حیدر حسن میاں قادری برکاتی سجادہ نشین خانقاہِ قادریہ برکاتیہ مارہرہ شریف نے مجھ سے فرمایا کہ:

حضرت تاجُ العُلما کے مکتوبات کا بِالآخر نتیجہ نکلا کہ کثیرُ المناقب مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اپنے ایک والا نامہ کے ساتھ دستخط اورمہر شدہ کورا کاغذ حضرت تاجُ العُلما کی خدمت میں اس مدّ عا کے ساتھ اِرسال فرمایا کہ:

''منسلک کاغذ پران کے دستخط بھی ہیں اورمہر بھی۔اس پران کی طرف سے توبہ ورجوع کی جوعبارت بھی وہ مناسب سمجھیں، تحریر فرماکر شائع کردیں۔''

مذکورہ خط اوروہ کورا کاغذ حضرت احسنُ العُلما کے ذاتی کتب خانہ میں خانقاہ (برکاتیہ) میں محفوظ ہیں۔''

(ص ٦٦۔برطانوی راج میں مذھب اورسیاست ۔مؤلّفہ ڈاکٹر سید جمال الدین اسلم۔مطبوعہ حِرا پبلی کیشنز ۔نورنگر۔نئ دہلی ۲۵۔طبعِ اول جولائی ۱۹۹۴ء)

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) وتحریکِ ترکِ موالات (۱۹۲۰ء) اور تحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء) کے ساتھ ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان دارُالاسلام ہے یادارُالحرب؟

اس سلسلے میں تفصیل وتحقیق زیرِنظر کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں جس میں کئی چیزیں شاید آپ کے لئے پہلی مرتبہ انکشاف کے طور پر سامنے آئیں گی اورآپ محوِ

حیرت رہ جائیں گے کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ لیکن اطمینان ومسرت کی بات یہ ہے کہ ''حقیقتِ حال،، اور''پروپیگنڈہ کا کمال،، دونوں پہلواور دونوں طرح کی تصویریں اُبھر کرآپ کے سامنے نمایاں ہوجائیں گی۔

واضح اورآسان سی بات یہ ہے کہ خلافت ایک شرعی اصطلاح ہے جس کی کچھ شرطیں ہیں۔جوحکومت وسلطنت اوراس کے حاکم وسلطان ان شرائط کے جامع ہوں، انہیں خلافت اورخلیفہ کہا جائے گا۔اوراگر شرائط نہ پائی جائیں تو شرعی اِصطلاح میں وہ خلافت اورخلیفہ نہیں۔اگرچہ عام لوگ اسے خلافت اورخلیفہ کہیں۔ایسی صورت میں اسے حکومت وسلطنت اورحاکم وسلطان کا ہم معنی اورمترادف سمجھا جائے گا۔

تحریکِ خلافت کے بیشتر عُلما وقائدین کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ تُرکی حکومت کوشرعی و اِصطلاحی خلافت قراردے کراس کے حق میں احادیث وروایات وآثاروا قوال پیش کیا کرتے تھے جومسلکِ جمہوراہلِ سُنّت کے خلاف تھا۔

چنانچہ خلافتِ مصطلحۂ شرعیہ میں قریشی کی لازمی شرط کی صَراحت کرتے ہوئے حُجَّۃُ الاسلام امام محمد غزالی (وصال ۵۰۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وبِالجملةِ خصائصُ القضاة تشترط فيه مع زيادةِ نسبِ قريشٍ ۔وعلم هذاالشرطِ الرَّابع بِالسَّمعِ حيث قال النَّبى صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّم :

اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيشٍ۔

فهَذا تُمَيِّزُهٗ عن اَكثرِ الخَلق ۔ولٰكن رُبَّمَا يجتمِعُ فى قُرَيشٍ جَماعةٌ مُوصوفون بهذهٖ الصِّفة فلابُدَّ مِن خاصيةٍ اُخرىٰ تُمَيِّزُهٗ۔

وليس ذَالِک اِلَّا التَّولِية اَوِالتَّفوِيض مِن غيرِهٖ ۔فيَنبغِى الْآن النَّظرُ فى صِفةِ المُوَلىّٰ ۔فَاِنَّ ذالک لا يسلَّم لِكلِّ احدٍ ۔بل لا بُدَّ فيه مِن خاصيةٍ ۔

وذَالِک لا يَصدُر اِلَّامِن اَحدِثلاثةٍ:

اِمَّا التَّنْصِيص مِنْ جِهةِ النبِىّ صلّٰى اللّٰه عليه وسلّم۔

واِمَّـا التَّنْصِيص مِن جِهةِ اِمامِ العصر بِاَن يُعيّن لِولايةِ العَهدِ شخصاً مُعَيَّناً مِن اولادِهٖ اَوسائرِ قريشٍ۔

وامَّـا التَّـفْـويـض مِـن رجـلٍ ذِ ى شَوكةٍ يقتضىٰ اِنقيادُهٗ وتفويضُهٗ مُتابعةَ الآخرين ومُبادرتَهُم اِلى المُبايَعة ۔

وذَالک قد يسلَّم فى بعضِ الْاَعصار لِشخصٍ وَاحِدٍ مَرْمُوقٍ فى نفسِهٖ مَـرزُوقٍ بـالـمُتـابعةِ مَسئُولٍ علٰى الكافَّةِ۔ففى بيعتِهٖ وتفويضِهٖ كِفايةٌ عن تَفويضِ غيرِهٖ۔لِاَنَّ المَقصو دَاَنَ يجتمِعَ شتات الآراءِ لِشخصٍ مُطاعٍ ۔وقد صَارَالِامامُ بمبايَعَةِهذاالمُطاعِ مُطاعاً۔

وقـد لايتَّـفِـق ذالک لِشـخـصٍ واحِـدٍ بَل لِشخصٍ أَوثلاثةٍ أَوجماعةٍ فـلابُدَّ مِن اِجتماعِهِم وبَيعتِهِم واِجتماعِهِم علٰى التفويض حتىّٰ تَتِمّ الطاعة ۔ الى آخرِهٖ۔

بَـل اَقـول: لَـولَـمْ يـكُـن بـعدَوَفاةِ الْاِ مامِ اِلَّا قرشِىٌّ واحدٌ مُطاعٌ مُتَّبَعٌ فـنَهـضَ بـالامـامةِ وتَوَلَّاهابنفسِهٖ ونَشَأَ بِشوكتِهٖ وتشاغل بها واستتبعَ كافة الـخَـلـقِ بِشـوكـتِـهٖ وكِـفايتِهٖ وكان مَوصوفاً بصفاتِ الائِمَّةِ۔ فـقد انعقدتْ اِمـامتُهٗ ووجبتْ طاعتُهٗ ۔فـاِنَّـهٗ تـعَيَّن بِحكمِ شوكتِهٖ وكِفايتِهٖ ۔وفـى مُنازعَتِهٖ اِثار ۃُ الـفِتَـنِ اِلَّا اَنَّ مَـن هَـذا حـالُـهٗ فلايعجز ايضاً عن اَخذِ البيعةِ مِن اَكابرِ الزَّمانِ واَهلِ الحَلِّ والعَقْدِ ۔وذالک اَبعدُ مِن الشُّبهةِ۔

فلِذالک لايتَّفِق مثل هذ افِى العادةِ اِلَّا عن بَيعةٍ اَوتفويضٍ ۔" الى آخرِهٖ۔

(اَلْاِقْتِصَادفِى اَلْاِعتقاد ۔البـابُ الثَّـالِـثُ فـى الْاِمَـامةِ وشرطها ۔لِلْامام محمدبن محمدالغَزالى)

امام غزالی کی مندرجہ بالا تحریر کی ترجمانی اس طرح کی گئی ہے:

..........''اس کے علاوہ خلیفہ کے لئے قومِ قریش سے ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ

آں حضرت صلّی اللّٰہ علیه وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے: اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیش ۔

آں حضرت صلّی اللّٰهُ علیهِ وسَلَّم کے اس قول سے خلیفہ کے لئے عام لوگوں سے ایک امتیازی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ممکن ہے قریش میں بھی بہت سے اشخاص ان صفتوں سے متصف اور معروف ہوں تو پھر اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کوئی ایسی بات ہونی چاہیے جو خلیفہ بنانے کا اصلی اور صحیح معیار بن سکے۔

اور جب ہم اس میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ بنانے کا اصل معیار یا تو آں حضرت صلّی اللّٰہ علیه وسلّم کا صریح قول یا خلیفۂ وقت کا اپنی اولاد یا قریش سے کسی کو نامزد کردینا یا چند ایسے سربرآوردہ اشخاص کا کسی (قریشی) کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور اس کو اپنا خلیفہ تسلیم کرنا ہے جن کے فعل پر تمام لوگ بیعت کرلیں۔

اور اس کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلیں۔

اور بعض دفعہ صرف ایک ہی جلیل القدر اور مقتدر شخص کا کسی (قریشی) کے ہاتھ پر بیعت کرلینا اور اس کو خلیفہ تسلیم کرلینا ہی دوسروں کی طرف سے کافی سمجھا گیا ہے۔

اور بعض دفعہ دو یا تین اشخاص یا ایک جماعتِ مسلمین کو ایسا کرنا پڑا ہے۔'' الیٰ آخرہٖ۔

(ص ۱۷۲۔ مجموعۂ رسائلِ امام غزالی۔ جلد سوم۔ دارُالاشاعت، اردو بازار، کراچی)

امامُ الہند شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) خلافتِ شرعی کے لئے شرطِ قرشیت لازم قرار دیتے ہوئے اپنی معرکۃُ الآراء کتاب ''اِزَالَةُ الخَفَاءِ عَن خِلافةِ الخُلَفَاء'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

(ترجمہ) ''منجملہ شروطِ (استحقاقِ) خلافت کے ایک شرط یہ ہے کہ:

خلیفہ قریش ہو پدری نسب کے لحاظ سے۔ کیوں کہ ابوبکر صدیق نے انصار کو خلافت سے یہی کہہ کر علیحدہ کیا تھا کہ آں حضرت صلّی اللّٰہ علیه وسلّم نے فرمایا ہے کہ:

خلیفہ قریشی ہونا چاہیے۔

.........اور حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ:

یہ کام (خلافت) قریش میں رہنا چاہیے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں۔ جو شخص ان کی مخالفت کرے گا، اللہ اس کو سرنگوں کر دے گا۔''

(ص۲۳۔ فصلِ اول، شرائطِ استحقاقِ خلافت، مقصدِ اول، اِزالۃُ الخَفَاءِ عَن خِلَافۃِ الخُلَفَاء، جلدِ اول۔ مولّفہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی۔ اردو ترجمہ از مولانا عبدالشکور فاروقی۔ مطبوعہ حافظی بکڈپو، دیو بند، سہارن پور)

''امام احمد نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے، انھوں نے رسول اللہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ کام (خلافت) قریش میں رہے گا، جب تک ان کی یہ حالت رہے کہ:

جب ان سے رحم کی خواہش کی جائے تو رحم کریں۔ اور جب وہ حَکم بنائے جائیں تو انصاف کریں۔ اور جب وہ تقسیم کریں تو برابر کریں۔

(قریش میں اس صفت کے ہوتے ہوئے) جو ایسا نہ کرے (یعنی ان کو خلیفہ نہ سمجھے، نہ بنائے) اس پر لعنت اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی۔ اس سے نہ کوئی پرہیز گاری قبول ہوگی نہ عبادت۔''

(ص۱۸۰۔ فصلِ چہارم، احادیثِ خلافت۔ مقصدِ اول، اِزالۃُ الخَفَاءِ عَن خِلَافۃِ الخُلَفَاء جلدِ اول، مولّفہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی۔ مطبوعہ حافظی بکڈپو، دیو بند)

صرف خلافت اور خلیفہ کی حمایت و اِطاعت مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں بلکہ ہر مسلم حکومت وسلطنت و جماعت اور ہر مسلمان کی حمایت واعانت ہر مسلمان کے اوپر بقدرِ اِستطاعت فرض ہے۔ جب حمایت واِعانت کا یہ راستہ کشادہ تھا تو پھر لفظ خلیفہ وخلافت کو خود ساختہ معنی و مراد کا لبادہ پہنا کر اسے شرعی اصطلاحی مفہوم میں استعمال کر کے مسلکِ جمہور اہلِ سُنّت کی دَھجی بکھیرنے اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ہر فرض بقدرِ طاقت اور ہر حمایت واِعانت بقدرِ اِستطاعت ہے۔ ایسی صورت میں یہ

نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا لازم تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں پر کس حد تک یہ فرض عائد ہوتا ہے اور ان کے اندر اس فرض کی ادائیگی کی کتنی قوت وطاقت ہے؟ جتنا ان کا فریضہ اور جیسی ان کی اِستطاعت ہے اس سے زائد کا ان سے مطالبہ کرنا بجائے خود اس اصولِ شریعت کو نظر انداز کر کے جذبات کی رَو میں بہتے جانے کی واضح دلیل ہے۔

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) میں گاندھی ونہرو اور ان کے ہم نواؤں کی شرکت وشمولیت بلا وجہ نہیں تھی۔ اس شرکت وشمولیت نے اس خالص مذہبی مسئلہ کو سیاسی رنگ دے دیا اور سیاسی داؤ پیچ نے اس کی مذہبی روح کو مجروح کر دیا۔ دوسرے ہی سال (۱۹۲۰ء) تحریکِ تَرکِ موالات کا جَنم اسی تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کے بطن سے ہُوا اور اب مسئلۂ خلافت پسِ پُشت چلا گیا۔ تُرکی خلافت کے تحفظ کی جگہ اب وہ مسئلہ سرِ فہرست آگیا جو سیاست دانوں اور لیڈروں کا اصل مطمحِ نظر تھا۔ یعنی ''انگریزوں کا مقاطعہ''۔

اگر مسئلۂ خلافت کا اِستحصال نہ کیا جاتا اور واضح موقف کے ساتھ ''مقاطعۂ انگریز'' کی تحریک شروع کی گئی ہوتی تو اس کی الگ نوعیت ہوتی۔ مگر مذہبی جذبات مُشتعِل کر کے انہیں سیاسی راہ پر لگانا سیاست دانوں کا اصل مقصد تھا اس لئے انہوں نے منصوبہ بندی اور کمالِ مہارت کے ساتھ یہ بساط بچھائی اور اپنے سیاسی عزائم پورے کیے۔

مزید برآں یہ کہ ''مقاطعۂ انگریز''، اور انگریزوں سے ''عدمِ تعاون''، کو ''تَرکِ موالات'' سے تعبیر کر کے اس مرحلے میں بھی آیات واحادیث وروایات کا غلط استعمال کیا گیا۔

موالات ومَوَدّت ووداد ہر کافر ومشرک و یہودی ونصرانی ومجوسی سے ناجائز وحرام ہے۔ تو پھر بیک وقت ان میں سے کسی سے موالات اور کسی کی مخالفت وعداوت شرعاً کیوں کر جائز ہے؟ موالات تو ان میں سے ہر ایک سے ناجائز ہے اور عدمِ موالات ہر ایک سے فرض ہے۔

ہاں! کسی ضرورت ومصلحت کے تحت ان میں سے کسی کے ساتھ خاص طور پر تَرکِ معاملت مثلاً انگریزوں سے تَرکِ معاملت ہوتا تو اس کی الگ نوعیت ہوتی۔

ملکی اور وطنی وسیاسی اُمور ومعاملات میں سارے ہندوستانی باشندے انگریزوں

سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک چلاتے اور اس کے لئے جائز حُدود میں رہتے ہوئے کوشش کرتے تو اس کا جواز تھا۔لیکن ایک طرف مُشرِک دوستی کا نظارہ عام تھا اور دوسری طرف انگریز دشمنی کا ایسا خُمار چڑھا ہوا تھا کہ تحریکِ تَرکِ موالات کے چوٹی کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ:

’’حکومت سے تَرکِ موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز وروزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں‘‘ (ص ۱۶۴۔تبرکاتِ آزاد۔مرتّبہ غلام رسول مہر۔مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

محض انگریزوں سے تَرکِ موالات کے بارے میں مولانا آزاد کی ’’اسلامی بصیرت،، کا یہ فیصلہ تھا کہ:

’’میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جسے خدا کے فضل سے شریعتِ اسلامی کی کچھ بصیرت بھی دی گئی ہے، کہتا ہوں کہ:

ایک مسلمان پر حُبِّ وطن کے لحاظ سے، مذہب کے اعتبار سے، اَخلاق کے لحاظ سے فرض ہے کہ تَرکِ موالات کرے۔‘‘ (ص:۳۰۔روزنامہ زمیندار، لاہور، شمارہ ۲۱/اکتوبر ۱۹۲۰ء)

تحریکِ تَرکِ موالات نے ’’ہندو مسلم اتحاد،، کا وہ منظر پیش کیا کہ شعائرِ اسلام کی توہین کے ساتھ مسلم شناخت بھی خطرے میں پڑ گئی۔انتہا یہ ہوگئی کہ جامع مسجد امرتسر، پنجاب میں ایک ہندو لیڈر کی تقریر کرائی گئی۔ناخدا مسجد کلکتہ میں گاندھی کو مدعو کر کے ایک مدرسہ کا افتتاح کرایا گیا۔شاہی مسجد لاہور میں رام بھج دَت چودھری اور شاہجہانی جامع مسجد دہلی میں سُوامی شَردھانند کو بلا کر انھیں خطاب کا موقع دیا گیا۔جسے مسجد ومنبر ومحراب اور شعائرِ اسلامی کی توہین کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکُن قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں:

’’دِلّی میں غلط فہمی کی بنا پر ۳۰/مارچ (۱۹۱۹ء) ہی کو ’’ستیہ گرہ‘‘ کا دن منایا گیا۔ گورنمنٹ اب پوری طاقت سے اس تحریک کو کچلنے کے لئے تیار ہوگئی۔چنانچہ فوج بُلوائی گئی اور دہلی کے عظیم الشان جلسے کو منتشر ہونے کے لئے کہا گیا۔فوج اور پولیس ہتھیاروں کے

علاوہ مشین گن سے بھی مسلَّح تھی۔دو مرتبہ گولی چلی۔کچھ آدمی قتل اور بہت سے مَجروح ہوئے۔

یہی ۳۰/مارچ ۱۹۱۹ء کا دن ہے جب ’’ہندو مسلم اتحاد‘‘ اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماج کے لیڈر سُوامی شَردھانند نے جامع مسجد (دہلی) کے مکبّرہ پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور مسلمانوں نے ذوق وشوق سے ان کو ایسا کرنے دیا۔‘‘ (ص ۸۴۔تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو، حکومتِ ہند۔نئی دہلی۔طبعِ دوم ۱۹۹۷ء)۔

مساجد میں مُشرِکوں کے خطاب کے یہ حادثات پورے ملک میں مشہور ہوئے۔ان کے علاوہ اخبار مدینہ بجنور ۱۹۲۰ء کے مختلف شماروں کی رپورٹ کے مطابق مسجد بیننگن گھاٹ، مسجد قطب خانساماں شملہ، مسجد جل گاؤں بُلڈانہ وغیرہ میں ہندو مسلم لیڈر جمع ہوئے۔تقریریں کیں اور ’’ہندو مسلم اتحاد‘‘ پر زور دیا۔

کیا مسجدیں اسی لئے تعمیر کی گئی ہیں کہ وہاں مُشرکوں کا اِعزاز واِکرام کیا جائے؟ انہیں مُبلّغ اور مسلمانوں کو سامع بنایا جائے؟ اور بطور اِستعلا انہیں مسجدوں میں داخلہ کی دعوت دی جائے؟

مِعمار اور مزدور کی شکل میں یا مسلمان عُلما وائمہ کا وعظ وخطاب سننے کی نیت سے کوئی غیر مسلم کسی مسجد میں جائے یا بلایا جائے تو اس کی الگ بات اور الگ مسئلہ ہوتا مگر یہاں تو واعظ ومبلّغ ومُقتدیٰ ورہنما کے طور پر یہ مُشرک لیڈران مساجد میں بلائے گئے تھے۔اور ایسے داخلہ واِعزاز کے حق میں خلافت وموالات کے سرگرم لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد نے رانچی (بہار) سے ۱۹۱۹ء میں ”جامعُ الشَّواھد فی دخولِ غیرِ المُسلِمین فِی المَساجِد ‘‘ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کر کے اِرسال فرمایا تھا۔

گذشتہ تحریکات کے نتیجے میں ’’تحریکِ ہجرت‘‘ بھی اسی دور (۱۹۲۰ء) میں عالَم وجود میں آئی اور ہزاروں ہندوستانی مسلمان پناہ گزیں کی حیثیت سے افغانستان میں داخل ہوگئے۔مگر جب افغان حکومت نے اس سیلاب کو روکنے کا اِقدام کیا اور ایسے مہاجرین کے داخلے پر پابندی عائد کر دی تو جس بدحالی وخستہ حالی کے ساتھ ان مُہاجرین کی ہندوستان

واپسی ہوئی وہ اس تحریک کا ایک عبرت ناک باب ہے۔جس نے اس ہجرت کی تبلیغ وتحریک میں شامل عُلما وقائدین کو بعد میں سخت پشیمانی وشرم ساری سے دوچار کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان سے مسلمانوں کی ''ہجرت،، کے زبردست مبلّغ تھے ۔ شیخ محمد اِکرام (متولد ۱۹۰۸ء۔متوفی ۱۹۷۳ء) لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد جو اِتحادِ اسلامی کے جوشیلے علم بَردار اور خلافتِ عثمانی کے سرگرم مُعاوِن تھے،انہوں نے تحریکِ خلافت میں پورا حصہ لیا۔ہجرت کے حق میں سب سے زوردار فتویٰ انہیں کا تھا۔'' (ص ۲۷۳۔موجِ کوثر از شیخ محمد اِکرام۔مطبوعہ دہلی)

ایک سیاسی لیڈر ظفر حسن ایبک (متوفی جنوری ۱۹۸۹ء) شاگرد ورفیقِ مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں:

''نتیجہ یہ ہُوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے۔افغانستان پر مالی بوجھ پڑا۔ہندوستانی مسلمان افغانستان سے،اور افغانستانی مسلمان ہندوستانی مسلمانوں سے،کبیدہ خاطر ہوئے۔

اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے'' (آپ بیتی۔حصہ اول۔از ظفر حسن ایبک۔مطبوعہ لاہور)

مشہور ادیب ومؤرخ رئیس احمد جعفری ندوی (۱۹۱۲ء۔۱۹۶۸ء) لکھتے ہیں:

''خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ ہزاروں مسلمان افغانستان ہجرت کر گئے۔ وہاں جگہ نہ ملی، واپس کیے گئے۔کچھ مَر کھپ گئے۔جو واپس آئے تباہ حال،خستہ،دَرماندہ، مفلس،قلاش،تہی دست،بے نَوا،بے یار ومددگار۔

اگر اسے ہلاکت نہیں تو کیا کہتے ہیں؟ (ص ۱۰۸۔حیاتِ محمد علی جناح۔مؤلّفہ رئیس احمد جعفری ندوی۔مطبوعہ تاج آفس بمبئی)

واضح رہے کہ اس دور میں ہندوستان دارُالحرب نہیں تھا کہ یہاں جہاد یا ہجرت واجب ہو۔ہندوستان بیسویں صدی عیسوی کے پہلے دوسرے عَشرے میں بھی دارُالاسلام

تھا اور اِس اِکیسویں صدی عیسوی کے پہلے دوسرے عشرے میں بھی دارُالاسلام ہے۔جو ملک دارُالاسلام ہوچکا ہو وہ اگر کسی دور میں دارُالحرب ہوجائے جب بھی حالات (مع شرائط) بدلتے ہی وہ دارُالاسلام ہوجاتا ہے۔اور دارُالاسلام ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ جب تک مسلم حکومت ہو اس وقت تک دارُالاسلام ہے اور مسلم حکومت ختم ہوتے ہی وہ دارُالحرب ہوجائے۔یہ خیال غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ مسلم حکومت ختم ہونے کے بعد بھی اگر شعائرِ اسلام واَحکامِ اسلام پر مسلمانوں کو عمل کرنے کی آزادی ہے تو وہ ملک دارُالاسلام ہی رہے گا جیسا کہ اِس وقت ہمارا ملک ہندوستان ہے۔

تفصیل وتحقیق کیلئے قدیم وجدید کتبِ فقہ ملاحظہ فرمائیں۔بِالخصوص اس اہم موضوع پر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا دقیع رسالہ بنام **اعلامُ الاعلام باَنَّ ھندوستان دارُالاسلام** (مطبوعہ بریلی ومشمولہ فتاویٰ رضویہ مترجم ۱۴۔مطبوعہ لاہور وبمبئی) قابلِ مطالعہ ہے۔

رسالہ **اعلامُ الاعلام** ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء میں لکھا گیا اور امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے وصال (۱۹۲۱ء) کے بعد ۱۹۲۷ء میں اس کی پہلی طباعت واشاعت حسنی پریس بریلی سے ہوئی جس کے اندر آپ تحریر فرماتے ہیں:

''دارُالاسلام کے دارُالحرب ہوجانے کے بارے میں جو تین باتیں ہمارے امامِ اعظم امامُ الائمہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہُ کے نزدیک درکار ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں اَحکامِ شرک جاری ہوں اور شریعتِ اسلامیہ کے اَحکام وشعائر مطلقاً جاری نہ ہو پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔

مگر یہ بات بِحمدِاللہ یہاں قطعاً موجود نہیں۔'' (**اعلامُ الاعلام** مؤلَّفہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی۔مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔۱۹۲۷ء)

مذکورہ متعدد تحریکات میں شرعی مبادی واصول اور فقہی قواعد وضوابط کو نظر انداز کرنے او رمسلم مفادات سے بے نیاز رہ کر کیے جانے والے جذباتی فیصلوں کا خمیازہ مختلف مَراحِل

میں مسلمانانِ ہند کو بھگتنا پڑا۔ ان تحریکات کا گاندھی وغیرہ نے کس طرح استعمال کیا اس کا انکشاف تحریکِ خلافت وترکِ موالات کے سرگرم اور جذباتی لیڈر مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) کی زبانی سنیے جنھوں نے ۲۵؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور اجلاس میں بیان کرتے ہوئے کہا:

''ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما گاندھی نے دورے کے مَصارِف خلافت کے سرمایہ سے لیے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے اس کے دورانِ سفر کے مَصارِف بھی ادا کیے۔'' (ص ۱۰۵۔ حیاتِ محمد علی جناح مولّفہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ مطبوعہ بمبئی)

گاندھی کی قیادت کے اَثرات کا یہ حال تھا کہ پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی) لکھتے ہیں:

''جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء کے وسط میں خلافت کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی اور نومبر میں اس کا عام اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو ہندوستانی مسلم قیادت نے بڑی سمجھداری سے اس کا صدر مہاتما گاندھی کو بنادیا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد میں مسلمانوں نے پورے خلوص سے اور مؤثر طور پر حصہ لیا تھا اور عدم تعاون کی تحریک میں دل وجان سے شامل ہوکر دونوں مِلّتوں نے اتحاد کے رشتے مضبوط کیے تھے۔'' (ص ۱۲۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فراغ اردو، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء)

تحریکِ خلافت کے سرگرم لیڈر قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں:

''تحریکِ خلافت کی قیادت ابتدا سے انتہا تک مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں تھی۔ بلکہ یہ کہنا صحیح اور بجا ہوگا کہ:

اگر مہاتما گاندھی اس تحریک میں پوری قوت کے ساتھ شامل ہوکر اس کا کُل بار اپنے کاندھوں پر نہ لیتے تو تحریکِ خلافت میں جو زور پیدا ہوا وہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا'' (ص ۱۶۔ تحریکِ خلافت از محمد عدیل عباسی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی

۔ طبعِ دوم ۱۹۹۷ء)

پروفیسر محمد مجیب (جامعہ مِلّیہ اسلامیہ، نئی دہلی) لکھتے ہیں:

''عدمِ تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی تو اِس سے اُن سب کو زبردست صدمہ پہنچا جو اس میں شریک تھے۔

مسلمانوں کے لئے خاص طور پر یہ بات بہت تباہ کن ثابت ہوئی۔ انھوں نے مذہبی بنیاد پر غیر مشروط فیصلے کیے تھے اور ان کی طرف سے رہنماؤں نے تحریک کی واپسی کے جو اعلان کیے تھے ان میں کوئی مذہبی وجوہ نہ تھے۔'' (ص ۶۲۴۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء)

''ایک دور ایسا تھا جب اسٹیج پر مولانا محمد علی چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں وہ مہاتما گاندھی کے اتنے قریب تھے جتنے اور کوئی سیاسی رہنما کسی وقت ہو سکتے تھے۔ لیکن جب ۱۹۲۳ء میں جیل سے باہر آئے اور ملک کی صورتِ حال کا مطالعہ کیا تو انھیں مجبوراً مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے ہندوؤں کی جارِحیت اور لڑاکا پن کے خلاف مسلمانوں کے غم وغصہ کی نمائندگی شروع کردی۔'' (ص ۶۲۷۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ نئی دہلی)

''برطانوی حکومت پر براہِ راست عمل کے ذریعہ دباؤ ڈالنے کی غرض سے مہاتما گاندھی نے مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ شروع کی۔ یہ اس بات کا فیصلہ تھا کہ سب سے پہلی شرط ہے آزادی کا حصول۔ دوسرے مسائل آزادی کے بعد ہی حل ہوسکیں گے۔

چنانچہ سوال یہ اُٹھا کہ کیا مستقبل میں اپنے مقام اور حقوق حاصل کیے بغیر مسلمان سِوِل نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیں؟

اس میں کتنوں نے حصہ نہیں لیا؟ اس پر اختلاف ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شرکت خاصی تعداد میں ہوئی۔

اپریل ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی اس میں مولانا محمد علی نے اعلان کیا کہ

"مسلمان برطانوی غلبہ نہیں چاہتے۔ اور وہ مسٹر گاندھی کی تحریک میں بھی حصہ نہیں لے سکتے۔ کیوں کہ اس تحریک کا مقصد:

"ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ہندومہاسبھا کا غلام بنانا ہے۔"

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہی محسوس کرتی تھی اس لئے اس نے مولانا محمد علی جوہر کی خوب خوب تعریف کی کہ انھوں نے ان کے جذبات کو پوری وضاحت اور شدّ و مد کے ساتھ پیش کر دیا۔

لیکن انصاف کا تقاضہ یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ:

دوسری طرف ایسے رَجعت پسند ہندو بھی تھے جو قومی اِحیا کا مطلب ہی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو دَبا دیا جائے۔" (ص ۶۲۸۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

تحریکِ خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات وغیرہ کے سلسلے میں حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا مَوقِف بھی وہی تھا جو امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا تھا ۔ اور اس سلسلے میں آپ کی معرکۃُ الآرا کتاب بنام "النُّور"، طبعِ اول مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی نے انصاف پسند اہلِ علم وفکر کو بڑی حد تک متأثر کر لیا تھا۔

اسی دور کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان اشرف اور مولانا محمد علی جوہر کے درمیان ایک گرما گرم مباحثہ ہوا جس کی رُوداد کچھ اس طرح ہے:

نواب مشتاق احمد خاں حیدرآبادی صاحبزادۂ نواب فخر یار جنگ سابق وزیر مالیات ریاستِ حیدرآباد دَکن ایک تحریر میں اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مولانا سید سلیمان اشرف (صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اپنے خیالات کا اظہار کھُلَّم کھُلاَّ اور لگی لپٹی کے بغیر کر دیتے تھے۔ رَو میں بَہ جانے والے لوگوں نے

خاص کر بعض عُلمائے کرام نے انہیں بہت بُرا بھلا کہا اور ان کے خلاف اخباروں، رسالوں میں لَعن طَعن ہوتی رہی مگر وہ ٹس سے مَس نہ ہوئے۔

ایک دن جب وہ تفسیر کا درس دے رہے تھے، مولانا محمد علی جوہر جنھوں نے اس زمانے میں اپنا مُستقر علی گڑھ بنا لیا تھا، طلبہ کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد (مسلم یونیورسٹی) میں تشریف لائے اور قریب آکر مولانا (سید سلیمان اشرف) پر ایک فقرہ چُست کر دیا۔

.... اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اور سُنا، مولانا (سید سلیمان اشرف) کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے مَوقِف پر ڈٹے رہے بلکہ اس گرما گرم بحث میں مولانا محمد علی جوہر جیسے شخص کو نیچا دکھا دیا۔

اور ان کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ:

"آپ لوگوں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو تماشہ بنا دیا ہے۔ میں زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ کون حق پر ہے؟ (ص ۹۲۔ ماہنامہ ضیاے حرم لاہور۔ شمارہ جون ۱۹۷۷ء۔ بقلم نواب مشتاق احمد حیدرآبادی)

نصیحت وہدایت اور عبرت وموعظت کے لئے قارئین مندرجہ ذیل دو تحریریں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) اپنے مشاہدات وتأثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"خلافت والوں کو اَب پوچھتا کون تھا؟ سارا جوش وخروش ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۳ء میں ختم ہو چکا تھا۔ بَچا کھُچا اثر ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء تک ساتھ دیتا رہا۔ اب نہ کہیں خلافت کانفرنس ہوتی تھی، نہ کہیں خلافت کے ممبر ہی باقی رہ گئے تھے۔

ایک خوابِ شیریں تھا جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہُوا بھُلا چکے تھے۔ شوکت علی غریب، بمبئی میں مرکزی خلافت کمیٹی کو سینہ سے چمٹائے بیٹھے تھے۔

بہر حال! مرکزی خلافت کمیٹی نے ۱۹۲۶ء میں طے کیا کہ خلافت کا اجلاس ایک

بار پھر ہو۔اوراس کے ضمیمہ کے طور پر مؤتمرِ عالمِ اسلامی کا اجلاس بھی رکھا جائے۔

خلافت کے صدر، کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون طے پائے اور مؤتمر کے صدر حکیم اجمل خاں۔مقامِ اجلاس کے لئے قرعۂ انتخاب لکھنؤ کے نام پر نکلا اور تاریخیں آخر فروری (۱۹۲۶ء) کی قرار پائیں۔

جلسہ گاہ کے لئے سیٹی اسٹیشن (لکھنؤ) کے سامنے بلند باغ روڈ اور جگ نرائن روڈ کے جنکشن پر ''رفاہِ عام کلب'' کے نام سے جو عظیم الشان عمارت ہے، اس کا انتخاب ہوا۔

شہر میں اشتہار تقسیم کرنے کے لئے ہمارے والینٹروں (رضا کاروں) کی ٹولی جب یکّوں پر اور پیدل باجہ بجاتی ہوئی نکلی تو وزیر گنج (لکھنؤ) کی ایک بُڑھیا کا فقرہ تھا:

''اے لو! خلافت پھر نکلی۔''

عوام کے دل سے اس کا تصور تک مٹ چکا تھا۔اب جو نام سنا تو جیسے بھولا ہوا سبق یک بیک پھر دوبارہ یاد آ گیا۔'' (ص ۳۵۶ و ۳۵۷۔مولانا محمد علی جوہر! سیرت وافکار۔ازعبدالماجد دریابادی۔مطبوعہ کراچی۔۲۰۰۱ء)

اردو زبان کے صاحبِ طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء۔علیگڑھ) مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیوسٹی علی گڑھ کے شاگرد اور ان کی مجلسِ علم وادب وتحقیق کے مستقل حاضر باش تھے۔وہ مولانا سید سلیمان اشرف کے بارے میں اپنے ذاتی تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔نان کوآپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔'' گائے کی قربانی،، اور'' موالات،، پر بڑے بڑے جیّد اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔اس زمانے کے اخبارات،تقاریر،تصانیف،اور رُجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا؟

''اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ: جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔''

کالج (علیگڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔مرحوم (سید سلیمان اشرف) مَطعُون ہو رہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔

اس زمانے میں اسی دومنزلہ کے پچھلے کمروں میں رہتا تھا۔اور میرے اور مرحوم کے درمیان صِرف ایک دیوار حدِّ فاصل تھی۔جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا۔

کہتے تھے: رشید! دیکھو! عُلما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں؟ اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھروندا بنا رکھا ہے؟

..........سیلاب گذر گیا۔جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہُوا۔لیکن مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔

سارے عُلما سیلاب کی زد میں آ گئے تھے۔صرف مرحوم (سید سلیمان اشرف) اپنی جگہ قائم تھے۔'' (ص ۲۳۔۲۴ گنجہائے گراں مایہ۔طبعِ ہفتم نومبر ۱۹۸۷ء۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔بقلم پروفیسر رشید احمد صدیقی)

''نورِ بصیرت،، کی شعاعیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہیں اس لئے اب انہیں سمیٹ کر اپنی بات ان دو چار تأثرات کے ساتھ ختم کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جن کی روشنی میں آپ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے علم وفضل، حکمت وبصیرت، اِصابت رائے، صحتِ موقف، وُسعتِ مطالعہ اور فکری قیادت جیسی اعلیٰ صفات وخصوصیات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی ومولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد مولانا کوثر نیازی (ولادت ۱۹۳۴ء۔وفات مارچ ۱۹۹۴ء) سابق مرکزی وزیر مذہبی امور،حکومتِ پاکستان۔وسابق مدیر اعلیٰ ہفت روزہ شہاب لاہور اپنے خلاصۂ مطالعہ اور فکری تأثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سب سے پہلے تو اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ امام احمد رضا پالیٹیشن نہیں اسٹیٹسمین تھے۔ سیاسی لیڈر نہ تھے مدبّر تھے۔

پالیٹیشین اور سیاسی لیڈر عوام کی خواہشات کے تابع ہوتے ہیں۔ جب کہ اسٹیٹسمین اور مدبّرین پیش بینی کر کے حالات کا رُخ متعین کرتے ہیں۔'' (ص ۴۔ ''امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت'' از کوثر نیازی مطبوعہ ادارہ معارفِ نعمانیہ لاہور ۱۹۹۰ء۔ وروزنامہ جنگ لاہور۔ شمارہ ۳ر اکتوبر ۱۹۹۰ء)

مولانا کوثر نیازی فیصلہ کن انداز میں اپنی یہ قطعی رائے پیش کرتے ہیں کہ:

''تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرت اور ایک بحث یہ کہ ہندوستان دارُالاسلام ہے یا دارُالحرب؟

ان سارے موضوعات پر امام احمد رضا کا جو نُقطۂ نظر تھا، ہر چند کہ اس پر گرد اُڑائی جاتی ہے لیکن علمی سیاست کے تقاضوں سے جس قدر ہم آہنگ اور دینی اَقدار کی ترجمانی سے جس قدر نزدیک اور حقیقت پر مبنی ان کا مَوقِف ہے، کسی اور کا نہیں۔'' (ص ۳۷۔ سال نامہ معارفِ رضا، کراچی ۱۹۹۰ء)

جناب ملک غلام علی صاحب جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے معتمد نائب اور جماعتِ اسلامی پاکستان کے صفِ اول کے قائد تھے، وہ کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بارے میں اب تک ہم لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف اور فتاویٰ کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ:

''جو علمی گہرائی و گیرائی میں نے ان کے یہاں پائی وہ بہت کم عُلما میں پائی جاتی ہے۔ اور عشقِ خدا و رسول تو ان کی سطر سطر سے پھوٹا پڑتا ہے''۔

(ہفت روزہ شہاب، لاہور۔ شمارہ ۲۰ر نومبر ۱۹۶۲ء)

شاہ معین الدین احمد ندوی (دارُالمصنفین اعظم گڑھ) لکھتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم صاحبِ فکر و نظر عُلما و مصنفین میں سے تھے۔ دینی علوم خصوصاً حدیث و فقہ پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی۔

مولانا نے جس دِقّتِ نظر اور تحقیق کے ساتھ عُلما کے اِستفسارات کے جوابات تحریر فرمائے ہیں، اس سے ان کی جامعیت، علمی بصیرت، قرآنی اِستحضار، ذہانت اور طبّاعی کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے عالمانہ مُحقّقانہ فتاویٰ موافق و مخالف ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہیں۔''

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ۔ شمارہ ستمبر ۱۹۶۲ء)

سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایک علمی و فکری مجلس کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب کے ایک شاگرد ڈاکٹر سید عابد احمد علی ڈائریکٹر بیت القرآن لاہور و سابق لکچرر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک بقلم خود تحریری بیان ہے کہ:

''غالباً ۱۹۳۳ کا واقعہ ہے کہ علامہ اقبالؔ مسلم یونیورسٹی میں موجود تھے۔ ایک مجلس جس میں مَیں بھی موجود تھا، دورانِ گفتگو مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا تذکرہ آ گیا۔ علامہ مرحوم نے مولانا بریلوی کو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طبّاع و ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا''

............سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ:

............میں نے ان کے فتاویٰ کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔ اور ان کے فتاویٰ، ان کی ذہانت، فطانت، جَودتِ طبع، کمالِ فقاہت اور علومِ دینیہ میں تبحرِ علمی کے شاہدِ عدل ہیں۔

نیز فرمایا: مولانا بریلوی ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے تھے۔ لہٰذا اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں انہیں کبھی کسی تبدیلی یا رُجوع کی ضرورت نہیں پڑی۔'' الیٰ آخرہٖ۔

عابد احمد علی۔ یکم اگست ۱۹۶۸ء (اس پورے تحریری بیان کا عکس، ہفت روزہ اُفق کراچی، شمارہ ۲۳ تا ۲۸ر جنوری ۱۹۷۹ء میں ملاحظہ فرمائیں)

اپنے باشعور قارئین کو اَب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ:

فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) اپنے علم وفضل، تدبُّر وحکمت، کثرتِ مطالعہ، وُسعتِ نظر، اِصابتِ رائے، طبعِ سلیم، فکرِ قویم، بصیرت و استقامت اور فکری قیادت کے باب میں اپنی مثال آپ تھے۔ جن کی مہارتِ فکر وفن اور عبقریت کو ملک وبیرونِ ملک کے بے شمار عُلما وفُضَلا اور دانشوروں نے تسلیم کرتے ہوئے انہیں خراجِ عقیدت وتحسین پیش کیا اور نازک وپیچیدہ جذباتی مسائل میں امام احمد رضا نے شرعی اصول پر مبنی جو فتاویٰ صادر کیے اُن کی صحت وصداقت پر حالات اور تاریخ نے بھی مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

نہ اپنے قارئین کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ:

غیر سنجیدہ شور وہنگامہ اور بے بنیاد پروپیگنڈہ کا اثر عوام کے دل ودماغ میں جتنی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بناتا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اثر معدوم بھی ہوجاتا ہے۔ اور جب حقیقتِ حال ان پر منکشف ہوجاتی ہے تو تنقید ومذمّت کا ایک لامتناہی اور ایسا ناقابلِ برداشت سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جس کا سامنا کرنے کی تاب ان جذباتی قائدین کے اندر نہیں ہوتی جو حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس شور وہنگامہ اور پروپیگنڈہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور ذکرِ ماضی ان کے لئے ایک آزار اور عذاب بن جاتا ہے جو مدتوں ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔

انہیں یہ یاددلانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ:

ماضی قریب کی تحریکِ تحفظِ بابری مسجد میں بھی لگ بھگ وہی تاریخ دُہرائی گئی جس کا رِشتہ تحریکِ خلافت اور اس کے بعد کی تحریکات کے جذباتی بیانات وواقعات اور عاقبت نااندیشی سے ملتا ہے۔

اور یہ دونوں بڑی تحریکیں (تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) اور تحریکِ تحفظِ بابری مسجد (از یکم فروری ۱۹۸۶ء تا ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء) ہمیں پیغام دیتی ہیں کہ:

جن مذہبی وشرعی مسائل کی باگ ڈور سیاست دانوں کے ہاتھ میں دے دی جائے اُن کا انجام آئندہ بھی وہی ہوگا جو اِن دونوں تحریکوں کا ہوچکا ہے۔

یکم فروری ۱۹۸۶ء کو فیض آباد سیشن کورٹ کے حکم سے بابری مسجد اجودھیا کا تالا کھلنے اور ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید ہونے کے درمیان جو کچھ ہُوا اُسے دیکھنے سننے جاننے والے کروڑوں ہندوستانی مسلمان ابھی زندہ اور موجود ہیں جو اپنے ذہن پر ذرا سا زور ڈالیں تو مسئلۂ بابری مسجد میں خود بعض مسلم سیاست دانوں کے کئی جذباتی بیانات نیز غیر ذمہ دارانہ اعلانات اور یوپی وبہار وغیرہ کے کئی ایک بڑے ہندو نیتاؤں کی طرف سے مسئلۂ بابری مسجد کے اِستحصال اور سیاسی قلابازی کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے گردش کرتے نظر آئیں گے جن کے ظاہری اسباب ووجوہ کے نتیجے میں بابری مسجد کی شہادت کا زخم مسلمانوں کو سَہنا پڑا۔ حالاں کہ اس سلسلے میں ذِمّہ دار ودُور اندیش مذہبی شخصیات کا نُقطۂ نظر واضح تھا کہ مضبوط دلائل وشواہد کے ساتھ کورٹ میں بابری مسجد کا مقدمہ لڑا جائے۔ جمہوری اور نہایت پُرامن طور پر کوئی احتجاج ومظاہرہ کیا جائے۔ اشتعال انگیز تقاریر وبیانات سے سخت پرہیز کیا جائے کہ اس سے براہِ راست ہندو مسلم تصادم کے حالات پیدا ہوں گے جو خود مسلمانوں ہی کے لئے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ

اس سلسلے میں متانت ودِقّتِ نظر اور انصاف ودیانت کے ساتھ مندرجہ ذیل تاریخی تحریریں پڑھ کر قارئین خود فیصلہ کریں کہ کون سا مَوقِف صحیح تھا؟ کس موقف کے اختیار کرنے میں مِلّتِ اسلامیۂ ہند کا فائدہ تھا؟ اور کس مَوقِف کو اصولی وشرعی اور مفید ونتیجہ خیز قرار دیا جائے گا؟

''آج جب کہ زیریں عدالت نے بابری مسجد کا تالا کھولنے اور اس میں پوجا کرنے کی اجازت دے دی ہے، اس سے مسلمانوں کے جذبات شدید طور پر مجروح ہوئے ہیں لیکن انہیں ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ آئینی وقانونی جدوجہد کے راستے بند نہیں ہوئے ہیں۔

یہ فیصلہ یقیناً عدالتِ بالا میں چیلنج کیا جائے گا۔ اور فوری طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ اس مسئلہ کو عدالتِ بالا میں لے جانے کا اِہتمام کیا جائے اور مسلم ماہرینِ قانون عملی طور پر اس کے لئے متحرک ہو جائیں اور تدبُّر و دانش مندی کے ساتھ اسے آگے بڑھائیں۔

حکومتِ ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور ان کے جائز حقوق تسلیم کرتے ہوئے بابری مسجد اجودھیا کو ان کے حوالہ کرے اور اس میں نماز ادا کرنے کی انہیں باضابطہ اجازت دی جائے''۔ (ص ۱۴ ہفت روزہ نئی دنیا، نئی دہلی۔ شمارہ ۲۵ ر فروری ۱۹۸۶ء تا ۳ ر مارچ ۱۹۸۶ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

قائدینِ تحریکِ بابری مسجد کی جانب سے تقریباتِ ۲۶ ر جنوری (۱۹۸۷ء) کے بائیکاٹ کے فیصلے اور اپیل کی اشاعت کے بعد ایک بیان میں کہا گیا کہ:

''پورے صبر و استقامت کے ساتھ یہ فکری و تاریخی جنگ لڑنی ہوگی اور منزلِ انصاف تک پہنچنے کے لئے پہلے ہی مرحلے میں ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے جو اُسے اپنی منزل سے دور کر کے غلط راہوں پر ڈال دے اور نئی نئی مشکلات و مسائل کا شکار بنا دے۔

''بابری مسجد کانفرنس'' نے یومِ جمہوریہ کو ''یومِ غم'' منانے کا جس طرح مطالبہ کیا ہے وہ ایک نہایت عُجلت پسندانہ اِقدام ہے۔'' الخ (ص ۱۰ ہفت روزہ اخبارِ نو، دہلی۔ شمارہ ۱۶ ر تا ۲۲ ر جنوری ۱۹۸۷ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

قائدینِ تحریکِ بابری مسجد نے اعلان کیا تھا کہ ۱۴ ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ''اجودھیا مارچ'' کیا جائے گا جس پر عمل نہ ہو سکا۔ اس اعلان کے بعد ایک بیان محرَّرہ ۸ ر جون ۱۹۸۸ء میں کہا گیا کہ:

''اب جہاں تک بابری مسجد کی بازیابی کا سوال ہے تو اس کے لئے صرف ایک پُر امن اور محفوظ راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلم رائے عامہ کی ساری قوت فقط اس مطالبہ پر صَرف کریں کہ اس مسجد کے اِستحقاق کا فیصلہ کرنے کے لئے حکومت ایک اسپیشل بنچ قائم کر کے مقدمہ کی سماعت کے لئے جنوبی ہند کے کسی جج کو مقرر کرے۔

ہمارے پاس اپنے اِستحقاق کے اتنے تاریخی و قانونی شواہد ہیں کہ خدا کے فضل سے

فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور رام جَنم بھُومی کا دعویٰ ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ جس کے بعد قانون کی نظر میں بھی بابری مسجد کی پوزیشن بالکل واضح ہو جائے گی کہ وہ صرف بابری مسجد ہے، رام جَنم بھُومی نہیں ہے۔ اور پھر پوری دنیا کی رائے عامّہ ہمارے ساتھ ہوگی۔

اور یہ راستہ ہمیں اس لئے اختیار کرنا چاہیے کہ اس کے سِوا بابری مسجد کی بازیابی کا بظاہر کوئی راستہ نہیں۔ اور ہمیں اپنے آئینی و اخلاقی حُدود اور اسلامی قواعد و ضوابط کے مطابق ہی سارے اِقدامات کرنے چاہئیں۔'' (ص ۵ ہفت روزہ نئی دنیا، نئی دہلی۔ شمارہ ۱۷ تا ۲۳۔ جون ۱۹۸۸ء۔ از ارشد القادری و یٰسین اختر مصباحی)

بعنوان ''تحریکِ خلافت سے تحریکِ بابری مسجد تک'' کے اِداریہ کا ایک حصہ یہ ہے:

''صرف شور و غوغا اور جذباتی ہنگامہ آرائیوں کی بیساکھیاں استعمال کی گئیں تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ عہدِ حاضر کا مؤرّخ ''تحریکِ تحفظِ بابری مسجد'' کو ''تحریکِ تحفظِ خلافت'' سے زیادہ جذباتی اور اسی کی طرح ناکام تحریک قرار دے۔ بلکہ اس تحریک کے سَر یہ الزام بھی عائد کر دے کہ اس کی غلط رَوی نے مِلّتِ اسلامیۂ ہند کو چند در چند مسائل و مشکلات سے دوچار کر دیا اور تلخ ترین نتائج نے مسلم عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی۔'' (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔ شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ از یٰسین اختر مصباحی)

ایک دوسرے اِداریہ کا خاص حصہ یہ ہے:

''ہمیں یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ:

بابری مسجد تحریک کے کاندھوں پر سوار بعض مسلم لیڈر جن کی حکمتِ عملی بوٹا سنگھ (مرکزی وزیر داخلہ حکومتِ ہند) کی میز پر تیار ہوتی ہے، انھوں نے اپنی سیاست کی دوکان چمکانے کی خاطر مسلمانوں کو اس خوفناک مرحلے تک پہونچایا۔

جس طرح اس حقیقت کا اظہار کرنے میں ہمیں کوئی خوف دامن گیر نہیں کہ بابری مسجد ایک منظّم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ۹ ر نومبر ۱۹۸۹ء کو فرقہ پرست ہندو تنظیموں کے سامنے گھٹنے ٹیک کر حکومتِ وقت نے بدترین موقع پرستی کا ثبوت دیا اور وشو ہندو

پریشدو بجرنگ دل وبی جے پی کی مُردہ رگوں میں اس نے اپنی غلط حکمتِ عملی سے ایک تازہ خون دوڑا دیا۔'' (اداریہ ماہنامہ حجاز جدید دہلی۔شمارہ دسمبر ۱۹۸۹ء۔ازیٰسین اختر مصباحی)

۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو دارالعلوم غریب نواز، الہ آباد، یوپی میں راقمِ سطور (یٰسٓ اختر مصباحی) کی تحریک پر عُلمائے اہلِ سنّت کی ایک اہم مشاورتی نشست ہوئی جس میں متعدد تجاویز منظور کی گئیں۔مثلاً

(۱) بابری مسجد ہر حال میں بابری مسجد ہے اس لئے اس کی بیع و منتقلی کسی شکل میں جائز نہیں ہے۔نہ اسے اکوائر کرنے کا حکومت یا کسی کو اختیار ہے۔

(۲) قبرستان کی زمین پر ۹ر نومبر ۱۹۸۹ء کو کیا جانے والا شیلانیاس ناجائز ہے۔

(۳) مسلم عوام و قائدین ہوش مندی و دُور اندیشی کے ساتھ موجودہ نازک حالات کا مقابلہ کریں۔سڑک پر آکر غیر ضروری احتجاج و مظاہرہ سے گریز کرتے ہوئے خُدا اعتمادی و خود اعتمادی کے ساتھ اپنے آئینی و جمہوری حقوق کے تحفظ کی مؤثّر تدابیر اختیار کریں۔اور حَرارتِ ایمانی کے ساتھ فراستِ ایمانی کا مظاہرہ کریں۔''

شرکاے میٹنگ و دستخط کُنندگان:

مفتی محمد شریف الحق امجدی (صدر شعبۂ اِفتا الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یو پی) علاّمہ ارشد القادری (بانی و مہتمم جامعہ فیض العلوم جمشید پور، بہار) علاّمہ ضیاء المصطفیٰ قادری (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) مولانا یٰسین اختر مصباحی (دہلی) مفتی شفیق احمد شریفی (دارالعلوم غریب نواز، الہ آباد) مولانا اختر حسین قادری (کوٹہ، راجستھان) حافظ ظہیر الدین قادری (کانپور) سید محمد اکمل اجملی و سید محمد اجمل اجملی (دائرۂ شاہ اجمل، الہ آباد) سید شمیم گوہر (الہ آباد) مولانا ملکُ الظفر سہسرامی وغیرھُم۔(ص ۱۰۔۱۱۔ماہنامہ حجاز جدید، دہلی۔شمارہ جنوری و فروری ۱۹۹۱ء)

تحریکِ خلافت و تَرکِ موالات و ہجرت و تحریکِ تحفظِ بابری مسجد کی جذباتیت اور سیاسی داوٗ پیچ کے جو عبرتناک و افسوسناک نتائج مِلّتِ اسلامیۂ ہند کو بھگتنے پڑے ان کا تقاضہ

اور واضح پیغام ہے کہ کم از کم آئندہ کے لئے مسلمانانِ ہند یہ سبق اچھی طرح یاد کر لیں کہ:

جن مذہبی و شرعی مسائل میں اہلِ سیاست زیادہ دِل چسپی لینے لگیں اُن سے حد درجہ مُحتاط اور چوکنّا رَہیں۔اور ہر لمحہ اس بات پر نظر رکھیں کہ ان کی دل چسپی اور سرگرمی کے اصل مقاصد واَسباب کیا ہیں؟ اور کچھ لوگ مذہب و شریعت کا نام لے کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے اور اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کا کاروبار تو نہیں کر رہے ہیں؟

اگر ان مسائل و تحریکات سے وابستہ مسلم قائدین کے ارادے نیک ہوں، تب بھی کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی شاطر دماغ گروہ اور مفاد پرست عناصر کی سازش و ریشہ دوانی کا شکار ہو رہے ہیں؟

نیز ہر قدم پر یہ حقیقت یاد رکھیں کہ:

مسلمان اپنے معتقدات و عبادات اور اپنے مذہبی اَعمال واَفعال واُمور و معاملات و معمولات کے لحاظ سے دوسروں سے یکسر مختلف و منفرد ہیں۔انھیں اپنے تشخّص اور اپنی شناخت کے ساتھ اس دنیا میں جینا اور مَرنا ہے۔

دوسروں کے ساتھ معاملات جائز ہیں مگر مَوَدّت و موالات ہر کافر و مُشرِک و یہودی و نصرانی و مجوسی وغیرہ سے قطعاً ناجائز ہے۔

معاملات کا بھی یہ مسئلہ ہے کہ دوسروں کے مذہبی خیالات واَعمال سے اپنے آپ کو اور اپنے مذھبی خیالات واَعمال سے انھیں (جب کہ کوئی دعوتی پہلو نہ ہو) جُدا رکھنا فرض ہے، تاوقتیکہ وہ دامنِ اسلام سے وابستہ نہ ہو جائیں۔اور دَعوتی مقاصد کے تحت بھی جو رابطہ و تعلق ہو اُسے دائرۂ شریعت کے اندر ہی رکھا جائے۔

ہاں! بہت سے دنیاوی معاملات مثلاً سیاست و تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت و علومِ عصریہ وغیرہ نیز عام سماجی و رفاہی کاموں میں بقدرِ ضرورت و حاجت روابط و تعلقات رکھنا شرعاً جائز ہے اور پُر اَمن بقاے باہم کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے ملک و وطن کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتے رہنا بھی مسلمانانِ ہند کی وطنی اور اخلاقی و آئینی ذِمّہ داری ہے۔

هَذاھُوَ الْاَظھر والعِلمُ عندَاللّٰہ وھُوَاَعلمُ واَعظمُ واَکبرُ۔

رَبَّنَا آتِنا فی الدُّنیاحسنةً وفی الآخر ةحسنةً وقِنَا عذابَ النَّار۔آمین آمین یاربَّ العالَمِین۔بجاہِ حَبیبِک ونَبِیّک سَیّدِ المُرسَلِین ۔علیہِ وعَلیٰ آلِہٖ واَصحابِہٖ الصَّلوٰةُ والتَّسلیم۔

دوشنبہ مبارکہ : ۱۳؍شوالُ المکرّم
۱۴۳۲ھ/۱۲؍ستمبر۲۰۱۱ء
رابطہ نمبر:09350902937

یٰسٓ اختر مصباحی
دارُالقلم، قادری مسجد روڈ، ذاکرنگر
،جامعہ نگر،نئی دہلی110025

پہلی اورآخری ہمہ گیرعوامی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

ہندوستان کے اندر کچھ شاطر دِماغ برطانوی تاجروں کی ’’ایسٹ اِنڈیا کمپنی‘‘ اوراس کی سازشوں وریشہ دوانیوں اور مسلسل چیرہ دستیوں کے نتیجے میں رُونما ہونے والے انقلاب ۱۸۵۷ء پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا ابھی باقی ہے۔

مطبوعہ مَواد کے علاوہ نیشنل آرکائیوز نئی دلی میں ہزاروں ایسے منتشر اوراق وصفحات موجود ہیں جن کی تحقیق وریسرچ اور چھان بین کی جائے تو تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں مل سکتی ہیں اور بہت سے نئے حقائق سامنے آسکتے ہیں۔

۱۶۰۰ء کے آخر میں مَلکہ الزبتھ نے لندن کی ایک تجارتی کمپنی کو بعہدِ بادشاہِ ہند جلال الدین محمد اکبر (متوفی ۱۴؍جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷؍اکتوبر ۱۶۰۶ء درآگرہ) ہندوستان میں تجارت کرنے کی باضابطہ منظوری دی۔ پرتگیزی اورڈَچ یہاں پہلے سے تجارت کیا کرتے تھے جنھوں نے انگریزوں کی مزاحمت ومخالفت کی مگرانگریز رفتہ رفتہ ان پر غالب آگئے۔

۱۶۰۸ء میں انگریزوں نے سورت (گجرات) میں سب سے پہلے ایک تجارتی کوٹھی بنا کر وہاں سے اپنا کام شروع کیا۔ مغل بادشاہ نورُالدین جہانگیر نے ۱۶۱۳ء میں سورت، کھمبات، گوا اوراحمد آباد میں انگریزوں کو اپنی تجارتی کوٹھیاں بنانے کا پَروانہ دیا۔ آزاد تجارت کی دولت عہدِ جہانگیر ہی میں انگریزوں کو حاصل ہوگئی۔

۱۶۱۵ء میں جیمس اول بادشاہِ انگلستان نے جہانگیر بادشاہِ دہلی کی طلب پر سَر ٹامس رُو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا جو چار سال تک یہاں مقیم رہا۔ کپتان ولیم ہاکنز تاجرِ ایسٹ انڈیا کمپنی ،سَر ٹامس سے پہلے ہندوستان میں موجود تھا جو بادشاہِ دِلّی کا ہمنشین بن چکا تھا۔ جہانگیر بائیس (۲۲) سال تک ہندوستان پر حکومت کر کے ۸؍صفر ۱۰۳۷ھ/ ۲۸؍اکتوبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے راستے میں انتقال کرگیا۔ شاہدرہ، لاہور میں اس کی تدفین ہوئی۔ جہانگیر کے عہد میں انگریزوں کو ہندوستان کے اندر آزاد تجارت کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔

شاہجہاں کے عہد میں انگریزوں کے تجارتی ادارہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے مشرقی ساحلِ مدراس پر ایک وسیع وعریض زمین خرید کر فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر کی۔ اور کلکتہ کے قریب دریائے گنگا کے دِہانے پر واقع مقام ہُگلی میں بھی ایک تجارتی کوٹھی بنالی۔

شاہجہاں نے ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ تک ہندوستان پر حکومت کی۔ ۲۶/رجب ۱۰۷۶ھ/ یکم فروری ۱۶۶۶ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں اس کا انتقال ہوا۔ وہیں اس کے تعمیر کردہ تاج محل کے اندر اس کی تدفین ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے مُعتمد اور مُہم جُو جنرل میر جُملہ کے انتقال (۱۶۶۳ء) کے بعد نواب شائستہ خاں کو میر جُملہ کی جگہ بنگال بھیجا جس نے تئیس (۲۳) برس تک وہاں حکومت کی۔

مولوی بشیرالدین دہلوی اِس شائستہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ وہی شائستہ خاں ہے جس نے ۱۶۶۸ء میں انگریز تاجروں کو اپنے علاقہ سے بدر کر دیا تھا اور اس سے پہلے بھی ۱۶۶۰ء میں اسی نے پُرتگیزوں اور دوسرے بحری قزّاقوں کو جو چٹا گانگ (بنگال) کے اَطراف میں کثرت سے بھرے ہوئے تھے، صاف کر دیا تھا۔''
(ص ۱۰۵، واقعاتِ دارُالحکومت دہلی، حصہ اول، ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء۔ از مولوی بشیرالدین دہلوی۔ طبعِ سوم، اردو اکاڈمی دہلی۔ ۱۹۹۵ء)

ہندوستان کے شرقی کنارے پر سب سے پہلے انگریزوں کی تجارتی کوٹھی ۱۶۲۵ء میں امرگاؤں ضلع نلّور اور مچھلی پٹن ضلع کرشنا میں بنی۔ اور چند سال کے بعد ۱۶۳۳ء میں بالاسور (اڑیسہ) اور دوسرے غیر معروف مقام ہری ہر پور (اڑیسہ) میں بنیں۔

۱۶۵۱ء میں ایک کوٹھی ہُگلی (بنگال) میں بصِلۂ حسنِ خدماتِ طبی ڈاکٹر گیبریل ہوٹن کے بنی، جس نے صوبہ دارِ بنگال کے گھر میں بڑے معرکے کا علاج کیا تھا۔

چارناک نے جو ہُگلی کی کوٹھی کا صدر تھا، ۱۶۶۸ء میں کلکتہ میں ایک اور شاخ کھولنی چاہی لیکن نواب شائستہ خاں کی دشمنی کی وجہ سے وہاں سے اسے بھاگنا پڑا اور مدراس جا کر

اس نے پناہ لی۔ ۱۶۹۰ء میں اورنگ زیب سے فرمان حاصل کر کے ایک چھوٹی سی کوٹھی قائم کی گئی جو بڑھتے بڑھتے آج کلکتہ جیسا مشہور مقام ہو گیا جو برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا شہر ہے۔'' (ص ۱۰۵۔ حاشیۂ واقعاتِ دارالحکومت دہلی۔ حصہ اول)

اورنگ زیب کے عہد میں ۱۶۶۱ء میں چارلس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر ملا اور بمبئی پُرتگیزیوں کے حوالے کی گئی۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسوں نے باضابطہ ہندوستانی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ جارج چارناک نے ۱۶۹۰ء میں کلکتہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۰۲ء میں ''یونائیٹیڈ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی تشکیل ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مئی ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ احمد نگر میں بروز جمعہ بتاریخ ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۱۱۷ھ/ ۴/ مارچ ۱۷۰۷ء اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ خُلد آباد متصل دولت آباد ضلع اورنگ آباد دکن (موجودہ مہاراشٹر) میں تدفین ہوئی۔

محمد معظّم معروف بہ شاہِ عالم بہادر شاہ فرزند اورنگ زیب کے عہدِ حکومت از ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء و جہاں دار شاہ فرزندِ شاہ عالم بہادر شاہ کے عہدِ حکومت از ۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء کے بعد جہاں دار شاہ کے برادر زادہ فرّخ سیَر کے عہد ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء کا ایک اہم واقعہ اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے کہ:

۱۷۱۶ء میں بادشاہ بیمار ہوا۔ علاج کے لئے اِسکاٹ لینڈ کا ایک ڈاکٹر ہیملٹن گیبریل طلب کیا گیا جس کے علاج سے صحتِ کامل ہو گئی۔

بادشاہ نے اپنی صحت کی خوشی میں ڈاکٹر سے کہا کہ: مانگو کیا مانگتے ہو؟

ڈاکٹر نرا ڈاکٹر ہی نہ تھا بلکہ اپنی قوم کا فِدائی تھا۔ اس نے منفعتِ ذاتی پر قومی بہتری کو ترجیح دی اور عرض کیا کہ:

ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو محصول دَر لیا جاتا ہے اس کی معافی کا فرمانِ عطوفت نشان مَرحمت فرمایا جائے اور اس کے معاوضے میں کوئی سالانہ رقم یکمشت مقرّر رہو۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کمپنی کے حقوق تسلیم کر لیے جائیں۔ اس مراعات نے

کمپنی کے پاؤں جما دیے۔'' (ص ۶۲۷۔ واقعاتِ دارُ الحکومت دہلی۔ حصہ اول از مولوی بشیر الدین دہلوی۔ مطبوعہ اردو اکادمی دہلی۔ ۱۹۹۵ء)

شاہِ عالم بہادر شاہ کے پوتے محمد شاہ رنگیلے کی مدتِ حکومت اکتوبر ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء مغلیہ حکومت کی کمزوری و اَبتری و ذِلّت و رُسوائی سے بھرپور اور ایک عبرت ناک حکومت تھی۔ یہاں تک کہ ابوالمظفّر جلال الدین سلطان عالی گوہر معروف بہ شاہِ عالم ثانی (مدتِ حکومت ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) تک مغلیہ حکومت اتنی کمزور و ناتواں ہوگئی کہ بادشاہ بننے کے باوجود شاہِ عالم ثانی کو دس (۱۰) سال الہٰ آباد میں گذارنے پڑے اور چھبیس لاکھ سالانہ وظیفہ اسے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' سے ملنا شروع ہوا جس پر اسے قناعت کرنا پڑا۔ دس (۱۰) سال بعد شاہ عالم ثانی کو دِلّی آنا نصیب ہوا۔ ریاستوں نے جابجا بغاوت کر کے مغل شہنشاہیت کے ٹکڑے کر ڈالے اور ہندوستان کے ہر حصے میں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔

ایک طرف نادِر شاہ دُرّانی نے ۱۷۳۸ء میں دِلّی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تختِ طاؤس کے ساتھ کروڑوں روپے ہندوستان سے لے گیا۔ ہزاروں انسانوں کا قتلِ عام کیا اور ہزاروں مکانات تباہ کر دیے۔ دوسری طرف احمد شاہ اَبدالی ۱۷۴۸ء میں آدھمکا۔ پھر ۱۷۴۹ء میں بھی ہندوستان پر چڑھ دَوڑا۔

اس طرح دُرّانی اور اَبدالی نے مغل حکمرانوں کی قوت اور شوکت وحشمت کو خاک میں ملادیا۔

تیسری مرتبہ ۱۷۵۷ء میں پھر احمد شاہ اَبدالی نے دِلّی پر قبضہ کرلیا اور دو ماہ تک یہاں رہا۔ چوتھی بار ۱۷۵۹ء میں اَبدالی نے دِلّی کو تاراج کیا۔

اِنتشار و اَنارکی کے اِنھیں حالات میں جاٹ اور مَرہٹے کچھ دنوں بعد دہلی میں گھس آئے اور یہاں لوٹ مار کی انتہا کردی لیکن جب پھر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو جنوری ۱۷۶۱ء میں پانی پت (پنجاب۔موجودہ ہریانہ) کے میدان میں اس نے مَرہٹوں کو ڈھیر کر دیا اور ان کی طاقت وقوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

اس کے ساتھ انگریز اپنا تجارتی لبادہ اُتار کر فاتح اور حاکم بننے کے لئے کمر بستہ ہوگئے

اور جگہ جگہ اپنی عیّارانہ وشاطرانہ حکمتِ عملی کے تحت مداخلت و جارحیت کے راستے ڈھونڈنے لگے۔ دہلی کی طرف انگریزوں نے بعد میں رُخ کیا۔ وہ پہلے ریاستی وصوبائی مُورچوں کو فتح کرنے اور انھیں مضبوط کرنے میں ایک مدت تک لگے رہے۔

۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں جنگِ بکسر، ۱۷۷۴ء میں جنگِ روہیل کھنڈ، اس کے بعد حیدر علی سے کئی جنگیں لڑنے کے بعد آخر میں ۱۷۹۹ء میں اس کے شیر دِل بیٹے سلطان ٹیپو کو زیر کرتے ہی انگریزوں نے دہلی کی طرف قدم بڑھادِئے۔

سراجُ الہند شاہ عبدالعزیز مُحدّث دہلوی کی تاریخِ حیات کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء میں انگریزی فوجی جرنیل لارڈ لیک کی فوجیں جب دہلی پر قابض ہوگئیں اور شاہِ عالم ثانی کو انگریزوں نے ایک وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے الہ آباد میں مَحبُوس کر دیا تو چند سال بعد شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کے زیرِ اقتدار و حکومت مختلف ہندوستانی خِطوں کے دارُالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔ یہ فتویٰ ''فتاویٰ عزیزی'' مطبوعہ دہلی میں موجود و محفوظ ہے۔

آپ کے وصال (۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء) کی ساڑھے تین دہائی کے بعد جب قابض وغاصِب وظالم انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں دہلی ورُوہیل کھنڈ واَوَدھ میں اِنقلاب بَرپا ہوا اور خون ریز جنگِ آزادی لڑی گئی تو اس کی فِکری قیادت ''سلسلۂ ولی اللّٰھی عزیزی'' کے معروف عُلماے اہلِ سُنّت نے کی۔ جن میں اِن حضرات کا کردار نمایاں ہے:

(۱) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (۲) مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی تلامذۂ شاہ عبدالعزیز مُحدّث دہلوی۔

(۳) مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی تلمیذِ شاہ ابوسعید مجدّدی رام پوری تلمیذِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی و مفتی صدرُالدین آزردہؔ دہلوی (۴) مفتی عنایت احمد کاکوروی تلمیذِ شاہ محمد اسحٰق دہلوی تلمیذِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (۵) (الف) مولانا رحمتُ اللہ کیرانوی تلمیذِ مفتی سعدُ اللہ مرادآبادی تلمیذِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (ب) تلمیذِ شاہ عبدالغنی مجدّدی

دہلوی تلمیذِ شاہ محمد اسحٰق دہلوی تلمیذِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک اہم قائد مفتی مظہر کریم دریابادی (متوفی ۱۸۷۳ء) نامور اردو ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) اور ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے دادا تھے۔ اپنے دادا کے بارے میں ڈاکٹر ہاشم قدوائی (سرسید نگر، علی گڑھ) لکھتے ہیں کہ:

''مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا.........مفتی صاحب نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے گھر پر مجاہدینِ آزادی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں جنگی حکمتِ عملی تیار کی جاتی تھی۔

..........بدایوں، بریلی، رام پور، شاہجہاں پور اور دہلی کے علما سے بھی تعلقات تھے۔ مذہبی فتاویٰ کے سلسلے میں مولانا مفتی صدرالدین آزردہ شاہی مفتی دہلی، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولانا سعد اللہ رام پوری اور مولانا فضلِ رسول بدایونی کے نام بار بار ملتے ہیں''۔

مفتی مظہر کریم دریابادی ۱۸۲۹ء سے ۱۸۵۷ء تک بہ سلسلۂ ملازمت شاہجہاں پور میں مقیم رہے جب مجاہدین کو انگریزی فوجوں نے شکست دی اور اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو مجاہدین اور آزادی کے دوسرے لیڈروں کی طرح مفتی صاحب کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ (اس کے بعد کالا پانی بھیج دیا گیا اور ایک کتاب کے اردو ترجمہ کے انعام میں رہائی پاکر برسوں بعد اپنے وطن دریاباد، اَوَدھ (موجودہ ضلع بارہ بنکی، یوپی) واپس ہوئے)

''عقائد میں ہم مسلک علمائے بدایوں تھے۔ ''غایۃُ المَرَامِ فِی تحقیقِ المولودِ والقِیام'' کے نام سے ایک کتاب اپنے عزیز قریب کے نام سے محفلِ میلاد اور اس میں قیامِ تعظیمی کی حمایت اور جواز میں چھپوائی۔ مناقبِ غوثیہ یعنی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح اور توصیف میں ایک غیر مطبوعہ تصنیف چھوڑی۔ فارسی میں بھی متعدد فقہی مسائل سے متعلق ''مسائلِ مذھبیہ'' کے نام سے ایک تصنیف چھوڑی جو غیر مطبوعہ رہی۔''

(ص ۹۶ و ۹۷۔ ''انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر''۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ شمارہ اپریل رمئی ۲۰۰۷ء)

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی تلمیذِ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے جامع مسجد دہلی

میں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ دیا جو متعدد علما کے دستخط کے ساتھ جاری ہوا۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی تلمیذِ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء میں انھوں نے ممتاز قائدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء دلاور جنگ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کو اپنے مکتوب کے ساتھ آگرہ بھیجا جنھوں نے آگرہ میں ''مجلسِ علما'' قائم کرکے علما و فضلائے ہند کے درمیان انگریزوں کے خلاف جذبۂ حُرّیّت و آزادی کی روح پھونکی۔

مفتی عنایت احمد کاکوری تلمیذِ شاہ محمد اسحاق دہلوی تلمیذ و نواسۂ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے بریلی اور مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی تلمیذِ شاہ ابوسعید مجدّدی تلمیذِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے مرادآباد کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جہاد کے فتاویٰ جاری کیے۔

''سلسلۂ اسمٰعیلیہ'' (منسوب بہ شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی) سے وابستہ علمائے صادق پور، پٹنہ نیز دیگر حضرات نے مولانا غلام رسول مہرؔ و مولانا سید محمد میاں دیوبندی مؤلّف ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' اور ڈاکٹر قیام الدین احمد ممبر خانوادۂ صادق پور و مولانا مسعود عالم ندوی کی تحریر کے مطابق جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیں راقمِ سطور کی تین کتابیں۔ (۱) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی اور انقلاب ۱۸۵۷ء (۲) ممتاز علمائے انقلاب ۱۸۵۷ء۔ (۳) ۱۸۵۷ء پس منظر و پیش منظر۔ یہ تینوں کتابیں دارُالقلم، ذاکر نگر۔ نئی دہلی ۲۵ سے شائع ہوچکی ہیں۔

بالاکوٹ سے شاملی تک کے حقائق خود سلسلۂ اسمٰعیلیہ کے معروف علما و مؤرخین کے قلم سے نکلی ہوئی تحریروں کے مستند حوالہ جات کے ساتھ بالخصوص ثانی الذکر کتاب میں پیش کردیے گئے ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی صحیح تاریخ جاننے کے لئے اِن کتابوں کا مطالعہ صرف قارئین نہیں بلکہ مؤرخین کے لئے بھی ضروری ہے۔

چنانچہ ''تحریکِ بالاکوٹ'' اور ''مجاہدینِ بالاکوٹ'' کے سب سے اہم اور قدیم و مستند

سمجھے جانے والے محقق ومؤرخ مولانا غلام رسول مہر (متوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں:

''مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اس ہنگامے کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے غدر قرار دیا اوراہلِ ملک، آزادی کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس ہنگامے نے جابجا انگریزوں کے لئے سخت نازک حالات پیدا کردیے تھے۔

''مُجاہدین'' کے لئے اِقدامات کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ حالات نظر بہ ظاہر جتنے سازگار تھے، بعض ناگہانی حوادثِ ووقائع کے باعث اتنے ہی ناسازگار ہوگئے۔'' (ص ۲۹۲۔ سرگذشتِ مجاہدین۔ مؤلفہ غلام رسول مہر۔ مطبوعہ لاہور)

عُلمائے صادق پور (پٹنہ) کی جمعیت کے بارے میں مولانا سید محمد میاں دیوبندی لکھتے ہیں:

''یہ تنظیم، بحیثیت تنظیم تحریک (۱۸۵۷ء) سے الگ رہی۔ بلکہ اگر مولانا عبدالرحیم صاحب (صادق پوری) مصنف ''اَلدُّرُّ الْمَنْثور'' کا قول تسلیم کرلیا جائے تو یہ تنظیم ۱۸۵۷ء کی مخالف رہی۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے کچھ افراد نے انفرادی طور پر اس تحریک میں حصہ لیا۔'' (ص ۱۹۱۔ عُلمائے ہند کا شاندار ماضی۔ جلدِ چہارم۔ مؤلفہ سید محمد میاں دیوبندی۔ مطبوعہ دہلی)

خانوادۂ صادق پور (پٹنہ) کے ایک محقق فرد ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

''الغرض ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقعہ پر اوراس دوران میں برابر وہابی مُستعدی سے سرحد پر انگریزوں کے خلاف مصروفِ کاررہے۔ انھوں نے علیحدہ کام کیوں کیا؟ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں شامل کیوں نہ ہوئے؟ اس کے اسباب ایک علیحدہ موضوع ہے۔'' (ص ۲۱۴۔ ہندوستان میں وہابی تحریک۔ مؤلفہ ڈاکٹر قیام الدین احمد۔ مکتبہ التفہیم۔ مئوناتھ بھنجن۔ یوپی)

وابستگانِ سلسلۂ سید احمد رائے بریلوی وشاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے سیاسی کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مسعود عالم ندوی (یکے از اَحبابِ مولانا ابوالحسن علی ندوی) لکھتے ہیں:

..........''۱۸۵۷ء کا پُرآشوب حادثہ پیش آیا۔ گومُجاہدین اوران کے مُعاونین ایک

دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانب داررَہے۔'' الخ

(ص ۵۸۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

''عاجز یہ عرض کرتا ہے کہ مُجاہدین، جماعتی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ایک قومی جنگ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے سید (احمد رائے بریلوی) صاحب کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے۔''

(حاشیہ ص ۵۸۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مؤلفہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

۱۸۰۱ء میں اَودھ اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریز حاوی اور مسلّط ہوگئے لیکن اپنی حکمتِ عملی کے تحت اَودھ کی نوابی اور دہلی کی شاہی حکومت کو باقی و برقرار رکھا جن کی حیثیت وظیفہ خوار حکومت سے زیادہ نہ تھی۔ اور آخر میں ۱۸۵۶ء میں اَودھ اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کو تحلیل کر کے ۱۸۵۸ء میں پورا ہندوستان شاہِ انگلستان کے حوالے کردیا گیا اور مَلکہ الزبتھ کی براہِ راست حکومت سارے ہندوستان پر ہوگئی۔

اَودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے مع اہل وعیال کلکتہ اور دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے باقی ماندہ اہل وعیال کے ساتھ رنگون بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے حسرت و یاس کے ساتھ اپنی زندگی کے ایام پورے کیے۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں بہادر شاہ ظفر کا رنگون میں ہی انتقال ہوا۔

تقریباً ۱۹۲۵ء میں مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے The other side of the Medal یعنی ''تصویر کا دوسرا رُخ''۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شیخ حُسام الدین میونسپل کمشنر امرت سر، پنجاب نے تقریباً ۱۹۳۰ء میں کیا۔ اردو اکیڈمی لاہور کا دوسرا ایڈیشن فروری ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا جو اِس وقت راقمِ سطور کے پیش نظر ہے۔

"تصویر کا دوسرا رُخ" لکھ کر مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اس وقت یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی باہمی منافرت دور کی جائے تا کہ ان کے درمیان اعتماد کی ایک ایسی فضا اور ایسا ماحول بن جائے جس سے تحریکِ آزادی کے خطرات کا سَدِّ باب کیا جا سکے۔

زیرِ نظر حصے میں مذکورہ کتاب کے کچھ اقتباسات بلا تبصرہ نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ اقتباسات انگریزی مظالم اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں ہونے والے مظالم کی داستان اپنے آپ بیان کرتے چلے جائیں گے۔

مسٹر نِکلسن (Nicholson) اپنے ایک خط بنام مسٹر ایڈورڈز (Edwards) میں لکھتا ہے:

"دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رُو سے ہم ان کو زندہ ہی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اُتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔

ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسبِ ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔" Kaye, Book VI. ch.1 (ص ۶۱۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

ایک پادری کی بیوہ ہندوستانیوں کو دی جانے والی وحشت ناک اذیت سے لطف اندوزی کی تصویر اس طرح پیش کرتی ہے:

"لڑائی کے اِختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور یہ معلوم کرنے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔

چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے۔ جس کے ساتھ ہی ایک نا قابلِ بیان دھیمی مگر وحشتناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک

افسر نے ہمیں بتایا کہ:

یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارُود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اُڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔ اور اس کا سَر ایک راہ رو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آئی۔" (Mis Coop Land a lady's ascape from gewaliar.P.233) (ص ۵۸۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

آئرلینڈ کا ایک جرنلسٹ مسٹر ڈی لین (Delean) ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتا ہے:

"زندہ مسلمانوں کو سُور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سُور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور مُنتقمانہ حرکات کی دنیا کی، کوئی بھی تہذیب کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنُما دھبّہ ہیں۔ جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔

اس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزائیں دینے کا ہمیں مطلقاً کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔" (Russel, Diary, II, P.43 (May 1858) (ص ۶۹۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

ایک پادری کی بیوی نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے:

"جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو انھیں حکم دیا گیا کہ وہ "گرجا" کے فرش کو صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اس قسم کا کام اپنے مذہبی معتقدات کے خلاف سمجھتے تھے، پھر بھی سنگین کی نوک سے انھیں اس حقیر کام کے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض آدمیوں نے نہایت پھرتی سے اس کام کو سَر انجام دیا، محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں گے۔ لیکن بے سود۔ کیوں کہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔

(Alady's Escape from gawaliar, ''
P.243). (۷۴ـتصویر کا دوسرا رُخ)

جنرل نیل (Neill) نے کان پور میں مامور میجر ریناڈ (Renaud) کو یہ ہدایت دی:

''بعض دیہات کو ان کی مُجرِمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام مَرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔

قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہِ تیغ کر دیا جائے۔ کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔

باغیوں کے تمام سرغنوں بالخصوص فتح پور کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی دے دی جائے۔ اور ان کے سَر کاٹ کر وہاں کی بڑی عمارت پر لٹکا دیے جائیں۔'' Kaye, Book V chepter.ii۔(ص۷۵ـتصویر کا دوسرا رُخ)

''جب تقریباً ڈیڑھ سو باغیوں کو اس طرح گولیوں سے اُڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا۔ جو ہلاک کرنے والوں میں سے سب سے بوڑھا سپاہی تھا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا وقفہ دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد قتل کی کارروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا اور جب تعداد دوسو سینتیس (237) تک پہنچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ:

باقی باغی، بُرج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں کہ وہ چند گھنٹے عارضی طور پر پہلے سے بند کر دیے گئے تھے۔ اس پر بُرج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت ہی دردناک منظر دیکھنے میں آیا۔ جس سے ہالوں کے بلیک ہول Holwell's Black Hole کی تلخ یاد دوبارہ تازہ ہوگئی۔

یعنی پینتالیس انسانوں کی مُردہ لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت

اور دَم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔''(ص۹۰و۹۱ـتصویر کا دوسرا رخ)

محاصرہ میں لیے گئے ہندوستانیوں کی نگرانی پر مامورِ سِول کمِشنر مسٹر گریتھ (Greathed) لکھتا ہے:

''دو انگریزوں کے قتل کے عوض پانچ سو باغیوں کی جان لینا ایک ایسا خوفناک بدلہ ہے جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔''(ص۹۷ـتصویر کا دوسرا رُخ)

''ایک افسر جو، ریناڈ (Renaud) کے دستے کے ساتھ متعین تھا، بتلاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس کثرت کے ساتھ پھانسی پر لٹکایا گیا جو بیان سے باہر ہے۔

دو دن کے اندر بیالیس (42) آدمیوں کو سڑک کے کنارے پر پھانسی دی گئی اور بارہ (12) آدمیوں کو تو صرف اس جرم پر پھانسی کی سزا ملی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گذری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے؟ جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کیے وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔'' Russel, Dairy.P.221,222۔(ص۹۸ـتصویر کا دوسرا رُخ)

''ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضعِ آئین وقوانین نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کیے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سِول افسران نے خونیں عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا بلکہ بعض حالات میں تو بغیر نام نہاد عدالت کے حکم سے بھی پھانسیاں دی گئیں۔ جن میں مرد و عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔

بایں ہمہ خوں ریزی کی آگ دن بہ دن اور بھڑکتی گئی۔ چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔ نہ صرف سولی پر اِکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی

تکلیف کی گئی ہو۔

انگریزوں نے نہ صرف اس قسم کی خوفناک سزاؤں کا فخریہ اظہار کیا بلکہ خود اپنی یاد داشتوں میں ان دردناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ہم نے حتیٰ الامکان کسی ذی روح آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ یہاں تک کہ ان سیاہ فام انسانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے نظاروں سے اپنی خوں آشامی کی پیاس بجھا کر لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔" Kaye, Book v, Chepter.ii (ص۱۰۳ و ۱۰۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

"ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی کی سزا دی گئی کہ انھوں نے غالباً تفنُّنِ طبع کے طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھائے ہوئے بازاروں میں منادی کرادی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مُجرِموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن بے سود۔

اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں سے بھی گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔

پھانسیاں دینے کے لئے رضا کارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات میں دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے ساتھ پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے پوری واقفیت تھی۔

چنانچہ ان میں سے ایک "شریف آدمی" اپنی شاندار کامیابیوں کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔

یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رَسّہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جاں کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) ہندسے کی دل چسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔" Kaye, Book

v, Chepter.ii (۱۰۴ و ۱۰۵۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

"تمام جج صاحبان رحم کے اظہار کی پالیسی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ تمام ایسے ملزمین جو پیش کیے گئے تقریباً سب کے خلاف فردِ جرم لگادی گئی اور موت کی سزا کا حکم دے دیا گیا۔ شہر کے ایک بلند مقام پر جو ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی ہے، جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزانہ پھانسی دی جاتی ہے۔ جس کے قریب ہی انگریز افسران سگریٹوں کے کش پر کش اُڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں مَحو دکھائی دیتے ہیں۔" Holmes.P.386 (ص۔۱۰۸۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

"ہر ایسے ہندوستانی کو قطعِ نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اَودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہِ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی تکلُّف روا رکھا جاتا تھا۔ بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مُجرِم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کے لئے ایک رَسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔

اگر یہ اَشیا مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔" Majerdia P.195,196 (ص۔۱۱۱۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

"ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چہار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے، سنگینوں سے وہیں پر ختم کر دیے گئے۔ ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔

آپ اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ:

ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہو گئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عَفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے۔ جن کے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیوں کہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کر دیا۔" (ص۱۱۲۔ تصویر کا دوسرا رخ)

ٹائمز آف انڈیا کا ایک رپورٹر لکھتا ہے:

''میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیوں کہ کل ایک دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب ایک افسر بیس (20) سپاہی کو لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا اور راستے میں ہم نے چودہ (14) عورتوں کو لاشوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا۔ جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کر دیے تھے۔

چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ:

یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا

کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آ گئیں تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے۔ اسی لئے بحالتِ موجودہ اپنے ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب سمجھا گیا جس کے بعد انھوں نے خود بھی خودکشی کر لی۔ چنانچہ ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔'' **Times, Latters, Dated 19.11.57, Mantgumary Martin** (ص ۱۱۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''نادرِ شاہ کی تاریخی لوٹ اور قتلِ عام کے بعد جب کہ اس نے چاندنی چوک کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا۔ ایسا دردناک نظارہ آج سے پہلے شاہجہاں کے دارُالخلافہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔'' **Times, 16.11.57** (ص ۱۱۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''باغیوں کے جرائم کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد و عورت اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں او رویرانوں کی خاک چھاننی پڑی۔ اور جتنا مال و اسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے ان سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے۔ کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیا کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جن کو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔'' **Holems, P.386** (ص ۱۱۶۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''کئی دفعہ ایسی بے کس اور شریف عورتوں کے غول ماتمی قافلوں کی شکل میں دیکھنے میں آئے جن میں سے اکثر بے چاری، بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں۔ اور بعض کے ساتھ عمر رسیدہ مرد نظر آتے تھے جو چلتے ہوئے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتے تھے۔'' **Greathed, P.285. Letter Datted 18.9.57**۔ (ص ۱۱۶۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''ایک انگریز کا خون غصے اور انتقام سے کھولنے لگتا ہے جب وہ کسی ہندوستانی کے ہاتھوں کسی انگریز عورت کے قتل کا واقعہ سنتا ہے۔ لیکن ہندوستانی تاریخ یا افسانوں کو سن کر عام ہندوستانیوں کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی جب وہ ان بے شمار معصوم اور گمنام عورتوں، بچوں، اور مردوں کے بے دریغ قتل کے حالات پڑھتے یا سنتے ہوں گے جو انگریز کے بے پناہ انتقام کا نہایت سفّا کی سے شکار بنائے گئے تھے۔

یقیناً جس طرح ہم اپنے ہم قوم افراد کے مقتول ہونے سے چراغ پا ہو جاتے ہیں اسی طرح ہندوستانیوں کے دماغ بھی ایسے واقعات سننے کے بعد ضرور متاثر ہوتے ہوں گے۔'' **Kaye. Book V Chepter.ii** (ص ۱۱۹۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''بالخصوص جنرل نیل **(Neill)** کے حملہ کے وقت جس بے دردی سے قتلِ عام

کیا گیا اس کے درست تسلیم کرنے میں کوئی عُذر نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ الہ آباد میں تو بے انتہا انسانوں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔

چنانچہ جب جنرل نیل ان مظالم سے فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے ایک میجر کو کان پور روانہ کیا تو اس نے بھی راستے میں نہایت بے باکانہ طریقے سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حالاں کہ بظاہر ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

قتل و غارت کی آخری کمی خود جنرل نیل پوری کرتا ہے جب اس کے حکم سے بے گناہ انسانوں کو ایسی شدید تکالیف دے کر جان سے ہلاک کیا گیا کہ ان کے مقابلے میں ہم، ہندوستانی سنگ دلی اور بربریت کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں کر سکتے۔'' **Campbell, 1.P.280** (ص ۱۲۱۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتلِ عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔ حالاں کہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔''

(ص ۱۲۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی اس کتاب ''تصویر کا دوسرا رُخ'' کے بابِ دوم میں ''غدر کے اثرات'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''یہاں پر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے مسٹر کوپر **(Cooper)** کی کتاب سے بعض سنگین واقعات نقل کیے ہیں لیکن میں نے ان سے بھی زیادہ شدید اور رنج دِہ واقعات کو پھر بھی چھوڑ دیا ہے۔ غدر کے متعلق تقریباً تمام دستاویزیں زبانِ حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔''

۱۹۲۳ء میں غدر کے حالات پر دو کتابیں شایع ہوئیں۔ جن میں سے ایک کا نام ہے ''لارڈ رابرٹس کے خطوط'' **Latter of Lard Reberts**۔ اور دوسری کا نام ہے **Miss Sammerville's Wheel Treck**۔

ان ہر دو کتب میں ہماری زیادتیاں بالکل عُریاں حیثیت سے ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن دوسری کتاب میں تو مِس موصوفہ کے چچا جان کے وہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جو بے انتہا خوں ریزی کے مظہر ہیں۔'' (ص ۱۲۶۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''حالاں کہ میں نے جنرل نیل **(Neill)** کے ان کارناموں کو بالکل چھوڑ دیا ہے جو کان پور کے خونیں حاشہ سے بہ درجہا زیادہ سنگین تھے۔ نیز ہوڈسن **(Hadson)** کی مشہورِ زمانہ سنگ دلی کی کارروائی کو بھی میں نے نہیں چھیڑا۔ اگرچہ میرے پاس عینی شاہدوں کی دستاویزیں موجود تھیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بچے اور بوڑھے گھروں کے اندر موجود تھے۔

لیکن میں نے نہایت رحم دلی کی وجہ سے ان خوفناک واقعات کو اپنی اس کتاب سے علیحدہ رکھا۔'' (ص ۱۲۸ و ۱۲۹۔ تصویر کا دوسرا رُخ)

''یہاں پر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جتنے واقعات قلم بند کیے ہیں ان میں سے ایک بھی تو کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔

مزید برآں میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرہ ''وحشت و بربریت کی آماج گاہ'' یعنی اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا۔ اس لئے جو کچھ اس وقت انھوں نے کہا یا لکھا وہ ہمارے اسلاف کی طرح اب نابود ہو چکا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ ان تحریرات کو بھول جایا جائے۔

لیکن بدقسمتی سے یہ تلخ اور رنج دِہ واقعات خاموشی سے برداشت نہیں کیے جا سکتے اس لئے کہ ایک پوری قوم کے دماغ اس وقت تک ان کی یاد سے آتش زیر پا ہیں۔''

(ص ۱۲۹، ۱۳۰۔ تصویر کا دوسرا رخ)

رونگٹے کھڑے کر دینے والی انگریزی درندگی کی یہ داستانیں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میجر تھامسن **(Thamson)** نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

''دہلی کے مسلمانوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری حکومت کے خواہشمند تھے مگر ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون بہانے کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اَردلیوں اور پوربی گھسیاروں کو گولی سے اُڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔''

ایک انگریز کمانڈر لارڈ رابرٹس (**Lard Roberts**) دہلی کی ایک وحشتناک اور خوفناک منظر کشی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

''صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازوں سے نکل کر ہم چاندنی چوک سے گذرے۔ دہلی حقیقۃً شہرِ خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کی سُموں کی آواز کے سِوا کوئی آواز کسی سَمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گذری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مَراحل میں تھی۔

ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیرِ لب باتیں کر رہے تھے تا کہ انسانیت کی ان دردناک باقیات کی اِستراحت میں خلل نہ پڑے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دو چار ہوئیں وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔

کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو جھنجھوڑ رہا ہے۔ کہیں کوئی گِدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پَروں سے ذرا دُور چلا جاتا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اُڑ نہ سکتا تھا۔

اکثر حالتوں میں مَرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اُٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کر رہا ہو۔

دراصل یہ پورا منظر اس درجہ بھیانک تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔

معلوم ہوتا تھا کہ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لئے وہ بھی بِدک رہے

تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا نا قابلِ بیان حد تک بھیانک تھی جو بڑی مُضر بیماری اور بدبو سے لبریز تھی۔'' (متعدد کتبِ تاریخ۔ ص ۲۰۲،۲۰۳۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی! واقعات و حقائق مؤلفہ میاں محمد شفیع۔ اریب پبلیکیشنز، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء)

ایک انگریز فوجی افسر ہنری کوٹن (**Henry Cotton**) بیان کرتا ہے کہ:

''دہلی دروازہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے رَدِّ عمل اور اسے کچلنے کے لئے ہم نے ایک یا دو عالم دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً بائیس ہزار علما کو پھانسی دی گئی۔''

''مسلمان مجاہدین'' کے نام سے لکھی گئی اپنی کتاب میں ایک غیر مسلم مؤرخ لکھتا ہے:

''ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور درخت کے نیچے لے گئے۔ پھندا اُس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا۔ لاشیں پھندے میں جھول گئیں۔ آنکھیں اُبل پڑیں۔ زبان منہ سے باہر نکل آئی۔''

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) جب اپریل ۱۸۵۸ء میں مرادآباد کے صدرُ الصُّدور ہوئے اس وقت انھوں نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی ۱۸۵۸ء ہی میں آگرہ سے طباعت ہوئی۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند کے کل پانچ سو (۵۰۰) نسخے اردو میں چھپے تھے جن میں سے چند نسخے سرسید نے اپنے پاس رکھے۔ ایک نسخہ حکومتِ ہند کو بھیجا۔ باقی سارے نسخے حکومتِ برطانیہ کے نام لندن اِرسال کر دیا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی (متوفی ۱۹۱۴ء) نے رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند کو سرسید کی سوانح بنام ''حیاتِ جاوید'' میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا ہے۔ اس رسالہ کے کچھ اقتباسات

درج ذیل ہیں:

''۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ:

بہت سی باتیں ایک مدتِ دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سالِ گذشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔'' (ص ۸۰۷۔ حیاتِ جاوید۔ طبع پنجم ۲۰۰۴ء قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی)

''روس اور ایران کی سازش سے ہندوستان میں سرکشی کا خیال کرنا نہایت بے بنیاد بات ہے۔'' (ص ۸۰۷۔ حیاتِ جاوید)

''اَوَدھ کی ضبطی کو بھی ہم اس سرکشی کا سبب نہیں سمجھتے۔'' (ص ۸۰۸۔ حیاتِ جاوید)

''اس فساد کو یہ بھی خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس حسرت و افسوس کے باعث سے کہ ہندوستانیوں کے قدیم ملک پر غیر قوم قابض ہو گئی تھی، تمام قوم نے اتفاق کرا کر سرکشی کی۔'' (ص ۹۰۹۔ حیاتِ جاوید)

''تو اب ہرگز خیال میں بھی نہیں آتا کہ اب کا فساد مسلمانوں نے حکومت اور اپنی سلطنت کے جاتے رہنے کے رنج سے کیا ہو۔'' (ص۔۸۱۰۔ حیاتِ جاوید)

''دِلّی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا۔ اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں سے اس کی قدر و منزلت گرا دی تھی۔'' (ص ۸۱۰۔ حیاتِ جاوید)

''مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپس میں سازش اور مشورہ کرنا اس ارادے سے کہ ہم باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے لوگوں پر جہاد کریں اور ان کی حکومت سے آزاد ہو جائیں، نہایت بے بنیاد بات ہے۔ جب کہ مسلمان ہماری گورنمنٹ کے مستأمن تھے، کسی طرح حکومت کی عمل داری میں جہاد نہیں کر سکتے تھے۔

بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا وعظ کہا اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت انھوں نے صاف بیان کیا کہ:

ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگریزی کی امن میں رہتے ہیں، ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہزاروں جہادی ہر ایک ضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا اور غربی سرحدِ پنجاب پر جا کر لڑائی کی۔

اور جو ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا اگر ہم اس کو جہاد ہی فرض کریں تو بھی اس کی سازش اور صلاح قبل دسویں مئی ۱۸۵۷ء مطلق نہ تھی۔

غور کرنا چاہیے کہ اس زمانے میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا ایسے خراب اور بدرَوَیّہ اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔

بھلا یہ کیوں کر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے؟ اس ہنگامے میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔

سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا اس میں خیانت کرنا، ملازمین کو نمک حرامی کرنی، مذھب کی رُو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا، مذھب کے بموجب گناہِ عظیم تھا۔ پھر کیوں کر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا؟

ہاں! البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے اور جاہلوں کو بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمع کرنے کو جہاد کا نام دے لیا۔ پھر یہ بات بھی مُفسِدوں کی حرمزدگیوں میں سے ایک حرمزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔

دِلّی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے۔ مگر میں نے بتحقیق سنا ہے اور اس کے اِثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔

میں نے سنا ہے کہ جب فوج نمک حرام، میرٹھ سے دِلّی میں گئی تو کسی نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا۔

اگر چہ اس پہلے فتویٰ کی نقل میں نے دیکھی ہے مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو

میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائقِ اعتماد ہے؟

مگر جب بریلی کی فوج دِلّی پہنچی اور دوبارہ فتویٰ جاری ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے، بلاشبہ اصلی نہیں ہے۔

چھاپنے والے اس فتویٰ کے جو ایک مُفسِد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا، جاہلوں کے بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دیا تھا۔ بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبلِ غدر مر چکا تھا۔

مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوجِ باغی بریلی اور اس کے مُفسِد ہمراہیوں کے جَبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔

دِلّی میں بڑا گروہ مولویوں اور ان کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رُو سے مَعزول بادشاہِ دلّی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔

ان کا یہ عقیدہ تھا کہ:

دِلّی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اِہتمام ہے، ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔

چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔

اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملے میں موجود ہیں۔

پھر کبھی عقل قبول کر سکتی ہے کہ:

ان لوگوں نے جہاد کے درست ہونے میں اور بادشاہ کو سردار بنانے میں فتویٰ دیا ہو؟

(ص ۸۱۰ تا ۸۱۲۔ حیاتِ جاوید مؤلّفہ خواجہ الطاف حسین حالؔی۔ طبعِ پنجم ۲۰۰۴ء۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی)

''فوجِ باغی کا پہلے سے دِلّی کے مَعزول بادشاہ سے سازش کرنا محض بے اصل ہے۔ دِلّی کے بادشاہ کو کوئی شخص وَلی اور مقدس نہیں سمجھتا۔ اس کے مُنہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔'' (ص ۸۱۳۔ حیاتِ جاوید)

''بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیرممکن اور بے فائدہ محض تھی مگر لجیس لیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

بس یہی ایک بات ہے جو جَڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی اور باتیں جمع ہوتی گئیں۔ وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔'' (ص ۸۱۴۔ حیاتِ جاوید)

''یہ نقص جو ہماری گورنمنٹ میں تھا اس نے تمام ہندوستان کے حالات میں سَرایت کیا۔ اور جس قدر اسباب، سرکشی کے جمع ہوگئے گو وہ اسی ایک اَمر پر متفرّع ہیں مگر غور کر کے سب کو احاطہ میں لایا جائے تو پانچ اصول پر مبنی ہوتے ہیں:

اول: غلط فہمیِ رعایا۔ یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

دوم: بھاری ہونا ایسے آئین اور اصول اور طریقۂ حکومت کا، جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرّت رسانی کرتے تھے۔

سوم: ناواقف رہنا گورنمنٹ کا، رعایا کے اصلی حالات اور اَطوار و عادات اور ان مصائب سے جو اُن پر گذرتی تھیں۔ اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

چہارم: ترک ہونا اُن اُمور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لئے واجب تھا۔

پنجم: بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔

(ص ۸۱۶ و ۸۱۷۔ حیاتِ جاوید۔ طبعِ پنجم ۲۰۰۴ء۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی۔ مؤلّفہ خواجہ الطاف حسین حالؔی۔)

مذکورہ اِقتباسات ہم نے بلاتبصرہ نقل کیے ہیں جن سے کچھ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے ساتھ سرسید کے اپنے سیاسی خیالات بھی دو دو چار کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

سرسید کا یہ بیان ایک طرف جہاں بیانِ صفائی اور انگریز نوازی پر مشتمل ہے وہیں

دوسری طرف انقلاب ۱۸۵۷ء کے عَلَم بردار سبھی ہندوستانی عوام اور عُلما و قائدین کے بارے میں ان کا خیال اور ان کی رائے ان کی تحریر کردہ ایک ایک سطر، ایک ایک جملہ، بلکہ اُن کے دل کی ایک ایک دھڑکن سے صاف عیاں ہے۔

بغاوت وغدر یعنی انقلاب ۱۸۵۷ء کی پانچ بنیادوں میں سے پہلی بنیاد سرسید کی نظر میں غلط فہمیِ رعایا ہے۔ جس کی تفصیل میں سرسید لکھتے ہیں:

''اس مقام پر جتنی باتیں ہم بیان کرتے ہیں ان سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ:

درحقیقت ہماری گورنمنٹ میں یہ باتیں تھیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ لوگوں نے یوں غلط سمجھا اور سرکشی کا سبب ہوگیا۔ اگر ہندوستانی آدمی بھی لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت رکھتے تو یہ غلط فہمی واقع نہ ہوتی۔'' (ص ۸۱۷۔ حیاتِ جاوید)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''مداخلتِ مذہبی، کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل اور قابل اور اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ:

ہماری گورنمنٹ کا دِلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے۔ اور سب کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے۔ اور سب سے بڑا سبب اس سرکشی میں یہی ہے۔'' (ص ۸۱۷۔ حیاتِ جاوید)

''ہماری گورنمنٹ کہ ابتدائی حکومتِ ہندوستان میں گفتگو مذھب کی بہت کم تھی، روز بروز زیادہ ہوتی گئی اور اس زمانہ میں بدرجۂ کمال پہنچ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری گورنمنٹ کو ان اُمور میں کچھ دخل نہیں مگر ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب معاملے بموجب حکم اور بموجب اشارہ اور مرضیِ گورنمنٹ ہوتے ہیں۔

سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرّر کیا ہے۔ گورنمنٹ سے پادری تنخواہ پاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور حُکّام انگریزی ولایت جو اِس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں۔ اور ہر طرح ان کے مددگار اور مُعاوِن ہیں۔

اکثر حُکّام متعہد اور افسرانِ فوج نے اپنے تابعین سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی۔ بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو۔ اور ایسا ہی ہوتا تھا۔

غرضیکہ اس بات نے ایسی ترقی کی کہ:

کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔'' (ص ۸۱۸۔ حیاتِ جاوید)

''پادری صاحب وعظ میں صرف انجیلِ مقدس ہی کے بیان پر اِکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دِلی تکلیف پہنچتی تھی۔ اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دِلوں میں بویا جاتا تھا۔

مِشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں۔

بعض اَضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حُکّام متعہد اِن اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو ان میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

امتحان، مذہبی کتابوں میں لیا جاتا تھا اور طالب علموں سے جو کم عمر لڑکے ہوتے تھے، پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ اور وہ عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے۔ اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔

ان سب باتوں سے رعایا کا دل ہماری گورنمنٹ سے پھر جاتا تھا۔'' (ص ۸۱۹۔ حیاتِ جاوید)

''دیہاتی مکتبوں کے مقرّر رہونے سے سب لوگ یقین سے سمجھتے تھے کہ:

صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں۔

پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر جو ہر گاؤں اور قصبہ میں لوگوں کو نصیحت کرتے پھرتے تھے کہ

لڑکوں کو مکتبوں میں داخل کرو۔ ہر ہر گانو میں کالا پادری ان کا نام تھا۔ جس گانو میں پرگنہ وزیٹر یا ڈپٹی انسپکٹر پہنچا اور گنواروں نے آپس میں چرچا کیا کہ: کالا پادری آیا۔'' (ص ۸۱۹ حیاتِ جاوید)

''دفعۃً پیش گاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ:

جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا۔'' (ص ۸۲۱ حیاتِ جاوید)

''یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں ہو رہی تھیں کہ دفعۃً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارُالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز لوگوں کے پاس چٹھیات بھیجیں جن کا مطلب یہ تھا کہ:

اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی ہے۔ ریلوے سڑک سے سب جگہ آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے، اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔

سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پانو تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ:

ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔

سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ: یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔'' (۸۲۱ و ۸۲۲۔ حیاتِ جاوید)

''ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ:

ہندو اپنے مذہب کے اَحکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے تھے، نہ بطور احکام مذہب

کے۔ ان کو اپنے مذہب کے اَحکام اور عقائد اور وہ دِلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے، مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سُست اور بجز ان رسمی باتوں کے، اور کھانے پینے کے پرہیز کے، اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصّب نہیں۔ ان کے سامنے ان سے اس عقیدے کے جس کا دل میں اِعتقاد چاہیے برخلاف باتیں ہُوا کریں، ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔

برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مذہب کے عقائد کے بموجب جو باتیں کہ ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں، بخوبی جانتے ہیں اور ان کے احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصّب ہیں۔

ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں ان کا شریک ہونا قرینِ قیاس تھا۔ چنانچہ یہی ہوا۔'' (ص ۸۲۲ و ۸۲۳۔ حیاتِ جاوید۔ مؤلّفہ خواجہ الطاف حسین حالی۔ طبعِ پنجم ۲۰۰۰ء۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے چھوٹے بڑے بہت سے اسباب و وجوہ ہیں جن میں سے کچھ سرسید نے بیان کر دیے ہیں۔ یہ انقلاب اپنے مقصد میں ناکام کیوں ہُوا اور اس وقت کے انقلابیوں کی کوشش کامیاب کیوں نہ ہو سکی؟ یہ بھی ایک اہم سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش مندرجہ ذیل تحریر میں کی گئی ہے:

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی، انقلاب ۱۸۵۷ء کے موضوع پر لکھی گئی کتاب The other sid of the Medal کے اردو ترجمہ بنام ''تصویر کا دوسرا رُخ'' از شیخ حُسام الدین میونسپل کمشنر امرت سر، پنجاب مطبوعہ اردو اکیڈمی لاہور۔ طبعِ دوم فروری ۱۹۴۷ء کے دیباچہ میں عبدالرحیم خاں پوپلزئی، پشاور لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان چیزوں کو بھی واضح کردوں جن کو

عام طور پر ناکامی کے اسباب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن کی روشنی میں غور وخوض کر لینے کے بعد اصل بھید کا سُراغ لگ سکے۔ کیوں کہ بعض دفعہ آثار وقرائن کے ذیل میں قطعی دلائل کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

بہرحال! تحقیقی ذمہ داری سے قطعِ نظر کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے اسباب حسب ذیل ہیں:

(۱) ہندوستانی ریاستوں نے ہندوستانیوں کا ساتھ نہیں دیا۔
(۲) جنگی رَقبوں کی عام سِول آبادی نے اس میں حصہ نہیں لیا۔
(۳) انگریزوں کے خلاف عام طبقہ میں کوئی پروپگینڈا نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی عام سطح پر جنگِ آزادی کی کوئی تحریک تھی۔
(۴) جدید اسلحہ اور سامانِ جنگ سے ہندوستانی مسلَّح نہیں تھے۔
(۵) ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے ملک کی دولت پر قبضہ کر کے اس کو کنگال کر دیا تھا۔
(۶) جنگجو ہندوستانیوں کی جماعت میں ایسے بااثر لوگ بھی موجود تھے جو اپنی اَغراض کے ماتحت انگریزوں کے ساتھ در پردہ ساز باز کر چکے تھے۔
(۷) ہندوستان کی بَری و بَحری حدود میں امن تھا اور انگریز مکمل طور پر وہاں قابض تھے۔ صرف پشاور میں دوسو (۲۰۰) فوجیوں کو بغاوت کے الزام میں سخت سزائیں دی گئی تھیں لیکن اس سے عام سِول آدمی میں کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہوا تھا۔
(۸) عام لوگ اس وقت شخصی حکومتوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اور ان کے سامنے اس قسم کا کوئی ایسا پروگرام نہیں رکھا گیا تھا جس کی رو سے یہ اطمینان ہوتا کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لینے کے بعد کوئی ایسی حکومت قائم کی جائے گی جو ہندوستان کے مشترکہ مفاد کی محافظت اور عام طبقہ کی صحیح نمائندگی کر سکے گی۔
(۹) ملک کے اندر پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے خطرناک ریشہ دوانیاں

کام کر رہی تھیں۔ اس وجہ سے ہندوستانیوں میں فرقہ وارانہ حقوق و مفادات اور فوجی جھگڑوں نے افسوسناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔
(۱۰) ذرائعِ نقل وحرکت اور سلسلۂ خبر رسانی پر انگریزوں کا کامل قبضہ تھا اور اس کے ساتھ پریس پر بھی پورا اِقتدار تھا۔
(۱۱) اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اکیس (۲۱) چھاؤنیاں جنگ کی نذر ہو چکی تھیں مگر وہ اس قدر بکھری ہوئی تھیں کہ ان میں مطلقاً کسی قسم کی باہم شیرازہ بندی نہیں تھی۔ دوسرے سِوائے میرٹھ کے کہیں بھی ہندوستانی معقول تعداد میں شریک نہیں تھے۔ اور اگر کہیں تھے بھی تو ان کا مرکزوں کے ساتھ کوئی اِتصال نہیں تھا۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے مراکز محفوظ اور مربوط تھے۔
(۱۲) ہندوستان میں تازہ دَم انگریزی فوج انگلستان سے اس وقت پہنچ چکی تھی جب کہ ہندوستانی فوج کے سربرآوردہ اور مُحرِّک قائدین جنگ میں کام آ چکے تھے۔
(۱۳) دُوَلِ خارجہ کے سامنے ہندوستان کی مظلومیت اور جنگ کے حقیقی اَغراض کا کوئی خاکہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برخلاف غلط پروپیگنڈے کے ذریعہ سے بغاوت اور سرکشی کا الزام ذہن نشین کرایا گیا تھا۔
(۱۴) نئے نظامِ حکومت قائم کرنے اور ہندوستانیوں کے ملکی و مذہبی مفاد کی حفاظت کرنے کے متعلق حکومت نے خوشنما وعدوں سے عوام کو لٹّو بنا دیا تھا۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر ناظرین حق رکھتے ہیں کہ وہ اس کی ہر ایک دفعہ کو تاریخی معیار سے پرکھیں۔ کیوں کہ میں نے ان کو مدّعیانہ حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ عام خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض چیزیں تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں لیکن واقعیت کے امکان سے خالی نہیں ہیں۔'' (ص ۲۲ تا ۲۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ۔ مقدمہ بقلم عبدالرحیم خاں۔ اردو اکاڈمی لاہور، طبعِ دوم ۱۹۴۷ء)

مذہب، تعلیم، تجارت، صنعت، زراعت، تہذیب، تمدن، و دیگر شعبہائے حیات اور

ہندوستانی معیشت کے وسائل و ذرائع کو ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے کس طرح اپنی گرفت میں لیا اور کس طرح ہندوستانیوں ہی کے ذریعہ ہندوستانی ریاستوں اور دارُالسلطنت دہلی کو بے دست و پا کیا، پھر ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا نقاب اتار کر حکومتِ برطانیہ براہِ راست پورے ہندوستان پر قابض و مسلّط ہوگئی اس کی خونچکاں داستان سے تاریخ ہند کے صفحات رنگین ہیں۔ جنہیں پڑھ کر آج بھی ہندوستانیوں کا لہو گرم ہوجاتا ہے اور ظالم انگریزوں کے وحشیانہ کردار کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات اُمنڈنے لگتے ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی قیادت اس دور کے مشاہیر عُلما و مشائخ کرام نے صرف فتوائے جہاد نہیں بلکہ اپنی منصوبہ بندی اور عملی کوششوں کے ذریعہ کی تھی۔ بہادر شاہ ظفر و جنرل بخت خاں و خان بہادر خاں روہیلہ و شہزادہ فیروز شاہ اور نواب مجّو خاں مرادآبادی وغیرہ نے جو کچھ عسکری اِقدامات کیے ان کے پیچھے جن عُلمائے کرام کا ہاتھ تھا ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

مفتی صدرُالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضلِ حق خیرآبادی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، منشی رسول بخش کاکوروی، غلام امام شہید، امیر مینائی، مفتی مظہر کریم دریابادی، منیرؔ شکوہ آبادی وغیرہم۔

انقلاب ۱۸۵۷ء میں اہم کردار ادا کرنے والے عُلما و قائدین کے اپنے جذبات و خیالات کے علاوہ ماضی کے جن مشاہیر عُلما و مشائخ کرام کی ہدایات و ملفوظات و مکتوبات وغیرہ کے ذریعہ ان حضرات کی ذہن سازی ہوئی اور انھیں فکری و نظریاتی غذا اور تحریک ملی ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام خصوصیت سے نمایاں اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (متولّد ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء۔ متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)
(۲) حضرت مرزا مظہر جان جاناں نقشبندی مجدّدی دہلوی (متولد ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء۔ متوفی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء)

(۳) حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (متولّد ۱۱۵۹ھ/اکتوبر ۱۷۴۶ء۔ متوفی ۱۲۳۹ھ/۲۴-۱۸۲۳ء)
(۴) حضرت قاضی ثناءاللہ مجدّدی پانی پتی (متولد ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء۔ متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)
(۵) حضرت شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی (متولد ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء۔ متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء)
(۶) حضرت مفتی محمد عوض عثمانی بدایونی ثمّ بریلوی (متوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء)
(۷) حضرت مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۵/شعبان ۱۲۶۸ھ/مئی ۱۸۵۲ء)

یہاں دو نکتے مُعزّز قارئین خصوصی طور پر پیشِ نظر رکھیں جن کا تعلق گذشتہ حقائق سے ہی نہیں بلکہ موجودہ حالات سے بھی ہے اور انہیں اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہر باشعور ہندوستانی بہت سی اُلجھائی ہوئی گتھیوں کو خود بخود سلجھا سکتا ہے:

(۱) انقلاب کی کمان حقیقی طور پر عُلما کے ہاتھوں میں تھی اور یہ عُلما اپنے وطن اور مسلم جذبات و خیالات دونوں کی بیک وقت نمائندگی کر رہے تھے۔ اس لئے انقلاب کی ناکامی کے بعد سب سے زیادہ یہی عُلما انگریز مظالم کا شکار ہوئے اور انہیں ہر طرح مَصلوب ومَجروح ومَطعون کیا گیا۔ اور ان کے خلاف مسلسل دار و گیر اور سزا و اِیذا کی مُہم چلائی گئی۔

ٹھیک یہی رَوَیّہ عہدِ حاضر میں بھی عُلما اور ان کی تربیت گاہ ''مدارسِ اسلامیہ'' کے خلاف اپنایا جارہا ہے اور مسلم مخالف عناصر ہر قدم پر انہیں ہی نشانۂ تنقید و ملامت اور ہر ممکن طریقے سے ان کے خلاف ماحول بنانے کی سازش و کوشش میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔

(۲) انگریزوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ طے کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اگر باہم مُتصادِم رکھا جائے تو ہمارے اِقتدار کی بنیاد مستحکم اور مدتِ اِقتدار دراز ہو سکتی ہے۔ اسی ذہنیت کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کی نئی تاریخ لکھی جس میں اسلام اور مسلمانوں کا چہرہ مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کو ظالم و جابر اور متعصب و مندر شکن حکمراں کی شکل میں پیش کیا گیا۔

انھوں نے اپنے مذموم و مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے دو بنیادی قدم اٹھائے:

(۱) سب سے پہلے انھوں نے ہندوؤں کے درمیان یہ بات مشہور کی کہ سومنات مندر

مُنہدم کر کے محمود غزنوی اس کا جو دروازہ اپنے ساتھ افغانستان لے گیا تھا اُسے انگریز واپس لاکر پھر سومنات کی زینت بنائیں گے۔ چنانچہ زہریلی تشہیر کے ساتھ ۱۸۴۲ء میں ایک دروازہ لایا بھی گیا۔ اگرچہ بعد میں اس کی قلعی اتر گئی اور تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ یہ دروازہ صدیوں بعد خود انگریزوں نے ہی بنوا کر اُسے اصل شکل میں پیش کرنے کی حرکت کی تھی۔

(۲) دوسری حرکت انگریزوں نے یہ کی کہ اپنی بے بنیاد اور خود ساختہ تاریخ کے ذریعہ مشہور کیا کہ اجودھیا کی رام جنم بھومی توڑ کر مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے اس کی جگہ ایک عالیشان مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ جب کہ آج تک کسی قدیم مذہبی و تاریخی کتاب سے اس پروپیگنڈے کی ذرا بھی تصدیق نہیں ہوسکی۔

قارئینِ کرام اگر اکتوبر ۱۹۹۰ء کی وہ تاریخ یاد کریں جب سومناتھ سے اجودھیا تک کی رَتھ یاترا نکالی گئی اور پورے ملک کا ماحول گرم کر کے ہندو مسلم منافرت اور جنگ و جدال کا ماحول پیدا کیا گیا تو انھیں سب کچھ خود بخود سمجھ میں آجائے گا اور انہیں اس نتیجے تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ انگریزوں کے پرانے فارمولہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پر کس طرح عمل کیا جارہا ہے اور کس طرح پورے ملک کو زوال و اِنحطاط اور رُسوائی و بدنامی کی راہ پر لگایا جارہا ہے۔

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے زمانۂ تدریس (از ۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۲ء) میں ایک موقعہ پر انقلاب ۱۸۵۷ء کی تاریخ کا جب میں مطالعہ کر رہا تھا تو قدم قدم پر مجھے اس کا اِحساس ہوا کہ کچھ مخصوص انداز اور محدود نقطۂ نظر سے بہت سے اردو مؤرخین نے تاریخ نگاری کی ہے اور بعض عُلَما کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اِفراط و تفریط اور اکثر مواقع پر جانب داری بلکہ توہین و تحقیر اور کردار کُشی کا پہلو صاف طور پر نمایاں ہوجاتا ہے۔

اس احساس کا اظہار میں نے تین قسطوں میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون بعنوان ''کچھ اپنی باتیں'' میں کیا تھا جو ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی کے غالبًا ۱۹۷۷ء کے شماروں میں اور بعد میں ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء میں المجمع الاسلامی مبارک پور کی جانب

سے ''پیغامِ عمل'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۲ء میں بھی دارُالقلم دہلی کی جانب سے اس کی اِشاعت ہوئی جس کا یہ حصہ آج بھی ایک مہمیز کا کام دے رہا ہے:

''سیاسی محاذ پر علمائے اہلِ سنّت ہی نے جنگِ آزادی کی روح پھونکی تھی جس کی شہادت تاریخِ ہند کے بھولے بسرے اوراق دیتے ہیں۔

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، مفتی انعام اللہ گوپامئوی قاضیِ دہلی و سرکاری وکیل الٰہ آباد، قاضی فیض اللہ کشمیری دہلوی وغیرہم کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی باگ ڈور تھی۔

مولانا غلام امام شہید، مفتی عبدالوہاب گوپامئوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی، مفتی مظہر کریم دریابادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، منشی رسول بخش کاکوروی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرھُم کی زرّیں خدمات ہمارے لئے آج بھی سرمایۂ اِفتخار ہیں۔

سید احمد اللہ شاہ مدراسی، جنرل بخت خاں، خان بہادر خاں روہیلہ، جنرل عظیم اللہ خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم کی حَربی صلاحیتوں کا اعتراف خود انگریزوں کو بھی تھا اور ان کے تصوُّر ہی سے ان کے ماتھے پر پسینہ آجاتا تھا۔

مجاہدِ اعظم مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی آزادیِ وطن کی راہ میں ۱۸۵۸ء میں گرفتار ہوئے اور مرادآباد جیل سے متصل انہیں ۶ رمئی کو برسرِ عام پھانسی دی گئی۔ آپ کی زبان اس قت بھی عشقِ رسول میں یوں نغمہ سرا تھی:

کوئی گل باقی رہے گا نَے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دَم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہو جائیں گے کاؔفی ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

ان تاریخی حقائق کو آخر کب تک جھٹلایا جاتا رہے گا؟ اِن شاءَ اللّٰہ ان مظلوموں کا لہو خود پکار اُٹھے گا اور خونِ شہیداں کی سرخی رنگ لا کر رہے گی:

آکے گِرا تھا ایک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

(ص ۳۰ و ۳۱۔ پیغامِ عمل۔ طبعِ ثانی دارالقلم، دہلی ۲۰۰۲ء)

ذیل میں ان تین نمبروں کے اندر موجود اور درج شدہ معلومات و معاملات کا گہری نظر سے مطالعہ و تجزیہ کر لیں تو آپ کو بہت کچھ از خود سمجھ میں آجائے گا۔

یہ محض اشارے ہیں۔ تفصیلی حقائق راقمِ سطور کی کتاب ''۱۸۵۷ء! پس منظر و پیش منظر'' اور ''ممتاز عُلمائے انقلاب ۱۸۵۷ء'' میں ملاحظہ کریں۔

(۱) جناب وقارُالحسن صدیقی سابق ڈائرکٹر آرکالوجیکل سروے آف انڈیا و موجودہ او ایس ڈی، رضا لائبریری رام پور (یوپی، انڈیا) لکھتے ہیں:

''مولانا فصلِ حق خیرآبادی کے بارے میں یہ غلط مشہور ہو گیا ہے کہ وہ کسی دوسرے فصلِ حق سے اِلتباس اِسی کی بنا پر گرفتار کر لیے گئے تھے۔

اُس وقت کی خفیہ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کا آغاز ہوا تو مولانا فصلِ حق ریاستِ الور میں تھے۔ وہ اپنی ملازمت سے اِستعفا دے کر ۱۸؍اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی آگئے اور یہاں مجاہدین کی باقاعدہ رہنمائی کر رہے تھے۔

انگریزوں کے مُخبر تراب علی کی رپورٹ مورخہ ۲۴؍اگست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعہ کی

جنگی مشاورتی کونسل کے ممبر بھی بن گئے تھے۔

انگریزوں کے جاسوس گوری شنکر نے ۲۸؍اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا تھا:

''مولوی فصلِ حق جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔

وہ کہتا پھرتا ہے کہ:

اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے۔ جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔

آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا، شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا۔''

(Indian Office London, Mutiny Collection No.17o, PP.442-443)

اسی طرح مفتی صدرُالدین آزردؔہ دہلوی کے بارے میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ:

ان کی جاں بخشی اس سبب سے ہوئی کہ فتوائے جہاد پر انھوں نے "کتبتُ بِالحر" لکھا تھا اور اس پر نقطے نہیں لگائے تھے۔ جب انگریزوں نے ان سے باز پرس کی تو اپنی صفائی میں کہا کہ میں نے فتویٰ پر کتبتُ بِالجَبر (دباؤ میں لکھا) لکھ دیا تھا۔

یہ بھی محض مَن گھڑت کہانی ہے۔ وہ فتویٰ شائع بھی ہوا تھا اور ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں ہونے والی ایک نمائش میں بھی رکھا گیا تھا۔ اس پر کہیں یہ الفاظ لکھے ہوئے نہیں تھے۔'' (ص ۱۴ و ۱۵۔ پیشِ لفظ ''تاریخِ جنگِ آزادیِ ہند اٹھارہ سوستاون'' مؤلّفہ سید خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مطبوعہ رضا لائبریری رام پور، یوپی)

(۲) صوبہ سرحد روپے بھیجنے کی پاداش میں قائم مقدمۂ انبالہ (پنجاب) میں مولوی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) وغیرہ کو ۱۸۶۴ء میں کالا پانی کی سزا ہوئی اور تقریباً بیس

(۲۰) سال وہاں رہ کر تھانیسری صاحب نے بعدِ رہائی بنام تواریخ عجیب (کالا پانی) اپنے حالات لکھے تھے۔

اسی سلسلے میں ''تاریخِ عجیب'' کے عنوان سے رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

''یہ ایک مجاہدِ جلیل کی خودنوشت سوانحِ حیات ہے۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، حضرت سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کے باقیاتُ الصالحات میں سے تھے۔

...... کتاب بڑی دل چسپ ہے اور بڑے لرزہ خیز اَحوال وحَوادِث پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے۔

مولانا تھانیسری نے سب کچھ لکھا ہے لیکن رُفقائے زِندان کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے۔ حالاں کہ اس دور میں چوٹی کے مسلمان ان کے ساتھ ''کالا پانی'' میں اِبتلا کی زندگی بڑے اِستقلال اور وقار کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

حق بات یہ ہے کہ مولانا پر ''اَنا'' اور ''تحریکِ وہابیت'' کا جوش اِس قدر نمایاں اور غالب تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سِوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اگر انھوں نے ''کالا پانی'' کے دوسرے بلند مرتبت اور اعلیٰ مقام اسیروں کا ذکر کیا ہوتا تو اس کتاب کی اہمیت اور افادیت بہت زیادہ ہوتی۔'' (ص۳۶۰۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ مؤلّفہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ کتاب منزل لاہور)

(۳) معروف مؤرّخ پی سی جوشی ایک عجیب وغریب تاریخ اِس طرح لکھتے ہیں:

''یہ کہنا بجا ہوگا کہ فضلِ حق خیر آبادی ۱۸۵۷ء کے مسلمانوں کی روح تھے۔ اگرچہ اصطلاحاً وہ خود وہابی نہ تھے بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالف تھے پھر بھی انھوں نے اِستقلال کے ساتھ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔''

(ص۱۰۵۔ انقلابِ ۱۸۵۷ء۔ مؤلّفہ پی سی جوشی۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی۔ طبعِ سوم ۱۹۹۸ء)

''اہلِ حدیث کے بلند پایہ مسلمان عالم، علاّمہ فضلِ حق خیر آبادی کے بیان کا حوالہ

دینا مفید ہوگا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں رہنما کا پارٹ ادا کیا اور عمر قید کی سزا پائی۔'' (ص۱۵۷۔ انقلاب ۱۸۵۷ء۔ مؤلّفہ پی سی جوشی)

تقریباً ۱۹۸۰ء میں دِلّی سے دو کتابیں (آثارِ رحمت مؤلّفہ مولانا امداد صابری دہلوی اور مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی مؤلّفہ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی) منگا کر میں نے مطالعہ کیا۔ پھر باغیِ ہندوستان مؤلّفہ عبدالشاہد شیروانی طبعِ دوم لاہور ۱۹۷۴ء مطالعہ میں آئی۔ مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء نے مع مقدمۂ مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار اسے شائع کیا تھا۔

''باغی ہندوستان'' میں مجھے جگہ جگہ حذف واضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے بعد میں نے تقریباً ۱۹۸۰ء ہی میں مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے خط وکتابت کی اور کئی چیزوں کی طرف توجہ دِلا کر اُن سے گذارش کی کہ اس کتاب پر نظرِ ثانی فرمائیں اور مزید تحقیقی مَواد شامل کر کے اسے مکمل اور جامع کتاب بنا دیں تو اس کی کتابت وطباعت کا انتظام ہو سکتا ہے۔

چنانچہ مولانا شیروانی نے مثبت جواب دیا اور پھر المجمع الاسلامی مبارک پور کی طرف سے ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں نئی کتابت کے ساتھ ''باغی ہندوستان'' کی اشاعت ہوئی۔ مولانا شیروانی کے کئی خطوط اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں جو انھوں نے اس سلسلے میں مجھے لکھے تھے۔

''باغی ہندوستان'' کے مقدمۂ طبعِ چہارم میں مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی (متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) لکھتے ہیں:

''میں بہ صمیمِ قلب محترم مولانا محمد یٰسٓ اختر رکنِ المجمع الاسلامی مبارکپور (اعظم گڑھ) کا شکر گذار ہوں کہ موصوف کے پیہم اِصرار اور مسلسل تقاضوں نے نظرِ ثانی کا کام انجام دلایا اور چوتھے ایڈیشن کی اِشاعت کا سروسامان کیا۔'' (ص۱۴۔ باغی ہندوستان مؤلّفہ عبدالشاہد شیروانی۔ طبعِ چہارم ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔ المجمع الاسلامی مبارک پور، اعظم گڑھ۔ یوپی)

۱۹۹۷ء میں اپنی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں جب بمبئی میں میرا قیام تھا تو ملک بھر میں آزادی کا پچاسواں جشن (از ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء) منایا جا رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں

رضا اکیڈمی بمبئی کو متوجہ کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ حج ہاؤس بمبئی میں ایک شاندار جشن کا رضا اکیڈمی نے اِنعقاد کیا جس کی اردو اخبارات میں نمایاں رپورٹنگ بھی ہوئی۔ قیامِ بمبئی کے دوران ہی بعض شخصیات پر میں نے اجمالاً روشنی ڈالتے ہوئے کچھ املا کرادیا جسے ’’قائدین تحریکِ آزادی‘‘ کے نام سے اردو اور ہندی میں دو دو ہزار چھپوا کر اسی موقعہ پر رضا اکیڈمی بمبئی نے مفت تقسیم کیا تھا۔

اڑتالیس (۴۸) صفحات پر مشتمل ’’قائدین تحریکِ آزادی‘‘ (مطبوعہ ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ ماہ اگست ۱۹۹۷ء۔ رضا اکیڈمی بمبئی) میں مندرجہ ذیل حضرات کا اِجمالی تعارف تھا:

حافظ رحمت خاں روہیلہ، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی، علامہ فضلِ حق خیرآبادی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا امام بخش صہبائی دہلوی، مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی، مولانا رضا علی خاں بریلوی۔

☆☆☆☆

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں عُلمائے اہلِ سُنَّت کی قیادت

اہلِ سُنَّت کی مرکزی درسگاہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، (یوپی، انڈیا) کی جماعتِ سابعہ کے طلبہ ہر سال یوم مفتیِ اعظمِ ہند (حضرت مولانا الشاہ مصطفیٰ رضا قادری برکاتی نوری بریلوی متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) کے موقعہ پر ملک کی کسی معروف شخصیت کو مدعو کرتے ہیں جس کے خصوصی خطاب سے سبھی طلبہ اور دیگر باذوق و باشعور حضرات مستفید ہوتے ہیں۔

۲۰۰۷ء کے خصوصی خطاب کے لئے طلبہ نے حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی بانی و صدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ کو مدعو کیا۔ آپ نے اشرفیہ مبارک پور تشریف لاکر ۲؍فروری ۲۰۰۷ء کی شب میں ’’انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلمائے اہلِ سُنَّت کا کردار‘‘ کے موضوع پر طلبہ و اساتذہ کو خطاب فرمایا۔ اس موضوع کا انتخاب طلبہ نے ہی کیا تھا۔ کیسٹ سے نقل کرکے اب یہ خطاب حاضرِ خدمت کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ ملک و بیرونِ ملک کے بیدار مغز حلقۂ اہلِ سنّت میں اس خطاب کے مشتملات و نِکات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اس خطاب کی روح کو سمجھ کر اس کے مطابق عُلمائے اہلِ سنت کچھ اقدام وعمل کی طرف بھی فوری توجہ مبذول فرمائیں گے............

محمد شہاب الدین متعلم درجۂ سابعہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور۔ ضلع اعظم گڑھ، یوپی

بعدَ الحمدِ و الثَّناءِ و الصَّلوٰۃِ و التَّسلیم۔

اساتذۂ کرام وعزیز طلبہ! میں آپ حضرات کی دعوت پر آپ حضرات کی خدمت حاضر ہوا۔ برادرِ مُکرَّم حضرت مولانا محمد احمد اعظمی مصباحی صاحب (صدرُ المدرسین الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور) نے ابھی آپ کے سامنے میرے تعلق سے اپنے تعارفی کلمات میں جو کچھ

اِرشاد فرمایا، آپ حضرات نے بغور سنا۔ ایک خاص بات جو میرے لئے بہت مفید ہے کہ اپنے خطاب اور طرزِ خطاب سے انھوں نے آپ حضرات کو بتلایا اور باوَر کرادیا کہ آنے والے مُقرر کی تقریر بھی میری ہی تقریر کی طرح ہوگی۔ یہ میرے کام کی بات تھی جسے میں نے بطورِ خاص توجہ سے سن کر، سمجھ کر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

یہاں پر سامنے پیکٹ کی شکل میں جو ھدایا و تحائف نظر آرہے ہیں وہ غالباً کتابوں کے ہیں۔ جو طلبہ یوم مفتیِ اعظم کے اس مبارک موقع پر مقالات و مضامین لکھ کر اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں، انھیں یہ تحفے عطا کیے جائیں گے۔

مدرّسینِ کرام نے آپ حضرات کے ذوق وشوق اور تحریری دل چسپی کے تعلق سے مجھے بتلایا کہ اس سال (۲۰۰۷ء) تحریری مقابلے میں شریک ہونے والے طلبہ کی مجموعی تعداد پانچ سو چھہتر (۵۷۶) ہے۔ جن میں سے پینتالیس (۴۵) طلبہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ باقی طلبہ نے بھی محنت سے مقالے لکھنے کی کوشش کی ہے۔

امید ہے کہ آئندہ سال باقی ماندہ طلبہ میں جو طلبہ مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لیں گے، ان میں سے اچھے طلبہ پینتالیس (۴۵) کی تعداد میں شریک ہوجائیں گے۔ اِن شاءَ اللّٰہُ تعالیٰ۔

اگر میں تحریر و مقالہ نویسی کے تعلق سے کچھ باتیں عرض کروں تو شاید وقت زیادہ ہوجائے گا اور مجھے جو عُنوانِ خطاب عطا کیا گیا ہے اس پر بات بہت مختصر ہو پائے گی۔ اس لئے میں آپ حضرات سے گزارش کروں گا کہ اپنے اساتذہ سے اس سلسلہ میں تربیت حاصل کرتے رہیں۔ ان کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں تا کہ آئندہ آپ بھی کامیاب اور اچھے صاحبِ علم و قلم بن سکیں۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ''انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلمائے اہلِ سُنّت کا تاریخی کردار'' آپ کا موضوع ہوگا۔ اس پر آپ کچھ تاریخی حقائق پیش کریں۔ تا کہ ہمارے طلبہ انہیں سُن کر، جان کر، اصل تاریخ سے واقف ہوں اور ان کے اندر یہ اِحساس، یہ جذبہ، یہ بیداری پیدا ہو کہ ہم صحیح تاریخ دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ عُلمائے اہلِ سُنّت نے قوم کے

لئے، ملک و مِلّت کے لئے، اپنے وطنِ عزیز کے لئے، کتنی عظیم قربانیاں دی ہیں۔ ایسی عظیم قربانیاں کہ انہیں کے ذریعہ آج دینی، علمی، ادبی، تاریخی، صحافتی، سیاسی تاریخ کا تسلسل ہے اور ہم اپنے اَبنائے وطن کے سامنے اپنے اَسلاف کی قربانیاں پیش کرکے اپنا سَر فخر سے اونچا کرسکتے ہیں۔

عزیز طلبہ! یہ بات ہمیشہ ذہن نشیں رکھیں کہ آپ کا مَنصب، آپ کی حیثیت، آنے والے دنوں میں آپ کا مقام، اور کام صرف یہ نہیں ہے اور نہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم تاریخ پڑھیں، تاریخ سُنیں، اور دوسروں کو سُنائیں۔ بلکہ آپ کے اندر یہ حوصلہ ہونا چاہیے، آپ کا یہ عَزم ہونا چاہیے کہ ہم آنے والی تاریخ خود اپنے ہاتھوں سے ایسی بنائیں کہ بعد کی نسل ہمارے کارناموں اور ہماری خدمات پر فخر کرسکے۔

آپ کا منصب و مقام صرف تاریخ پڑھنے کا نہیں، بلکہ تاریخ بنانے کا ہے۔ آپ کی حیثیت حالات کے دھارے میں بَہنے کی نہیں ہے، بلکہ حالات کا دھارا اور اس کا رُخ موڑنے کی ہے۔

یہ اشرفیہ مبارک پور اور یہاں کے فرزندانِ گرامی قدر یہاں سے نکل کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں، اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی گئے ہیں، انھوں نے وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر اپنے اِخلاص و اَخلاق، اپنی علمی و فکری صلاحیت کی بنیاد پر ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔ چاہے وہ یوپی و بہار کی سرزمین ہو، چاہے نیپال کی سرزمین ہو، چاہے کراچی کی سرزمین ہو، چاہے ہالینڈ کی سرزمین ہو، چاہے انگلینڈ کی سرزمین ہو، چاہے اَفریقہ یا امریکہ کی سرزمین ہو۔ ہر جگہ اور ہر طرف فرزندانِ اشرفیہ کا، مصباحیوں کا پرچم اور ان کا علَم لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء ہندوستانی تاریخ کا نہایت خوں چکاں باب ہے۔ تاریخوں میں آپ نے کچھ ضرور پڑھا ہوگا کہ انگریز ہندوستان کے اندر شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں تاجر کی حیثیت سے آئے۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی سو سال کی محنت کے بعد انھوں نے دِلّی کے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔ ۱۷۵۷ء میں ''پلاسی'' کی سرزمین پر نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے

درمیان جنگ ہوئی لیکن کچھ ہندوستانیوں ہی کی غدّاری سے نواب سراجُ الدولہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور انگریز پورے بنگال پر قابض ہوگئے۔

چوں کہ اس تاریخ کا صرف سیاست اور حکومت سے ربط و تعلق نہیں ہے بلکہ مذہب، علم، اَخلاق، معاشرہ، ساری چیزیں متأثر ہوئی ہیں اِن سے اور اِن جنگوں سے۔ انگریزوں کی حکومت، ان کے قبضے، اور ان کے اختیار و اقتدار سے بھی یہ چیزیں کہیں متأثر اور کہیں مغلوب ہوئی ہیں۔ اس لئے آپ حضرات کو اس تاریخ سے بھی باخبر رہنا نہایت ضروری ہے۔

ہندوستان کے شیر دِل حکمراں سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے اپنے کچھ ہندوستانی حَریصوں، ہندوستانی غدّاروں کی مدد سے ١٧٩٩ء میں زیر کیا اور میدانِ جنگ میں اپنے قلعہ کے سامنے سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے شہید کیا اور انھیں جب یقین ہوگیا کہ سلطان ٹیپو اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے تو انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ ’’آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔‘‘ یعنی آج صرف سلطان ٹیپو نے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ ہندوستان نے شکست کھائی ہے اور اب دِلّی پر قبضہ کرنے سے کوئی ہمیں روک نہیں سکتا۔

سلطان ٹیپو وہی شخص ہے جس کا یہ مقولہ آپ حضرات نے بارہا سنا ہوگا کہ: ’’شیر کی ایک دن کی زندگی، گیڈر کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔‘‘ یعنی جیو تو شیر کی طرح جیو، گیڈر جیسی زندگی نہ گذارو۔

١٨٠٣ء میں انگریزوں نے اپنے فوجی جنرل لارڈ لیک کی قیادت میں دِلّی پر مکمل قبضہ کرلیا۔ لیکن اس وقت کے شاہِ عالم ثانی کو فاتح انگریزوں نے محض ایک پنشن یافتہ سلطان کی حیثیت سے باقی رکھنا اپنے حق میں مفید سمجھا اور شاہِ عالم ثانی کے اختیارات ،انگریزوں نے اتنے محدود کردیے کہ کہا جاتا تھا اور تاریخوں میں یہ جملہ ملتا ہے کہ ’’سلطنتِ شاہِ عالم از دِلّی تا پالم‘‘

آج پالم ہوائی اڈہ مشہور ہے۔ اس وقت شاہِ عالم کی سلطنت و حکومت سمٹ کر دِلّی سے پالم تک رہ گئی۔ باقی پورے ہندوستان پر عملاً انگریز حاکم ہوگئے۔

یہ قبضہ یہ تسلسل جاری رہا تا آں کہ مئی ١٨٥٧ء میں بعہدِ بہادر شاہ ظفر، میرٹھ میں دس مئی کو کچھ ہندوستانی فوجیوں نے انگریزی مظالم کے خلاف بغاوت کی اور اس کے بعد دہلی سے لکھنؤ تک زبردست جنگ ہوئی۔

تقریباً ساڑھے چار مہینے تک جنگ ہوئی دِلّی میں اور اس کے بعد دِلّی کے تخت پر برطانیہ کی مکمل حکومت ہوگئی۔ ’’ایسٹ انڈیا کمپنی‘‘ کا عمل دخل ختم ہوگیا اور اس کی جگہ پر براہِ راست ملکۂ برطانیہ کی حکومت قائم ہوگئی۔ ١٨٥٧ء کی تاریخ کا خلاصہ یہ ہے اور یہی در حقیقت ہندوستان کی حقیقی اور ہمہ گیر عوامی جنگِ آزادی ہے۔

اور یہ بہادر شاہ ظفر ایسے سُنّی حنفی حکمراں اور خوش عقیدہ مسلمان تھے کہ میلاد و قیام و دیگر معمولاتِ اہلِ سُنَّت کے تعلق سے حضرت علاّمہ فضلِ رسول عثمانی بدایونی سے باضابطہ انھوں نے اِستفتا کیا تھا اور علاّمہ فضلِ رسول بدایونی نے اس اِستفتا کا جواب دیا جو ’’اکملُ التاریخ‘‘ مطبوعہ بدایوں کی جلدِ دوم کے اندر موجود ہے۔ مع مکمل سوال و جواب۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفر نے سلطانُ الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رَضِیَ اللّٰہُ عنہٗ کی شان میں ایک بہت ہی شاندار اور بہت ہی ایمان افروز منقبت لکھی ہے۔ وہ منقبت پڑھ کر کے، سن کر کے، روح وجد میں آجاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ عہدِ حاضر کا کوئی سُنّی شاعر، حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری کی منقبت خوانی کررہا ہو۔

یہ بہادر شاہ ظفر، آخری مغل حکمراں تھے اور بزرگوں سے یہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ سُنّی حنفی حکمراں تھے۔ مَراسم و معمولاتِ اہلِ سُنَّت کے پابند تھے۔ اَعراسِ بزرگانِ دین میں شرکت کرتے تھے۔ عُلماے اہلِ سنَّت سے ان کا رابطہ تھا۔ یہ ایک پہلو ہوا، حکومت اور اِقتدار کے لحاظ سے۔

عزیز طلبہ! آپ تاریخ پڑھیے۔ دہلی کے صدرُ الصُّدور حضرت علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی جو حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے والدِ محترم و استاذِ مُکَرَّم ہیں۔ جن کی کتاب ’’مِرقات‘‘ کے نام سے منطق کی مشہور کتاب ہے۔ درس کے اندر آپ پڑھتے ہیں۔ یہ دہلی

کے صدرُ الصُّد ور تھے۔

اوران کے وصال (۱۸۲۹ء) کے بعد ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے آپ کے شاگرد رشید حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی صدرُ الصُّد ور ہوئے اوران کی صدارت کی پوری مدت تقریباً پندرہ (۱۵) سال تک تھی۔یعنی پندرہ سال تک دہلی کے صدرُ الصُّد ور تھے۔ (۱۸۲۷ء میں صدر امین پھر جون ۱۸۴۴ء میں دہلی کے صدرُ الصُّد ور بنائے گئے تھے۔)

مفتی صدرُالدین آزردہ کی حیثیت یہ تھی کہ دِلّی کے سارے اُدَبا، فُضَلا، شُعَرا، ان کے دولت کدے پر آتے تھے اوران سے اِستفادہ کرتے تھے۔اور سارے اصحابِ علم و فضل براہِ راست ان سے وابستہ تھے۔مفتی آزردہ اورعلاّمہ فضلِ حق خیرآبادی ہم سبق ساتھی اور گہرے دوست تھے۔

مفتی آزردہ دہلوی کا مذھب ومسلک جاننے کے لئے آپ ان کی مشہور کتاب "مُنتہَیٰ المَقال فی شرحِ حدیثِ لاتشدّ الرِّحَال" مطالعہ کریں۔یہ آپ کی کتاب ہے جو آپ نے عربی وفارسی میں لکھی ہے اور تقریباً بیس (۲۰) سال پہلے اس کا ترجمہ لاہور سے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔

مُنتھَیٰ المقال کتاب میں نے خود پڑھی ہے جس کے شروع میں، تمہید میں آپ لکھتے ہیں کہ:

اِس وقت ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جو ائمۂ مُجتہدین پر طَعن وتَشنیع کرتی ہے اور اولیاے امّت کے خلاف انگشت نمائی کرتی ہے۔(مفہوم)

اس سے سیدھا سیدھا اِشارہ آپ کا، فرقۂ وہابیہ کی طرف ہے۔اور جو مباحث ہیں ان مباحث کے اندر آپ نے واضح طور پر ''ابنِ حزم ظاہری'' اور ''ابنِ تیمیہ حرّانی'' کا نام لے کر ان کی تنقید ومذمّت کی ہے۔ان کے مسلک کی مذمّت کی ہے۔اس مُنتھیٰ المقال پر حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کی تحریری تصدیق موجود ہے۔

یہ حضرت آزردہ بڑے جلیلُ القدر اور عظیم عالم و فاضل تھے اوران کا ذاتی کتب خانہ اُس زمانہ میں اتنا زبردست تھا کہ تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) روپے کی کتابیں اپنی آمدنی سے انھوں نے جمع کی تھیں۔جنھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں نے برباد کر دیا۔ آپ نے جولائی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف فتواے جہاد پر دستخط کیا تھا جس کی پاداش میں آپ کی ساری جائداد ضبط ہوگئی۔

بعد میں مقدمہ چلا۔آپ لاہور چلے گئے۔پھر واپس دہلی آئے اور جتنی جائداد غیرمنقولہ تھی وہ سب کی سب ضبط ہوگئی۔تھوڑی سی چیز واپس ملی۔

سیاسی حکومت و اِقتدار کے لحاظ سے اُس وقت جو مرکز تھا وہ بھی سُنّی حنفی تھا اور اس زمانے کا جو صدرُ الصُّد ور تھا وہ بھی سنی حنفی تھا۔حضرت مفتی صدرالدین آزردہ اس وقت کے عُلما کے مَرجع تھے۔دہلی سے آگرہ و اَوَدھ تک کے عُلما، حضرت مفتی صدر الدین آزردہ کونہایت قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جنگی لحاظ سے سب سے زیادہ جس نے دادِشجاعت دی اس کا نام ہے دِلاور جنگ مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی۔سلطان ٹیپو کی فوج میں ان کے والد بہت بڑے عہدیدار اور اپنے علاقہ کے نواب تھے۔آپ ان کے صاحبزادے ہیں۔اور میر قربان علی شاہ جے پوری ایک بزرگ تھے، ان سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہیں۔پھر ان کے بعد یہ طالب ہوئے محراب علی شاہ قلندر گوالیاری سے سلسلہ قادریہ میں، اور انھوں نے روحانی بیعت کے ساتھ ساتھ آپ سے یہ بھی بیعت لی کہ انگریزوں کے خلاف تم جہاد کرنا اور انہیں تم اس ملک سے نکال باہر کر دینا۔

مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۸۴۶ء میں دِلّی آئے اور مفتی صدرالدین آزردہ سے ملاقات کی۔انھوں نے مشورہ دیا کہ اس کام کے لئے سب سے بہتر جگہ آگرہ ہے۔اس زمانے میں ممالکِ متحدہ اَوَدھ وآگرہ کے نام سے پورا یو۔پی کا یہ علاقہ جانا جاتا تھا۔آگرہ صدر مقام تھا۔جیسے لکھنؤ اِس وقت صدر مقام ہے۔

مفتی صدرالدین آزردؔہ نے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کو آگرہ بھیجا اور صرف بھیجا ہی نہیں بلکہ تعارفی خط بھی لکھا مولانا انعام اللہ گوپامئوی کے نام اور ان کے ذریعہ وہاں کے اُمَرا، عُلما، اور رؤسا سے گذارش تھی کہ ممکن حد تک آپ لوگ ان کی مدد کریں۔

آگرہ میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی جنھیں ’’نقارہ شاہ‘‘ اور ’’ڈنکا شاہ‘‘ بھی کہا جاتا تھا، انھوں نے بہت جَم کر کام کیا۔ دینی و تبلیغی کام بھی کیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے بھی لوگوں کو آمادہ کیا۔ اور اس زمانے میں آگرہ چوں کہ مرکز تھا اس لئے بہت بڑے بڑے عُلما وہاں پر جمع تھے۔ بہت بڑے بڑے شُعَرا وہاں پر جمع تھے۔ حضرت مفتی سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی بھی وہاں پر موجود تھے۔ حضرت مولانا فیض احمد عثمانی قادری بدایونی بھی وہاں پر تھے۔ حضرت غلام امام شہیدؔ جو بہت مشہور عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر گذرے ہیں، وہ بھی تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (چشتی، ابوالعُلائی، منعمی) مولانا سید محمد قاسم شاہ داناپوری، اس طرح کے بہت سارے عُلما تھے۔ ان سب کو آپ نے آمادۂ جہاد کیا۔

اور ایک بہت بڑا واقعہ اس زمانے میں یہ ہوا کہ ۱۸۵۴ء میں پادری فنڈر اور عُلماے اھلِ سنّت کے درمیان آگرہ میں مناظرہ ہوا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی مناظرِ اول تھے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر اکبرآبادی (چشتی، ابوالعُلائی، مُنعَمی) اور حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (قادری، برکاتی) یہ حضرات معاون مناظر تھے۔

آپ حضرات ان سارے عُلما کی تاریخ پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے کے سارے عُلماے کرام سُنّی حنفی تھے۔ اور حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی تو علاّمہ فضلِ رسول عثمانی قادری بدایونی کے بھانجے ہیں۔ اور بھانجہ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ اپنے نانا حضرت شاہ عینُ الحق عبدالمجید قادری برکاتی بدایونی سے سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں باضابطہ بیعت بھی ہیں۔ اور ان کے نانا، حضرت شمسِ مارہرہ سید شاہ آلِ احمد اچھے میاں قادری برکاتی مارہروی رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُ کے مُرید و خلیفۂ ارشد تھے۔ تو اس وقت آگرہ کے جو بھی ممتاز عُلما تھے، ان میں سے اکثر حضرات ۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر جمع تھے۔

پھر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے اندر جنگ شروع ہوئی، جنگ پھیلی تو پوری مذہبی قیادت ان عُلماے کرام نے کی اور جہاد کی روح پھونکنے کی ذِمّہ داری ان سبھی حضرات نے انجام دی جن میں سے حضرت مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی کے بارے میں آپ جان چکے ہیں۔ دِلّی کے اندر ساڑھے چار ماہ کی جنگ ہوئی۔ جس میں جنرل بخت خان روہیلہ، علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی وغیرہ نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

عزیز طلبہ! اب آپ یہاں پر توجہ فرمائیں کہ ۱۸۵۷ء کی پوری جنگ جو لڑی گئی وہ دِلّی میں لڑی گئی۔ اس کے بعد ’’روہیل کھنڈ‘‘ (بریلی و پیلی بھیت و مرادآباد و بدایوں و شاہجہاں پور وغیرہ) میں لڑی گئی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں لڑی گئی۔ دِلّی کا پورا محاذ دِلّی کے سُنّی عُلما اور سپہ سالاروں نے سنبھالا اور ساری کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے بعد بریلی میں جو جنگ لڑی گئی، خان بہادر خاں، حافظ رحمت خاں روہیلہ (شہید و مدفون بریلی) کے پوتا تھے اور حافظ رحمت خاں روہیلہ صرف ایک سپہ سالار نہیں تھے سُنّی حنفی سپہ سالار اور متبعِ شریعت بھی تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حافظِ ملّت علیہِ الرَّحمۃُ و الرِّضوان (حضرت مولانا الشاہ عبدالعزیز مرادآبادی مُحدِّث مبارک پوری بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی) جب طلبہ کو خطاب کرتے تھے، نماز کی پابندی کی نصیحت فرماتے تھے تو حافظ رحمت خاں روہیلہ کا خصوصیت سے ذکر فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ:

عینِ حالتِ جنگ میں بھی حافظ رحمت خاں روہیلہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔

ان کے یہ پوتے تھے خان بہادر خاں روہیلہ۔ اور ان کے معاون مفتی تھے حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی، جن کی ’تواریخ حبیبِ الہٰ‘‘ و ’’علم الصیغہ‘‘ آپ حضرات نے پڑھی ہوگی۔ علم الصیغہ داخلِ درس ہے اس لئے آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ کتاب پڑھی ہوگی۔ انگریزوں نے اپنے خلاف ایک فتوائے جہاد کے جُرم میں آپ کو ’’کالا پانی‘‘ کی سزا دی تھی۔

پھر شہزادہ فیروز شاہ، بریلی کے اندر تھا۔ جب حج سے واپس آیا اور انوکھی بات یہ ہے کہ تمام سلاطینِ مغلیہ اور ان کے شہزادوں میں صرف شہزادہ فیروز شاہ ایسا تھا جس نے حج کیا تھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی بھی معروف مغل شہزادہ کے حج کا ذِکر تاریخ میں نہیں ملتا۔

اس دور کا شہزاہ فیروز شاہ، مالوہ، اندور، آگرہ، متھرا، دھولپور، ہوتا ہوا دِلّی پہنچا۔ اس کے بعد بریلی میں اس نے پڑاؤ ڈالا۔

روہیل کھنڈ کا یہ علاقہ جو اِس وقت ہے، اس میں بریلی شامل ہے۔ مراد آباد شامل ہے۔ بدایوں شامل ہے۔ شاہجہاں پور شامل ہے۔ روہیلہ پٹھانوں کی اس زمانے میں آبادی یہاں زیادہ تھی اس لئے اس پورے علاقہ کو روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔ آج بھی وہاں اس علاقہ میں سنّیوں کی غالب اکثریت ہے۔ ۱۸۵۷ء میں تو شاید باید کوئی وہابی اس علاقہ میں مشکل سے ملتا ہوگا۔ پیلی بھیت مرکز تھا جہاں کی جامع مسجد حافظ رحمت خاں روہیلہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اور آپ حضرات نے تاریخ میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی بھی افغانی تھے۔ بھڑ بیچ خاں قبیلہ سے ان کا تعلق تھا اور اوپر جا کر روہیلہ سے اس کا رِشتہ مل جاتا ہے۔

اور ''مسجد بی بی جی'' جو بریلی شریف کے اندر ہے۔ جہاں اِس وقت مفتیِ اعظمِ ہند (مولانا الشاہ مصطفیٰ رضا نوری بریلوی) کا دارالعلوم مظہر اسلام قائم ہے۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے جب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں منظرِ اسلام قایم کیا تو پہلے باضابطہ مدرسہ کی شکل میں تعلیم اسی مسجد بی بی جی، بہاری پور میں شروع ہوئی۔ یہ مسجد بھی حافظ رحمت خاں روہیلہ کی کسی قریبی عزیزہ کے نام سے موسوم ہے۔ انھوں نے اس کی تعمیر کرائی تھی اور ابھی تک اس کا نام ''مسجد بی بی جی'' ہی ہے۔

یہ جو روہیل کھنڈ کا علاقہ تھا۔ سب سے زبردست اور خون ریز جنگ اسی علاقہ میں ہوئی تھی۔ اور یہاں جتنے بھی انقلابی قائدین تھے، سب کے سب سنی عُلمائے کرام تھے۔ جن کی کمان میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء لڑی گئی۔

حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی وحضرت مولانا رضا علی بریلوی کی سَر پَرستی و پُشت پناہی بریلی کے مجاہدین کو حاصل تھی۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے حقیقی دادا مولانا رضا علی بریلوی فنِ شاعری میں حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا رضا علی بریلوی (بیعت وارادت از شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی تلمیذِ شاہ عبدالعزیز مُحدِّث دہلوی وخلیفۂ شاہ محمد آفاق نقشبندی مجدِّدی دہلوی) کے ایک چہیتے اور بہادر شاگرد مولانا فخر الدین جوسندیلہ، ہردوئی کے باشندے تھے وہ انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے بریلی میں۔ درجنوں گھوڑے مولانا رضا علی بریلوی کے انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے لئے وقف تھے۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی سے مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی نے لکھنؤ میں حادثۂ مسجد ہنومان گڈھی، اجودھیا کے فوراً بعد ۱۸۵۵ء ہی میں ملاقات کی۔ باضابطہ تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جنرل بخت خاں نے دہلی میں آپ سے ملاقات کی۔ بہادر شاہ ظفر سے اس کے بعد مشورے ہوئے۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ دِلّی سے لکھنؤ تک لڑی گئی اور اس جنگ کی قیادت عُلمائے اہلِ سنّت نے کی۔

ان میں علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں آپ حضرات نے پڑھا بھی ہوگا، عُلما کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ ان کی مشہور کتاب ''تحقیقُ الفَتویٰ فِی اِبطالِ الطَّغوَیٰ'' ہے۔ اسی طرح اَلثَّورۃُ الھِندیۃ ہے جس کا اردو ترجمہ ''باغی ہندوستان'' ہے جو بجنور ولاہور اور المجمع الاسلامی، مبارک پور سے شائع شدہ ہے۔ ''امتناعُ النظیر'' بھی علاّمہ خیرآبادی کی ایک بےنظیر کتاب ہے۔

ان کتابوں سے ان کا مسلک، ان کا کردار اور ان کی عظمت دو دو چار کی طرح واضح ہے۔

علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نے جامع مسجد دہلی میں انگریزی اقتدار کے خلاف تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ دیا جس کے نتیجے میں دہلی کے اندر نوے ہزار مجاہدین اور انقلابی انگریزوں سے جنگ کرنے کے لئے جمع ہوگئے۔

حضرت مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ جلیلُ القدر عالم اور بہت زبردست مجاہد تھے۔ مرادآباد میں مجاہدین کی آپ نے قیادت کی اور ۱۸۵۸ء میں گرفتاری ونمائشی مقدمہ کے بعد آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے کہ تختۂ دار کی طرف آپ جس وقت جارہے تھے، اس وقت بھی آپ کے لبوں پر ترانۂ نعت جاری تھا۔ اور یہ اشعار پڑھتے جارہے تھے:

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا دینِ حَسَنْ رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اس کا تنِ بدن رہ جائے گا
سب فنا ہوجائیں گے کافیؔ ولیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

مولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے۔ اتنے بڑے شاعرِ نعت تھے کہ تختۂ دار پر جاتے ہوئے بھی نعتِ رسول گنگنا رہے تھے۔

یہ پوری تاریخ اہلِ سُنَّت وعُلمائے اہلِ سُنَّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ صرف ۱۸۵۷ء کی نہیں بلکہ اس سے پہلے کی اور اس کے بعد کی بھی۔ اگر میں یہ تاریخ بیان کروں تو پوری رات گذر جائے گی۔ لیکن میں نے صرف چند پہلوؤں کی طرف نشان دِہی کی ہے۔

آپ حضرات اور ہماری سب کی مشترکہ ذِمّہ داری ہے کہ صحیح تاریخ دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت ہم نے کی ہے اور ہندوستان کے

مسلمانوں کے لئے خون کے قطرات ہم نے بہائے ہیں۔ میدانِ جنگ میں تیر وسنان کے مقابلے کی جب بھی ضرورت پیش آئی ہے تو ہم نے اپنا سینہ پیش کیا ہے۔

اگر کوئی نام نہاد مؤرّخ ہماری خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ تاریخ بدلتا ہے۔ تاریخ کا چہرہ مسخ کرتا ہے۔ تو یہ اس کی بدبختی ہے۔ اور تاریخ کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ تاریخ کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ ہمارے عُلمائے اہلِ سنّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور دِلّی سے لے کر روہیل کھنڈ تک، روہیل کھنڈ سے لے کر لکھنؤ تک، اور اس کے بعد جب انگریز اپنے مکروفریب کے ذریعہ، اپنی طاقت وقوت کے ذریعہ، مجاہدین پر غالب آگئے اور کچھ ہندوستانیوں کی غدّاری کی وجہ سے انہیں شکست وناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو اکثر مجاہدین اور عُلمائے کرام شاہجہاں پور میں جمع ہوئے اور قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) ایک جگہ ہے، وہاں مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی کی قیادت میں باضابطہ ایک مُسلم حکومت قائم کی۔

مولانا فیض احمد عثمانی قادری برکاتی بدایونی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی (چشتی، ابوالعلائی، مُنعمی) وغیرہ ارکانِ دولت وسلطنت منتخب ہوئے لیکن وہاں بھی بعض غدّاروں کی وجہ سے میدان ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد شہزادہ فیروز شاہ وجنرل بخت خاں ومولانا فیض احمد عثمانی بدایونی اور اس طرح کے دوسرے بہت سارے حضرات یہاں سے نکل کر نیپال کی طرف چلے گئے اور پھر اس کے بعد ان میں سے اکثر کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا کہ کب؟ کیسے؟ کہاں؟ ان کا انتقال ہوا؟ البتہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ''قصبہ محمدی'' کے آس پاس کے ایک راجہ بلدیو سنگھ کے فریب وغدر وبدعہدی کی وجہ سے ایک جنگ میں شہید ہوئے۔

مولانا فیض احمد بدایونی کے بارے میں، میں نے پڑھا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت علاّمہ فضلِ رسول عثمانی بدایونی نے انھیں بہت تلاش کیا آپ کو۔ کیوں کہ سگے بھانجے تھے۔ آپ کی تلاش میں صرف ہندوستان نہیں بلکہ آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ، ٹرکی تک آپ گئے لیکن آپ کا کوئی سُراغ نہیں ملا اور خدا جانے کب کیسے کس عالم میں کہاں آپ کا انتقال ہوا؟

عزیز طلبہ! یہ ہندوستانی تاریخ کی خون ریز جنگ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی، مفتی

صدرُالدین آزردہ دہلوی (تلامذۂ حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی وحضرت علامہ فضلِ امام خیرآبادی) کی دینی قیادت میں اور مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی و جنرل بخت خاں و شہزادہ فیروز شاہ وخان بہادر خاں روہیلہ کی فوجی کمان میں لڑی گئی اور یہ سب کے سب سُنّی حضرات تھے۔اور ہمارا سلسلۂ ذکر وفکر اور سلسلۂ تعلیم خیرآبادی عُلما (سلسلۂ خیرآباد) سے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی (یعنی سلسلۂ ولی اللّٰہی عزیزی) سے ملتا ہے۔اور مذکورہ حضرات بھی انہیں سے وابستہ تھے۔

مفتی صدرُالدین آزردہ دہلوی،حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی اور علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی کے شاگرد تھے۔حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی،شاہ عبدالعزیز اور اپنے والد علاّمہ فضلِ امام خیرآبادی دونوں کے شاگرد تھے۔

ہم اہلِ سُنَّت اور اس وقت کے جو عُلمائے کرام ہیں،ان کا سلسلۂ تلمذ بھی حدیث کا حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی سے ملتا ہے۔اور معقولات کا حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی سے ملتا ہے۔تو یہ سلسلہ جو اس وقت جاری ہُوا، دینی، علمی اور روحانی شکل میں اب بھی جاری ہے۔اور ہم اسی کے وارث اور جانشیں ہیں۔

عزیز طلبہ! تقریباً دوسو سال کی تاریخ ایسی لکھی گئی ہے کہ عُلمائے اہلِ سُنَّت کے کردار کو فراموش کرنے یا داغ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔اب ہمارا آپ کا فرض ہے کہ اس تاریخ کو درست کریں۔

سب سے پہلے تاریخ کو سمجھیں، سمجھائیں، پوچھیں، تحقیق کریں اور اس کے بعد اس تاریخ کو صحیح اور درست کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم یہ ہیں اور ہمارا یہ کام ہے۔

اس تاریخ کی شکل بگڑ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عُلمائے اہلِ سُنَّت چوں کہ نہایت مخلص تھے اور اُن کا جو بھی کام ہوتا تھا دین کے لئے،علم کے لئے،اپنی قوم، ملک، اور وطن کے لئے ہوتا تھا، جسے نمایاں کرنا،اس کی نمائش کرنا،عُلمائے اہلِ سنّت کا مطمحِ نظر نہیں تھا۔اس لئے جو کام کیا،کیا۔اس کے بعد بھول گئے۔عموماً اسے ضبطِ تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

ان کے برعکس دیگر عُلما کا نظریہ کچھ ایسا تھا کہ جو کام ہے تھوڑا بہت وہ تو ہے ہی، جو کام نہیں ہے اسے بھی زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے پھر اس کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیا

جائے اور دنیا کے سامنے اسی طرح پیش کیا جائے کہ۔ہم نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ہم نے یہ تیر مارا۔وغیرہ وغیرہ۔

اُس وقت کے عُلمائے اہلِ سنّت کا اِخلاص، اُن کا جذبہ بخیر تھا۔نیت صالح تھی۔اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اَجر انہیں یقیناً ملے گا یا ملا ہوگا۔لیکن ہم چوں کہ اُن کے وارث ہیں، جانشین ہیں اس لئے آج کے حالات میں ہماری یہ ذِمّہ داری ہے کہ ہم اس تاریخ کو دنیا کے سامنے صحیح شکل میں پیش کریں۔

اور یہاں پر میں اپنے عزیز طلبہ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ:

ان میں سے بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا (اگر چہ میں نے اِخلاص اور نیک نیتی کے حوالہ سے اس کا جواب دے دیا ہے کہ یہ کمی کیوں رہ گئی) کہ تاریخ ہم نے صحیح طور پر کیوں نہیں پیش کی؟ تو بجائے اس کے ہم میں سے ہر شخص کو خود یہ سوچنا چاہیے کہ کیوں رہ گئی خود ہم سے تاریخ نویسی؟

کیوں نہ ہو سکی ہم سے تاریخ نویسی؟ اس پہلو پر غور کریں کہ اب یہ کمی نہیں رہنی چاہیے اور اس تاریخ کی یہ کمی دور کرنا اور اسے درست کرنا ہماری ذِمّہ داری ہے۔ہمارا کام ہے۔ ہمارا فریضہ ہے۔

یہ احساسِ ذِمّہ داری ہم اپنے اندر پیدا کریں۔شعور بیدار کریں اور جو کمی رہ گئی اس پر غیر ضروری تبصرہ کرنے،نکتہ چینی کرنے کی بجائے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ باپ سے یا کسی بڑے سے اگر کوئی کمی وکوتاہی نظر آجاتی ہے تو اس کو بیان نہیں کیا جاتا۔اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔اپنے باپ یا بڑے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔بلکہ اس کمی کو، لائق بیٹا اور لائق بھائی، سعادت مند وارث اور سعادت مند آدمی، اپنی محنت سے دور کرتا ہے۔ اپنے باپ کا، اپنے بھائی کا، اپنے بڑوں کا، نام روشن کرتا ہے۔یہی شیوہ ہمارا ہونا چاہیے۔

جن عُلمائے کرام کے نام میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔مثلاً حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی وحضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی وحضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی وحضرت مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی وغیرہ۔مولانا فیض احمد بدایونی ومولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ۔ان کے حالات کہیں مختصر کہیں معمولی تفصیل کے ساتھ کتابوں میں ملتے ہیں۔

ان کے حالات کو ہمیں جاننا چاہیے اور اپنی تقریر، اپنی تحریر کے اندر ان کا ذِکر و بیان کرنا چاہیے۔

عزیز طلبہ! اب دوسروں کی تاریخ نگاری اور تاریخ کے ساتھ مذاق کرنے کا یہ انداز ہے۔ یہ طریقہ ہے کہ:

ایک بزرگ عالمِ دین جو اُس زمانے میں مجاہدِ آزادی بھی تھے، مولانا رحمت اللہ کیرانوی جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ ۱۸۵۸ء میں مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے۔ دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا۔ جس کے قیام سے آپ آٹھ سال پہلے ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔ لیکن ایک عرب مؤرِّخ (محض پروپگنڈہ سے متأثر ہوکر) لکھتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور وہاں کے فارغُ التحصیل تھے۔ یعنی جس ادارے کے قیام سے آٹھ سال پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہندوستان چھوڑ چکے تھے، اس کے بارے میں کہا اور لکھا جارہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغُ التحصیل ہیں۔

اور یہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی وہ تھے کہ جب مصنفِ براھینِ قاطعہ مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری اور حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری لاہوری کے درمیان ۱۳۰۶ھ میں بھاولپور، پنجاب کے اندر مناظرہ ہوا اور اس کی روداد "تقدیسُ الوکیل عن توھینِ الرَّشید و الخلیل" کے نام سے شائع ہوئی۔ تو طبعِ دوم کے اندر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی تحریری تصدیق موجود ہے۔ آپ حضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: میں اب تک رشید (یعنی رشید احمد گنگوہی) کو رشید (ہدایت یافتہ) سمجھتا تھا مگر یہ میرے گمان کے خلاف کچھ اور ہی نکلے"

تو ایسے سُنّی عالم کو بھی اپنا بنانے اور دارالعلوم دیوبند کا فارغ بتانے میں ذرا بھی دریغ اور ذرا بھی تکلف اور جھجھک محسوس نہیں کرتے کچھ لوگ۔

اس طرح سے پوری تاریخ کو کھنگالنے کی، پوری تاریخ کو جانچنے کی، پوری تاریخ کو صحیح طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

محترم اساتذہ وطلبہ! تاریخی حقیقت کا ایک ناقابلِ تردید پہلو یہ ہے کہ تقویۃُ الایمان از شاہ اسمٰعیل دہلوی کے وھابی مسلک ونظریہ سے وابستہ عُلما کا مجموعی طور پر جنگِ آزادی

۱۸۵۷ء سے دور دور تک کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ یہ بات سرسید نے اپنی کتاب ''اسبابِ بغاوت ہند'' مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں صراحت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ اسی طرح مقالاتِ سرسید حصہ شانزدہم کے حاشیہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ انگریز کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب کے سب عُلماے کرام شامل تھے جو سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی کے شدید ترین مسلکی مخالف تھے۔ آزادیِ ہند کے بعد لکھی گئی کتاب ''عُلماے ہند کا شاندار ماضی'' حصہ چہارم میں جمعیۃ العلمائی مؤرِّخ مولانا سید محمد میاں دیوبندی نے لکھا ہے کہ عُلماے صادق پور، پٹنہ تنظیمی طور پر جنگِ آزادی سے بالکل الگ تھلگ رہے اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری کی تحریر کے مطابق یہ لوگ انقلابِ ۱۸۵۷ء کے مخالف تھے۔

حضرت مولانا سید کفایت علی کافؔی مرادآبادی کو حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ایک شعر میں ''سلطانِ نعت گویاں'' فرمایا ہے۔:

کافؔی سلطان نعت گویاں ہیں رضؔا۔ اِن شاءَ اللہ میں وزیر اعظم۔

عزیز طلبہ! آپ اَبنائے اشرفیہ ہیں۔ آپ کو کام کرنا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ حافظِ ملّت (حضرت مولانا عبدالعزیز مرادآبادی، محدِّث مبارک پوری) علیہ الرحمہ کے درِ دولت پر (جہاں اب عزیزِ ملّت مولانا عبدالحفیظ عزیزی سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، قیام پذیر ہیں) حاضر ہوا۔ میں نے جماعتی حالات سے متعلق کچھ باتیں کرتے ہوئے عرض کیا کہ: حضرت! ہمارے یہاں فلاں کام کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ یہ کام نہیں ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ ''اِن شاءَ اللّٰہ کام ہوگا اور یہیں سے ہوگا''۔

حافظِ ملّت علیہ الرحمہ نے جو خواب دیکھا ہے اس کو آپ شرمندۂ تعبیر کریں اور پوری ملّتِ اسلامیہ کی قیادت، سیادت، امارت، اور اس کی رہنمائی کا جو عظیمُ الشان فریضہ ہے اسے انجام دیں۔ کیوں کہ پورے ملک کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔ پورے ملک کی ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر کی بھی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ:

''اشرفیہ ہماری جماعت کا عظیمُ الشان مرکزی ادارہ ہے اور اشرفیہ ہماری جماعت کا

ایک مرکزی نہیں بلکہ اگر تعمیری اعتبار سے اس کی تعبیر کی جائے تو اشرفیہ ہمارے شہرِ اہلِ سُنَّت کا تاج محل ہے۔ ہمارا حُسن ہے۔ ہمارا وقار ہے۔ ہماری عظمت ہے۔ اور اس سے ہماری شان وشوکت وابستہ ہے''۔

اس طرح پوری دنیائے اہلِ سُنَّت کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ فرزندانِ اشرفیہ کام کرتے ہیں اور کام کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اس کا کرم واحسان ہے کہ قوم نے ہم سے جو توقُّعات وابستہ کر رکھی ہیں، ایک حد تک ہم وہ توقُّعات رفتہ رفتہ پوری بھی کر رہے ہیں۔ علمی میدان میں، فکری میدان میں، تحریری میدان میں، صحافتی میدان میں، اس وقت اگر آپ پوری جماعت کا جائزہ لیں تو ۷۰/۸۰ فیصد تعداد فرزندانِ اشرفیہ کی نظر آئے گی۔

دِلّی کے اندر جب کبھی دانشوروں، صحافیوں، لیڈروں، ایڈیٹروں سے میری گفتگو ہوتی ہے۔ عُلمائے اہلِ سنّت یا مدارسِ اہلِ سُنَّت کا ذکر آتا ہے تو عموماً سب سے پہلے وہ اشرفیہ مبارک پور کا نام لیتے ہیں۔ حکومتی حلقوں تک بھی یہ بات اچھی طرح معلوم اور واضح ہو چکی ہے کہ اہلِ سُنَّت کا سب سے بڑا دارُ العلوم، مبارک پور میں ہے۔ اور اس وقت کی جو خانقاہی یا بریلوی قیادت ہے اُس کا مسلکی مرکز بریلی ہے مگر علمی وفکری اعتبار سے اہلِ سُنَّت کی باگ ڈور اشرفیہ مبارک پور کے ہاتھ میں ہے۔

یہ تأثر بھی عام ہو چکا ہے اور مزید توقُّعات بھی آپ سے وابستہ کی جا رہی ہیں۔

آپ حضرات یہ عزم لے کر یہاں سے اُٹھیں کہ یہ توقُّعات ہمیں پوری کرنی ہیں۔ قوم کا ہمیں قابلِ قدر سرمایہ بننا ہے۔ قوم نے ہم سے جو توقُّعات وابستہ کر رکھی ہیں اُن کی توقُّعات سے کہیں آگے بڑھ کر ہم کو کام کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ حضرات صحیح طور پر فرزندانِ اشرفیہ کہے جانے کے مستحق ہوں گے۔

اور جو ہمارے سُنّی حنفی اَسلافِ کرام تھے انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے اپنے دل ودماغ وفکر وخیال اور سوچ کا جو بھی استعمال کرنا ہے وہ استعمال کریں۔ لیکن اَسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اور ان کے ساتھ

سعادت مندی ووابستگی کا اظہار کر کے۔ کیوں کہ اہلِ سُنَّت کا سرمایۂ افتخار ہی سعادت مندی اور بزرگوں کے ساتھ حُسنِ عقیدت ومحبت اور جذبۂ احترام ہے۔ اکابر واَسلاف کے طریقہ ورَوِش سے ذرا بھی جو شخص اِنحراف کرتا ہے پھر اسے بے شمار نقصانات اُٹھانے پڑتے ہیں۔ وہ بہک جاتا ہے۔ بے توفیق اور بے فیض ہو جاتا ہے۔

اس لئے اپنے اساتذہ سے، اپنے مشائخ سے، اپنے اَسلافِ کرام سے، وابستہ رہ کر کے ہی ہم کو سارا کام کرنا ہے۔ اس سے ایک اِنچ بھی الگ ہٹ کر ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جو ہمارے موقِف، ہمارے مسلک سے جُدا یا اس کے لئے باعثِ رسوائی اور باعثِ خسارہ ثابت ہو۔

اس بات کو آپ سبھی حضرات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔

اب بات بہت ہو چکی ہے۔ آئندہ پھر کبھی موقعہ ملے گا تو اِن شاءَ اللّٰہ مزید کچھ باتیں عرض کروں گا۔

و اٰخِرُ دَعْوَانا انِ الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمین

السَّلام علیکم و رحمۃُ اللّٰہ و برکاتُہ

(مطبوعہ ماہنامہ کنز الایمان دہلی، شمارہ جون ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆

جدید اَفکار و تحریکات

ترجمان و نمائندۂ عُلماے اہلِ سُنّت ،فقیہِ اسلام حضرت مولانا الشاہ احمد رضا حنفی قادری برکاتی بریلوی (ولادت ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء/ وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اپنے عہد کے ہی نہیں بلکہ صدی دو صدی پہلے کی تاریخ کے بھی عدیمُ النظیر فقیہِ جلیل اور شہرۂ آفاق عالم و مفکّر ہیں۔ آپ کی شانِ تجدید و اِحیاے دین اُن کتب و رسائلِ رضویہ سے صاف عیاں ہے جن کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار ہے اور جن کا مطالعہ کر کے معاصِر عُلما و فُقہاے کرام سے دورِ حاضر تک کے عُلماے ہند و پاک و مشائخِ عرب بھی آپ کی مذہبی استقامت، علمی بصیرت اور فکری وسعت و جامعیت کے مُعترف و مَدَّاح ہیں۔

برِصغیر ہند و پاک کی قدیم و جدید معروف دینی و علمی شخصیات پر مدارس و جامعات اور علمی و تحقیقی مراکز میں جو تحقیقات ہو رہی ہیں ان کے درمیان امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے علم و فضل اور حیات و خدمات کے مختلف گوشوں پر اِس وقت غالبًا سب سے زیادہ لکھا جا رہا ہے اور مختلف زبانوں میں ایشیا سے یورپ و امریکہ تک کی بعض یونیورسٹیوں میں متعدد ریسرچ اسکالر ''رضویات'' کے موضوع پر اپنا مقالۂ ڈاکٹریٹ مکمل کر رہے ہیں اور کئی ایک تحقیقی مقالات مکمل و مطبوع ہو چکے ہیں۔

عالَمِ اسلام کی سب سے قدیم و عظیم یونیورسٹی جامعہ اَزہر قاہرہ، مصر کے کئی اساتذہ و طلبہ ''رضویات'' کے موضوع پر عربی زبان میں نہایت گراں قدر تحریریں پیش کر چکے ہیں۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ کا طریقہ تھا کہ وہ پیش آمدہ اُمور و معاملات اور مذہبی و علمی و معاشرتی و سیاسی مسائل پر اوّلین مرحلے میں غور و فکر کر کے شرعی و اصولی رائے قائم کر لیتے اور اپنی رائے پر سطحیت و جذباتیت کو کسی قیمت پر کسی بھی پہلو سے حاوی بلکہ اثر انداز بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اِخلاص و اِصابت و اِستقامت اور مذہبی و فکری بصیرت و قیادت آپ کا شیوہ اور طُرّۂ امتیاز تھا۔ اور یہ وہ عظیم صفات ہیں جو نایاب نہیں تو نادِر اور کم یاب ضرور ہیں۔

آپ کی زندگی کے بالکل آخری دو تین سالوں (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۱ء) میں کئی تحریکوں، تنظیموں کا وجود و عروج ہوا۔ کئی مسائل و مباحث عُلما اور قائدینِ ہند کے سامنے چیلنج کی حیثیت سے اُبھرے۔ جن میں (۱) ہندوستان دارُالاسلام ہے یا دارُالحرب؟ (۲) تحریکِ خلافت (۳) تحریکِ ترکِ موالات (۴) تحریکِ ھجرت نے متحدہ ہندوستان کو سب سے زیادہ متأثر و مضطرب بلکہ متعدد سنگین اُمور و معاملات و حادثات نے انھیں حد درجہ مبتلاے کرب و اَذِیت بھی کیا۔

زیرِ نظر تحریر میں مذکورہ امور و مسائل کو موضوعِ بحث بنا کر کچھ حقائق پیش کیے جا رہے ہیں اور امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی دینی فضیلت، علمی جلالت، فکری بصیرت و قیادت، اور آپ کے اِختیار کردہ موقف کی اِصابت و اِستقامت کو واضح کیا جا رہا ہے۔

نگاہِ تحقیق و انصاف میں ان حقائق کو یقیناً اعتبار و وقار حاصل ہوگا اور بہت سے مخفی گوشے قارِئین کی نظر کے سامنے آئیں گے۔ جن کی روشنی میں بڑی آسانی کے ساتھ صحیح نتائج تک پہنچنے میں انھیں خاطر خواہ مدد ملے گی۔

بیسویں صدی عیسوی کے یہ حقائق اِس اکیسویں صدی عیسوی اور آنے والی صدیوں کے لئے بھی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیں گے۔ وَاللّٰہُ الھَادِی اِلیٰ سَواءِ السَّبیل وھُوَ المُعِین وَالمُسْتَعَان وَعَلیہِ التُّکْلان۔

☆☆☆☆

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء)

آغازِ تحریکِ خلافت اور خلافت کانفرس کے بارے میں سید طفیل احمد منگلوری علیگ اپنی مشہور تاریخی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' (طبعِ اول ۱۹۳۷ء۔ طبعِ ثانی ۱۹۳۸ء) میں لکھتے ہیں:

''۱۹۱۸ء میں تُرکوں کو شکست ہوگئی اور ۳/نومبر ۱۹۱۸ء کو تُرکوں نے اِلتوائے جنگ کے معاہدے پر دست خط کردیے۔ مگر انگریزوں نے فوراً ''موصل'' پر پیش قدمی شروع کردی اور ''قسطنطنیہ'' پر قبضہ کرلیا۔ اور مسٹر وِلسن کے اصول تسلیم کرلینے کے باوجود سلطنتِ تُرکی کو اِتّحادیوں نے تقسیم کر کے اس کا نام حکم برداری رکھا۔

اس سے دنیائے اسلام میں ہل چل ہوگئی اور اس کے اثرات ہندوستان میں بھی پہنچے اور جگہ جگہ مسلمانوں کے جلسے ہونے لگے جن میں خاص جلسے حسبِ ذیل تھے:

(۱) ۱۷/جنوری ۱۹۱۹ء کو مدراس میں بہ صدارت سیٹھ یعقوب حسن۔

(۲) ۲۶/جنوری ۱۹۱۹ء کو بہ صدارت مولانا قیام الدین عبدالباری (فرنگی محلی)

(۳) ۲۲/ستمبر ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے۔

(۴) ۲۲/نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں بہ صدارت آنریبل مسٹر فضلُ الحق (کلکتہ)

خلافت کانفرنس کے نام سے آخرُ الذکر جلسہ میں یہ جماعت مستقل طور پر قائم کی گئی۔

............ان ابتدائی جلسوں کے بعد خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس آخرِ دسمبر ۱۹۱۹ء میں بہ مقام امرتسر (پنجاب) بہ صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوا............ خلافت کانفرنس کا اِجلاس اگرچہ صرف مسلمانوں سے مخصوص تھا مگر اس وقت وہ ''عجیب مَعجونِ مُرکّب'' بن گیا تھا۔ اس میں ہندو مسلمان یکساں جوش کے ساتھ شریک تھے۔

............خلافت کانفرنس کا دوسرا اِجلاس ۱۵/فروری ۱۹۲۰ء کو زیرِ صدارت مسٹر غلام محمد

بھر گری، بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں قرار پایا کہ: خلافت کا ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔'' الخ (ص: ۴۹۴ تا ۴۹۶۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، مؤلّفہ سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ مطبوعہ مکتبۃُ الحق، ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی۔ رمضان ۱۴۲۲ھ/نومبر ۲۰۰۱ء)

مرکزی خلافت کمیٹی لکھنؤ کے بانی و سرپرست حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) تھے۔ مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۱ء) مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۳۸ء) وغیرہ اس خلافت کمیٹی کے دست و بازو تھے۔ یہ کمیٹی غالباً ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی تھی۔ خلافت کمیٹی بمبئی پہلے سے موجود تھی۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ''انجمن خُدّام کعبہ'' بنائی تھی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہی انجمن، خلافت کمیٹی کی شکل میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اور کچھ حضرات کہتے ہیں کہ مسلم کانفرنس لکھنؤ ۱۹۱۹ء میں مَرکزی خلافت کمیٹی کی باضابطہ بنیاد رکھی گئی۔

بطورِ تمہید ۲۰۔۱۹۱۹ء کے کچھ اَحوال پر مشتمل ایک تحریر بقلم حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) ملاحظہ فرمائیں۔

وقیع رسالہ (بنام ''اَلرَّشاد'' مؤلّفہ سید سلیمان اشرف، مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ۔ ۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء) کا یہ ابتدائی حصہ پیشِ خدمت ہے جو کچھ طویل مگر حقائق و معلومات سے لبریز ہے:

''مسئلۂ خلافت میں ہندوؤں کے چند سَر بَر آوردہ اصحاب نے جو زبانی شرکت و اظہارِ ہمدردی کی، پھر ہندو اُونیس ۱۹ مارچ (۱۹۲۰ء) کی ہڑتال میں شریک ہوئے تو اَب مسلمان نہایت بے چین ہیں کہ اس کے تشکّر و اِمتنان میں کیا نچھاور کریں؟

جو کچھ پونجی تھی اُوس کا ایک کثیر حصہ سَتیاگرہ کے موقعہ پر پہلے ہی نثار ہو چکا تھا، جو رَہ گیا وہ پہلی ہڑتال ۱۷/دسمبر ۱۹۱۹ء کے شریک ہونے پر پیش کش کر دیا۔ اب ایک نام اسلام رہ گیا ہے۔ کاش کہ یہ ''محقّر ہدیہ'' ہمارے ملکی بھائی قبول کرلیتے تو خوب ہوتا۔

یہ کیسی مصیبت ہے کہ مسلمان کسی قوم کی طرف حصولِ مقصد کے لئے قدم بڑھاتے ہیں لیکن مقصد میں کامیاب ہونے سے پیشتر دین و مِلّت کو اوس قوم پر سے فدا کر دیتے ہیں؟

پھر جو دامن اپنا دیکھتے ہیں تو مقصد و مطلب سے ویسا ہی خالی پاتے ہیں جیسا کہ پہلے تھا۔

۱۹۱۶ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمہ ہو رہا تھا اُوس وقت اس دینی اور مذہبی مصیبت کا یعنی مسئلۂ خلافت کا احساس بھی عام مسلمانوں نے نہیں کیا تھا۔ لیڈرانِ مسلم بھی ملکی اور سیاسی بہبود میں اس طرح مُنہمک تھے کہ اس دینی خدمت کی طرف کوئی عملی حصہ نہ لے سکے۔ اسی اَثنا میں بیتُ المقدس، بغدادِ مطہّرہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گیا۔ حَرمین شریفین پر شریفِ مکہ کے پردہ میں انگریزوں کا دخل ہوگیا۔ لیکن مسلمان لیڈر ہندوستان کی خیرخواہی میں جو سَر بگریباں تھے تو پھر اُونہیں سَر اوٹھانا قسم تھا۔

اپنے اُوسی مفاہمہ اور سمجھوتہ کو ہر طرح مخلصانہ اور صادقانہ ثابت کرنے میں ہمہ تن محو و مُستغرق رہے اور اون کی تمام کوششیں اس میں صَرف ہوئیں کہ اہلِ ہنود کو اچھی طرح اس کا یقینِ واثق ہو جائے کہ اگرچہ مسلمان کانگریس میں تیس (۳۰) بتیس (۳۲) برس بعد شریک ہوئے ہیں لیکن طَیِّ منازل میں وہ اولین کانگریسی سے کسی طرح کم نہیں۔

۱۹۱۸ء کی کانگریس، دہلی میں ہوئی۔ مسلمانانِ دہلی اور اَطرافِ دہلی نے جس گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا ہے وہ اُون کی سچائی، راست بازی اور شریفانہ ہم وطنی کا ایک کامل نمونہ تھا۔ اس عرصہ میں جو مُشارکاتِ جُزئیہ اپنے اپنے موقعہ پر ہوتی رہیں اُوسے نظر انداز کرتے ہوئے رُولٹ بل کی طرف دیکھیے۔ اس میں متفقہ اور مشترکہ آواز سے اِظہارِ نارضامندی کرنا اور مسلمانوں کا اپنے آپ کو مِنْ کُلِّ الوُجُوہ ہنود لیڈروں کے ہاتھوں میں سپرد کر دینا، مسلمانوں کے جوشِ اتحاد و یکجہتی کا آئینہ ہے۔

رُولٹ بل پاس ہوگیا۔ سَتِّیا گرہ کی ایجاد ہوئی۔ مسلمانوں نے بڑھ کر لبَّیک کہا۔ اِظہارِ نارضامندی کے لئے ہڑتال کی تحریکیں ہوئیں۔ بلا اختلاف سارے مسلمانوں نے اسے تسلیم کیا۔ اسی موقع پر جب کہ بعض عہدہ دارانِ سرکاری بے احتیاطی اور غلط کاری کر جاتے ہیں اور واقعہ ایک دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے اُوس وقت بھی مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش رہے اور بلا تفریقِ قومیت، ملک کی بہبود میں برابر کے شریک و سہیم رہ کر ملک کے اوپر سے قربان ہوگئے۔

ان واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں نے جو قدم کہ

کانگریس کی طرف بڑھایا تھا وہ محض اِسمی و رَسمی تھا؟

نہیں! اُوس میں عَزم تھا، اُوس میں اِستقلال تھا، اُوس میں اِیثار تھا۔ واقعات نے ثابت کر دیا کہ کسی موقع پر مسلمان اپنے ملکی بھائیوں سے ذَرّہ برابر بھی پیچھے نہ رہے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ کانگریس، مسلمانوں کے متفق و متحد ہو جانے سے بہت کچھ اپنے مقاصد و مطالب میں دَفعتہً کامیاب ہوگئی؟

۱۹۱۷ء میں ریفارم اسکیم کا مِلنا اس اتفاق و اتحاد کا اَوّلین ثَمرہ ہے۔

ہندوستان کے ساتھ جو خصوصیتِ مِلّی اور وطنی کہ اہلِ ہنود کو حاصل ہیں، انہیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق و اتحاد سے کانگریس نے عملاً اپنے مذہبی دیار اور مقدس آثار کو اُوس ذُرْوَۂ کمال تک پہونچا دیا جہاں اسے بَرسوں میں پہونچنا ایک خوابِ خوش گوار تھا۔

اہلِ ہنود کی، ہندوستان سے صرف یہی خصوصیت اور نسبت نہیں ہے کہ وہ یہاں کے باشندے ہیں۔ بلکہ اُون کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُون کے مذہب کا تعلق اسی خاک اور اسی سرزمین سے مخصوص ہے۔ اُون کے مذہبی مقامات، اُون کی مذہبی یادگاریں، اُون کے مذہبی پیشوا، غرض مذہب اور متعلّقاتِ مذہب جو کچھ ہندوؤں کا سرمایہ ہے، سب کچھ اسی خاکِ ہند میں ہے۔ مذہبی حیثیت سے اہلِ ہنود کا کسی گوشۂ عالم سے کوئی تعلق نہیں۔

پس حکومتِ ہند اور فلاحِ ہند میں اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ہندوؤں کا نہ صرف معاشرتی اور تمدنی فائدہ ہے بلکہ مذہبی حیثیت سے ایسی اہم خدمتِ دینی اور سعادتِ مذہبی کا ہندوؤں کو ملنا ہے جس کا عوض اور بدل کچھ اور متصوَّر بھی نہیں ہوسکتا۔

ایسی صورت میں مسلمانوں کا جان و مال سے عملاً اہلِ ہنود کا شریک ہو جانا اور اُون کے پہلو بہ پہلو موت کا پیالہ پینا کیا تشکُّر و اِمتنان کا مستحق نہیں؟

مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ مل کر اون کے مقدس مقامات کے لئے جان تک دے چکے۔ اب اگر چند سَر برآوردہ ہندو صرف زبانی شرکت، مسلمانوں کے مقدّس مقامات کے متعلق کرتے ہیں تو یہ عوض اَز رُوئے انصاف بہت ہی کم ہے۔

مسلمان لیڈر کیوں مسلمانوں کو اس قدر ذلیل اور اُون کے خون کو رائیگاں بتانے کے لئے سرگرم ہیں؟ ایک مسلم کی جان جو قیمت رکھتی ہے اُوس کا اندازہ صرف اس سے کیا جا سکتا

ہے کہ خود اُون کے پیدا کرنے والے نے جب اُون کی جانوں کو طلب کیا ہے تو اوس کا معاوضہ جنت سے کم اُوس مالکُ المُلک اَحکمُ الحاکِمین کی جناب سے بھی نہ قرار پایا۔

کیا یہ آیت مسلمانوں کو یاد نہیں:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِین اَنفُسَھُمْ وَاَمْوالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الجَنَّۃ۔ (تحقیق، اللہ تعالیٰ نے مومنین کی جانوں کو اور مالوں کو جنت کے عوض میں خرید فرمالیا ہے)

ایسی قیمتی جانیں جب سَتیّا گرہ کے موقع پر قربان کی جاچکی ہیں تو کیا ان کا صحیح عوض صرف زبانی ہم دَردی ہے؟

صد افسوس مسلمانوں کی بدبختی اور کس مَپرسی پر کہ ان کی جانوں کی تو قدر نہ کی جائے اور چند ہندوؤں کی زبانی ہمدردی پر مسلمان، شِعارِ توحید اور شِعارِ اسلام قربان کردیں۔

فدائیانِ وطن مسلم اور ہنود کے اتفاق واتحاد کا مقصد تو یہ تھا کہ اَغراضِ سیاسی وملکی میں دونوں قومیں یک زبان ہوکر مطالبہ پیش کریں اور دونوں ہاتھ ایک بن کر انتظامات میں شریک ہوں۔ اس اتفاق کا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا اور نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان، مسلمان نہ رہیں۔

اگر اس صدی کے مسلمانوں کے نزدیک اُون کا دین، اُون کی شاہ راہِ ترقی میں سنگِ راہ ہے تو اُونہیں اس کا اختیار ہے کہ اس صراطِ مستقیم اور اس دینِ قویم سے اپنے کو علیٰحدہ کرلیں۔ اور جو مذہب انہیں دنیاوی تمتُّعات سے مالامال کردے اُوسے اختیار کرلیں۔ لیکن اس کا انہیں اختیار نہیں کہ اپنے کو مسلم اور مومن کہہ کر قوانینِ ایمان اور شریعتِ اسلام میں اِصلاحیں دیں اور ایک مذہبِ مُمزُوج اور ایک دینِ مُرکَّب ایجاد کریں۔

اس نئے دین سے وہ مقدّس اسلام جسے آج سے چودہ سو برس قبل ہمارے پیغمبر رُوحی فِداہ لائے تھے، اپنی بیزاری ظاہر کرتا ہے اور مثل دیگر اَدیانِ باطلہ اسے بھی ایک دینِ باطل کے لقب سے خطاب کرتا ہے۔

مسلمانو! ذرا انصاف سے کام لو۔ تم نے مساجد کی کیسی بےحرمتی اپنے ہاتھوں سے کی ہے؟ کیا مسلمانوں کو یہ مسئلہ معلوم نہیں کہ نجس و ناپاک کا مسجد میں جانا شرعاً سخت ممنوع ہے؟ اہلِ ہنود کے مذہب میں بجز مسلمانوں کے وجود کے اور کوئی شئی نجس نہیں۔ (اور خود) علاوہ

نجاستِ کفر و شرک کے وہ دیگر نجاستِ ظاہری سے آلودہ رہتے ہیں۔

اُونہیں تم مساجد میں لے گئے۔ منبر یا مکبَّرہ جو ساری مساجد کا ایک ممتاز مقام ہے، اُوس پر تم نے ہنود کو جگہ دی۔ تبلیغ و ہدایت کے لئے اُون سے مُصِر ہوئے۔

ذرا ایمان کو سامنے رکھ کر کہنا کہ منبر کس کی جگہ تھی؟ اور اُوس پر سے کس کی صدائے تلقین و تبلیغ بلند ہوئی تھی؟ اور تم نے اس کی عظمت کو کس بے دردی سے پامال کیا؟

ہنود مساجد میں توحید کی آواز سننے اور مُشرِکانہ اعمال کی خطا کاری سمجھنے اور ہدایت پانے کے لئے اگر جاتے یا لے جائے جاتے تو سَہو اور غلط کاری کا ایک بہانہ بھی تھا۔ لیکن خاص خانۂ خدا اور توحید کے مکان میں مبلّغ کی حیثیت سے ہنود کو سربلندی بخشنا، اس صدی کے مُدّعیانِ اسلام کا خاصّہ ہے۔

مسلمان خود مندروں میں گئے۔ مساجد چھوڑ کر وہاں نمازیں پڑھی گئیں۔ دُعائیں مانگی گئیں۔ کیا بُت خانہ میں عبادت کا زیادہ ثواب ہے؟ یا صنم خانہ میں دُعا مقبول ہوتی ہے؟

اس سے زِیادہ ستم تم نے یہ کیا کہ ہندوؤں نے تمہیں چندن کا ٹیکہ لگایا۔ تمہاری جبینِ توحید پر شرک کا قشقہ کھینچا گیا۔ سَتیّا گرہ کے دن مسلمانوں نے مہاتما گاندھی کے حکم سے روزہ رکھا۔ یہ سارے مظالم مسلمانوں نے پاک مذہبِ اسلام پر اس لئے نازل کیے کہ ناراضیِ رُولٹ بِل پر مسلمانوں کا متفقُ اللّسان ہونا ثابت ہوجائے۔

ابھی تک خلافت کمیٹی کی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی۔ ہندوؤں کا زبانی ترانۂ ہمدردی آپ کے کانوں تک پہونچا بھی نہیں تھا۔ لیکن جوشِ اتحاد ہر آن آپ کو مرکزِ توحید سے بعید کر رہا تھا اور جذب کی کشِش ہر لحہ قوی تر ہوتی جاتی تھی۔ چپکے چپکے خاص طبقوں میں اہلِ ہنود کے ساتھ عَقدِ نکاح کی گفتگو شروع ہوگئی۔

آج سے چار برس قبل ایک ''روشن خیال لیڈر'' نے ایک تحریک، صَریح نَصِ قرآن کے خلاف پیش کی تھی۔ اب اُوس کی تائید میں آوازیں اُٹھنے لگیں۔ لیکن وحشتِ عوام کا لحاظ کرتے ہوئے مناکحت کی صَدا دھیمی اور محدود حلقہ میں رکھی گئی۔

وید، اِلہامی کتاب تسلیم کرلی گئی۔ کرشن جی حضرت موسیٰ علیہ السَّلام کا لقب مان لیا گیا۔ ثبوت میں رسالہ لکھا گیا۔ اشاعت کے لئے عوام کا ذرا ایمان واسلام ابھی مانع ہے۔

اس طرح پہلے قدم پر مسلمانوں نے اپنے ملکی بھائیوں کو مشرکین اور بت پرستوں کی صف سے نکال کر اہلِ کتاب کی صف میں لاکر داخل کر دیا۔

علی الاعلان بار بار نہایت پُر زور الفاظ میں یہ اقرار کیا گیا کہ:

سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اس کے بعد جو کچھ بھی ہیں، سو ہیں۔

مادرِ وطن کا خطاب ملکِ ہند کے لئے اور فرزند، سپوت کا لقب اپنی ذات کے لئے مسلمانوں کا تکیۂ کلام بن گیا۔

بدایوں جیسے شہر میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ ایک مقرّر ہندو یہ تحریک پیش کرتا ہے کہ: اس سال رام لیلا مسلمانانِ بدایوں منائیں اور محرم میں تعزیہ داری ہندو کریں گے۔

کسی مسلمان کو یہ توفیق نہیں ہوئی جو کھڑے ہو کر اس کی شناعت از رُوئے مذہب بیان کرتا۔

ہولی کے موقعہ پر خوب مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (یعنی اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے؟) اسے چھوڑ کر ہولی کے رنگ سے کپڑے رنگین کیے گئے۔

غرض اس طرح کی خرافات کا کہاں تک ذِکر کیا جائے؟

ہر جگہ ایک نئی شان ہے۔ اہلِ ہنود پر مسلمان اپنا دین، اپنا مذہب نچھاور کر رہے ہیں۔

لیڈرانِ قوم! آپ ہی ارشاد فرماویں کہ:

یہ اَفعال کیا آپ کا اِضطرار ظاہر نہیں کرتے؟ کیا اِن حرکات سے پراگندگیِ حواس نہیں سمجھی جاتی؟ کیا اِس طرزِ عمل کو آپ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِین کہہ سکیں گے؟ کیا اِن اَعمال کا اِرتکاب دینِ قویم اور مِلّتِ حَنیف کا اِحیا قرار دیں گے؟ کیا اِن اُمور کو حسبِ منشائے تعلیمِ الٰہی اور اِرشادِ مصطفوی آپ ثابت کر سکیں گے؟

حَاشَا و کَلَّا— ہر گز نہیں اور کبھی نہیں۔

جذبات سے خالی ہو کر ذرا غور تو فرمائیے۔ ان شنیع اعمال کی ایک لمحہ جانچ تو کیجیے۔ معیارِ شریعت پر کھرے کھوٹے کو پرکھیے تو سہی۔ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (تو نے اس کو ایک ہلکی بات سمجھا، حالاں کہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی ہے۔)

ٹیکہ ہو یا قشقہ، چندن کا ہو یا زعفران کا، توحید کی پیشانی پر شرک کا داغ ہے۔ حرام ہے اور قطعاً حرام۔ نیز عوام کے ایمان کا خطرہ ہے۔ (قابلِ اِعتماد ذرائع سے یہ خبر سنی بھی گئی کہ کالکا مندر، دہلی کی پوجا میں جوق در جوق مسلمان؟ ہندوؤں کے ساتھ ریوڑی چڑھانے میں شریک تھے اور دیگر مراسم کے ادا کرنے میں قدم بہ قدم۔)

انصاف کیجیے۔ ان ایامِ جنگ میں جب یہ سوزناک خبریں آتی ہیں کہ:

مسلمانوں کی پیشانیوں پر ظالم عیسائیوں نے زبردستی صَلیب کے نشان بنائے۔

تو ہم بے تاب ہو جاتے ہیں کہ:

ہائے افسوس! موَحِّدین پر یہ کیا ستم ہے؟

جبینِ توحید پر تثلیث کی علامت، یہ کیا غضب ہے؟

لیکن ہمیں خبر نہیں کہ جس طرح صَلیب، تثلیث کا شِعار ہے اُوسی طرح ٹیکہ یا قَشقہ شِعارِ کفر و شرک ہے۔

مسلمانو! تم نے مسلکِ توحید کی علانیہ بے حرمتی کی اور طُرفہ یہ کہ پھر تمہیں اس پر ناز بھی ہے۔ گویا ایک بہت بڑی سعادت تھی جو مسلمانوں کو خاکِ ہند نے اب عطا کی ہے۔

یہ ٹیکہ اور قَشقہ نہ تھا بلکہ مادرِ وطن کی طرف سے ایک سندِ فرزندی تھی۔

لیڈرانِ قوم! کیا اَز رُوئے شریعتِ مطہّرہ صَلیب اور قَشقہ میں آپ فرق، جواز اور عدمِ جواز کا ثابت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح اہلِ ہنود کے تہوار اور مذہبی میلہ میں جانا، اُوس کی رونق بڑھانا، آپ جائز ثابت کریں گے؟

ذرا شریعت کی کتابوں سے پوچھیے کہ:

وہ عیدِ اہلِ ہنود کی رونق بڑھانے والے کو کیا کہتی ہیں؟

الحمدُ لِلّٰہ! لیڈرانِ قوم میں بعض اَفرادِ عُلمائے دین بھی شامل ہیں۔ انہیں سے پوچھیے کہ: مذکورہ بالا اُمور، اللہ اور اللہ کے رسول کے فتویٰ سے کیا ثابت ہوتے ہیں؟ اِن اُمور سے آیا مذہب کی حمایت ہوئی یا دین کی بیخ کنی ہوگئی؟

مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اِس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیاتِ دنیا سنوارنے کا طریقہ اُوس سے سیکھیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ اُون

وسائل واَسباب پر انہیں دست رَس ہو، دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔

مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشُّق و شیفتگی کا تھا۔ مسلمان ہمہ تن اُوس میں حُلُول وجَذب ہو جانے کے لئے بیتاب تھے۔

لیڈرانِ قوم نے اُوس وقت نہایت بلند آہنگی سے یہ صُور پھونکا تھا کہ:

اگر باعزت وحُرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جَذب ہو جاؤ۔ مسلم ہستی بذاتِ خود قایم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑو اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔

پھر کیا تھا۔ مسلمانوں کی شکل وصورت، لباس و پوشاک، طرزِ ماندو بود، غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلّی تھی۔ حتیٰ کہ نام تک یورپین تلفظ واملا میں شامل کر لیا گیا۔ ارکانِ اسلام سے بیگانہ وَحشی لَوازِمِ تہذیب وتعلیم قرار پائی۔

اب چند سال سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں نے دوسری کروٹ بدلی تو اس کی تلاش ہوئی کہ اِس مرتبہ کس قوم میں مل کر فنائے کلّی کا مرتبہ حاصل کیا جاے؟ تا کہ رہی سہی علامتِ اسلامی بھی مِٹ جائے۔

بارے اس مرتبہ زیادہ سرگردانی کی نوبت نہ آئی۔ پاس ہی ملک میں ایک قوم ہمسایہ مل گئی۔ نہایت اطمینان سے اُوس میں جَذب ہونا شروع ہو گئے۔

لیڈروں نے پھر اُوسی تلقین کا اِعادہ کیا کہ:

تم ہیچ، تمہارے مذہبی دستورُ العمل ہیچ، تمہارے اَسلاف کے کارنامے ہیچ۔ خبردار! مسلم ہستی کو بذاتِ خود قیام کی کوشش سخت حماقت و بے غیرتی ہے۔

یہ زَرّیں موقعہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ احسان مانو کہ اپنی رہی سہی قومیت مٹانے کے لئے ہمیں دور نہ جانا پڑا، خود اپنے ہمسایہ میں ایک ایسی قوم مل گئی جس میں جَذب ہو کر ہم نیست و نابود ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں نے بھی لیڈروں کی اس تلقین پر لبَّیک کہا۔ اس دور سے پیشتر عیسائیت میں جَذب ہونے کے لئے مسائلِ شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں۔ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطالب میں عجیب وغریب معنی آفرینیوں سے کام لیا گیا۔ اس دورِ جدید

میں ہندوؤں کے لئے وہی باتیں کی جا رہی ہیں۔

مذہب کا بہت بڑا حصہ یورپ پر سے نچھاور کیا جا چکا تھا۔ جو باقی تھا وہ نہایت فیاضی سے ''ایک شریف قوم'' نے پہلے ہی قدم اِتحاد پر قربان کر دیا۔

اب کہ اہلِ ہنود نے زبانی ہمدردی مسئلۂ خلافت میں مسلمانوں سے ظاہر کی ہے۔ ایک دو ہندوؤں نے یہ بھی کہہ دیا کہ: ہم مسلمانوں کے ساتھ سَر دینے کو موجود ہیں۔

ان پُر کیف نغمات پر مسلمان تأسُّف وتحسُّر سے ہاتھ مل رہے ہیں کہ: اب کیا باقی رہا جسے اس کے معاوضہ میں قربان کیا جائے؟

افسوس ہے مسلمانوں کی بدعقلی اور خام کاری پر۔ دنیا طلبی ان پر ایسی چھائی کہ دین کی تباہی اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے۔ اور اس کا اِحساس وشعور تک اُنھیں نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟

مسلمانوں کا حقیقی نَصبُ العین دین و مذہبُ، اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے۔ دنیا ان کے پاس دین کی رونق اور مذہب کی خدمت کے لئے ہے۔

جب دین و مذہب ہی نہ رہا تو:

''ملعون ہے وہ سلطنت جو ایمان کے عوض میں ملے اور صد ہا لعنت ہے اُوس حکومت پر جو اسلام بیچ کر خریدی جائے۔''

(ص: ۱۱۱ تا ص: ۲۰۔ الرَّشاد۔ مؤلّفہ سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ کالج، علی گڈھ۔ ۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء)

اسی طرح کی ایک دوسری جامع تحریر کے اِقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) شروع ہونے کے بعد جس طرح گاندھی کی قیادت میں ہندوؤں کی شرکت واِعانت کے ساتھ تحریکِ خلافت چلائی گئی اس کے مُضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) رقم طراز ہیں:

.........مسلمانوں نے ان مَساعی میں کامیابی کے لئے ضروری سمجھا کہ ہندوؤں کو اپنے ساتھ شریک کریں اور اپنا ہم آواز بنائیں تا کہ ان کی صَدا میں زور آئے اور سلطنت ان

کی درخواست پر کان لگا کر سُنے۔

مذہب کا فتویٰ اس کو ممنوع اور نا جائز نہیں قرار دیتا ہے اور اس قدر رجد و جہد جواز میں رہتی۔ لیکن صورتِ حال کچھ اور ہے۔

ہندو امام بنے ہوئے آگے آگے ہیں اور مسلمان ''آمین'' کہنے والے کی طرح ان کی ہر صَدا کے ساتھ موافقت کر رہے ہیں۔ پہلے مہاتما گاندھی کا حکم ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے مولوی عبد الباری کا فتویٰ مُقلّد کی طرح سرِ نیاز خم کرتے چلا جاتا ہے۔

پہلے تو ہندوؤں نے سُود کے پھندوں میں مسلمانوں کی دولتیں اور جاگیریں لے لیں۔ اب وہ مُفلِس ہوگئے اور کچھ پاس نہ رہا تو مقاماتِ مقدّسہ اور سلطنتِ اسلامیہ کی حمایت کی آڑ میں مذہب سے بھی بے دخل کرنا شروع کر دیا۔'' (ص ۱۵ و ۱۶۔ ماہنامہ اَلسّو ادُ الاعظم، مراد آباد۔ شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

''سلطنتِ اسلامیہ کی اِعانت اور مقاماتِ مقدسہ کی حمایت وحفاظت کے لئے مسلمان ہر ممکن تدبیر عمل میں لائیں۔ لیکن اپنے دین و مذہب کو محفوظ رکھیں۔ اپنے آپ کو ہندوؤں کے ہاتھوں میں نہ دے ڈالیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ اپنی عقل اور حَواس کو معطّل نہ کریں۔ اپنے ہوش وخرد کو کام میں لائیں۔ نہایت فرزانگی کے ساتھ اپنے نیک وبد انجام وحال پر نظر ڈالیں۔

ایسی بے رَائی کہ ہر بات میں گاندھی پر نظر ہے، کچھ کام نہیں آسکتی۔

فرض کرو۔ آج گاندھی تمھارے موافق ہیں اور تم ہر مشورے میں ان کی رائے کے محتاج ہو۔ کل اگر گاندھی کا رَنگ بدل جائے، تم کیا کرو گے؟

یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تم میں کوئی ایک بھی مدبّر نہیں۔ اگر ایسا ہے تو خاموش رہنا چاہیے۔'' (ص ۲۱ ماہنامہ اَلسّو ادُ الاعظم، مراد آباد۔ شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

''ٹُرکی کی سلطنت کی بَقا کے لئے مسلمان کفر کرنے لگیں؟ شعائرِ اسلام کو میٹ دیں؟ **لاحَولَ ولاقُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہ**۔

اسلام ہی کے صدقے میں تو اس سلطنت کی حمایت کی جاتی ہے۔ ورنہ ہم سے اور ٹُرکوں سے واسطہ؟....

مطلب یہ کہ جو کوشش کی جائے اپنا دین محفوظ رکھ کر کی جائے۔'' (ص ۱۷۔ ماہنامہ اَلسّو ادُ الاعظم، مراد آباد۔ شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

''مسلمانوں کی نادانی کمال کو پہنچ گئی۔ نصاریٰ کے ساتھ ہوئے تو اندھے ہو کر موافقت کی۔ بلادِ اسلامیہ میں جا کر لڑے، مسلمانوں پر تلواریں چلائیں، ان کے ملک چھین کر کفّار کو دِلائے۔

اب اس خود کردہ کا علاج کرنے چلے اور مشت بعدِ جنگ یاد آیا تو ہندوؤں کی غلامی میں دین برباد کرنے پر تُل گئے۔''

(ماہنامہ اَلسّو ادُ الاعظم، مراد آباد۔ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

بہر حال! ایک اِستفتا کے جواب میں فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) نے ہندوستان کے دارُ الاسلام اور دارُ الحرب ہونے نہ ہونے کے تعلق سے تحقیقی بحث فرمائی جس کا نام اعلامُ الاعلام بانَّ ہندوستان دارُ الاسلام" محرَّرہ ۱۳۰۶ھ۔ ۱۸۸۸ء (طبع اول ۱۹۲۷ء۔ حسنی پریس۔ بریلی) ہے۔ اس کے اندر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے امامِ اعظم **رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہُ** بلکہ عُلماے ثلٰثہ **رحمۃُ اللّٰہ تعالیٰ علیہم** کے مذہب پر ہندوستان دارُ الاسلام ہے، دارُ الحرب ہر گز نہیں ہے۔ کہ دارُ الاسلام کے دارُ الحرب ہو جانے میں جو تین باتیں ہمارے امامِ اعظم **اِمامُ الاَئمّہ رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عَنہ** کے نزدیک درکار ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں اَحکامِ شرک علانیہ جاری ہوں اور شریعتِ اسلام کے اَحکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اسی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات **بحمدِاللّٰہ** یہاں قطعاً موجود نہیں۔

اہلِ اسلام جمعہ وعیدین واذان واِقامت ونماز با جماعت وغیرہا شعائرِ شریعت بغیر مزاحمت علیٰ الاِعلان ادا کرتے ہیں۔

فرائض، نکاح، رضاع، طلاق، عِدَّت، رَجعت، مہر، نفقہ، حضانت، نسب،

ھبہ، وقف، وصیت، شفعہ وغیرھا بہت معاملاتِ مسلمین ہماری شریعتِ غرّ ابیضا کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں کہ ان اُمور میں حضراتِ علما سے فتویٰ لینا اور اس پر عمل وحکم کرنا حُکّامِ انگریزی کو بھی ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ ہنود و مجوس ونصاریٰ ہوں۔

اور بحمدِاللّٰہ یہ بھی شوکت وجبروتِ شریعتِ علیّہ عالیہ اسلامیہ اَعلیٰ اللّٰہُ تَعالیٰ حِکمَهَا السّامِیۃ ہے کہ مخالفین کو بھی اپنی تسلیم اِتباع پر مجبور فرماتی ہے۔ وَالحمدُلِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِین ۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں سراجِ وھّاج سے نقل کیا:

اِعْلَموا اَنَّ دَارَالحَرْبِ تَصِیرُ دَارَالْاِسلامِ بِشَرطٍ وَاحِدٍ
وَ هُوَ اِظهارُ حُکمِ الْاِسلامِ فِیها۔

جان لو کہ بے شک دارُالحرب ایک ہی شرط سے دارُالاسلام بن جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہاں اسلام کا حکم غالب ہوجائے۔'' (ص:۱۰۵،۱۰۶۔ ج۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس سے آگے مُتعدّد قدیم فقہی کتب کے حوالہ جات سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اپنے مَوقف کو واضح و مدلّل کیا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول کی دوسری تیسری دہائی میں ہندوستان کو دارُالحرب کہہ کر یہاں سے مسلمانوں کی ہجرت کا جو حضرات درس دے رہے تھے وہ در حقیقت ہندوستان سے اسلام کو اَلوَداع کہنے کا شعوری یا غیر شعوری جُرم کررہے تھے۔ اور یہ وہی لوگ تھے جو تحریکِ ترکِ معاملات میں مسئلۂ موالات کی غلط تعبیر وتشریح کرکے اپنی تحریکِ ترکِ موالات کو ''ہندو مسلم اتحاد'' کا ذریعہ بنا کر شعائر واحکامِ اسلام کو کفر کی دہلیز پر قربان کررہے تھے۔

تحریکِ ہجرت کی تاریخ اور ہندوستان سے افغانستان ہجرت کرکے پھر لُٹے پٹے تباہ حال مسلمانوں کی ہندوستان واپسی کی اَلمناک داستان سے واقف ہر انصاف پسند مؤرّخ

بخوبی واقف ہے۔

جس وقت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ہندوستان کو دارُالاسلام کہا اُس وقت اور اُس زمانہ میں ہندوستان کے کسی مُستند عالم ومفتی نے اسے دارُالحرب کہا ہو تو یہ اس کا تفرُّد ہے۔ جمہور عُلَما اسے دارُالاسلام ہی سمجھتے اور کہتے رہے ہیں۔

ہندوستان کے دارُالاسلام یا دارُالحرب ہونے کے تعلق سے ایک اِستفتا کا جواب دیتے ہوئے صدرُالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رضوی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

الجواب:۔ ہندوستان دارُالاسلام ہے۔ اسے دارُالحرب قرار دینا غلطی ہے۔

اس میں اصلاً شک نہیں کہ یہاں زمانۂ دراز تک اسلامی سلطنت رہ چکی ہے۔ اور مستقل طور پر مسلمان بادشاہ حکمراں تھے۔ لہٰذا اس کا پیشتر زمانہ میں دارُالاسلام ہونا یقینی اور مسلَّم ہے۔ پھر یہ ملک مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا اور کفّار کے قبضے میں آ گیا۔

اب سوال پیدا ہوا کہ دارُالحرب ہوگیا یا بدستور دارُالاسلام ہے؟ پس یہ اَمر غور طلب ہے کہ جو ملک دارُالاسلام تھا وہ محض کفّار کے قبضے میں آنے سے ہی دارُالحرب ہوجائے گا یا اس کے لئے کچھ دیگر شرائط بھی ہیں؟

فُقہا تصریح فرماتے ہیں کہ:

(۱) پہلی شرط:۔ اہلِ شرک کے اَحکام جاری ہوں۔ اور اسلام کے اَحکام جاری نہ ہوں۔

(۲) دارُالحرب سے اس کا اِتّصال ہوجائے۔

(۳) کوئی مسلم یا ذِمّی اَمانِ اول پر باقی نہ رہے۔

تنویرُ الابصار متنِ الدُّرُّ المختار میں ہے:

لا تَصیرُ دارُالاسلامِ دارَحَربٍ اِلَّا بِاِجْراءِ اَحکامِ اَھلِ الشِّرکِ۔ وبِاِتِّصالِها

بِدَارِ الحَرْبِ ۔وبِاَنْ لایَبْقٰی فِیھا مُسلِمُ وَذِمِّیٌّ آمِناً بِالْاَمَانِ الْاَوَّ لِ ۔(ص ۲۷۷۔باب المُستأمن ۔کتاب الجِھاد۔جلدِسوم۔تنویرالابصار)

ردُّ المختار میں ہے:قولُہٗ بِاِجْرَاءِ اَحکامِ اَھلِ الشِّرکِ ۔اَی عَلٰی الْاِشتِھارِ ۔واَنْ لایُحکمُ فِیھا بِحکمِ اَھلِ الْاِسلام ۔ھندیة۔

وظاھِرُہٗ اَنَّہٗ لَوْاُجْرِیَتْ اَحکامُ المُسلِمِین واَحکامُ اَھلِ الشِّرکِ لاتکونُ دارَ حَربٍ۔

قولُہٗ بِاتِّصَالِھَا بِدَارِالحَربِ بِاَنْ لَایَتَخَلَّلُ بینَھُمَا بَلدةٌ مِن بِلادِ الْاِسلامِ ۔ھندیة۔

(ردُّ المحتار ۔ایضاً۔)

ہندوستان میں اگر چہ کفروشرک کے احکام جاری ہیں مگر بہت سے احکامِ اسلام بھی جاری ہیں۔نیز دارُالاسلام سے اِس کا اِتصال بھی ہے۔لٰھذا یہ دارُالاسلام ہی ہے۔

ہندوکا قربانی کے معاملے میں یا مساجد کے متعلق کہیں کہیں نزاع کرنااس کو دارُالاسلام سے خارج نہیں کرے گا۔وَاللّٰہ تعالیٰ اَعلم۔(ص۲۲۹و۲۳۰۔فتاویٰ امجدیہ۔جلدِ سوم۔ناشر دائرۃُ المعارف الامجدیہ۔قصبہ گھوسی ضلع مئو۔یوپی۔طبعِ اول ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء)

اسی طرح کے ایک دوسرے اِستفتا (از دھوارجی،کاٹھیاواڑ،محرَّرہ ۲۸/محرم ۱۳۵۹ھ) کے جواب میں حضرت صدرُالشریعہ تحریرفرماتے ہیں:

الجواب:۔اس میں شک نہیں کہ نصاریٰ کی حکومت سے پہلے ہندوستان دارُالاسلام تھا۔مسلمانوں کی یہاں حکومت تھی۔مسلمان بادشاہ تھےاوراسلامی احکام جاری تھے۔

اب چوں کہ یہاں نصاریٰ کی حکومت ہے۔یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

کفّار کی حکومت کی وجہ سے ہندوستان دارُالحرب ہوگیا یا اب بھی دارُالاسلام ہی ہے جیسے پہلے دارُالاسلام تھا؟

فُقَہا کی تصریحات سے اگر یہ ثابت ہو کہ محض کفّار کی حکومت دارُالحرب ہوجانے کے لئے کافی ہو جب تو بےشک دارُالحرب ہوجائے گا۔

اوراگراس کے سوااور باتوں کی بھی ضرورت ہو تو دیکھا جائے کہ وہ باتیں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟

اَئمّہ کے ارشادات کی طرف توجہ دینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ:

جوجگہ دارُالاسلام ہواس کے دارُالحرب ہونے کے لئے فقط اتنی بات ناکافی ہے کہ کفّار کی وہاں حکومت ہوجائے۔بلکہ اس کے ساتھ اور تین چیزوں کی ضرورت ہے:

(۱)اہلِ شرک کے اَحکام علی الْاِعلان جاری ہوں اوراسلامی اَحکام بالکل نہ جاری ہوں۔

(۲)دارُالحرب سےاس کا اِتّصال ہوجائے۔

(۳)کوئی مسلم یا ذِمّی اَمانِ اَوّل پر باقی نہ ہو۔

(فقہی عبارتیں پیش کرنے کے بعد)یعنی ممالکِ اسلامیہ میں سے کسی ملک پر اگر اہلِ حَرب کا غلبہ وتسلُّط ہوجائے۔یا کسی شہر کے سب لوگ معاذ اللہ مُرتد ہوجائیں اوراپنا تسلُّط قائم کرلیں اور کفر کے احکام جاری کرلیں۔یا اہلِ ذِمّہ عہد توڑ کر مسلّط ہوجائیں۔

ان سب صورتوں میں وہ جگہ دارُالحرب نہ ہوگی جب تک وہ تینوں باتیں نہ پائی جائیں جن کا ذکر ہوا۔

(ایک فقہی عبارت پیش کرنے کے بعد)یعنی اَحکامِ اہلِ شرک کے جاری ہونے کا یہ مطلب ہے کہ:

وہ علی الْاِعلان جاری ہوں اوراسلامی حکم بالکل نہ جاری ہوں۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ:

اگر اَحکامِ مسلمین واَحکامِ اہلِ شرک دونوں جاری ہوں تو وہ جگہ دارُالحرب نہیں ہوگی۔

اسی شرطِ اوّل کو اگر دیکھا جائے تو اس سے ثابت ہے کہ:

ہندوستان دارُالاسلام ہی ہے، دارُالحرب نہیں۔ کہ **بحمدہٖ تعالیٰ** اب بھی ہندوستان میں بہت کچھ اَحکامِ اہلِ اسلام جاری ہیں۔ شعائرِ اسلام باقی ہیں۔ اذانیں ہوتی ہیں۔ جمعہ وعیدَین ہوتی ہیں۔ ترکہ ومیراث میں شریعتِ مطہّرہ کے موافق فیصلہ ہوتا ہے۔ وغیر ذالک۔

لھذا اگرچہ یہاں اہلِ شرک کے اَحکام جاری ہیں۔ مگر جب کہ اہلِ اسلام کے احکام بھی جاری ہیں تو بموجب تصریح علامہ سید احمد طحطاوی اور علامہ سید ابن عابدین شامی **رحمۃُ اللّٰہِ تعالیٰ علیہما**، ہندوستان دارُالاسلام ہی ہے۔'' الخ

(ص ۲۳۲ و ۲۳۳۔ فتاویٰ امجدیہ، جلدِ سوم۔ ناشر دائرۃُ المعارفِ الامجدیہ، قصبہ گھوسی ضلع مئو، یوپی۔ طبعِ اول ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء)

اُس زمانے میں ہندوستان کو دارُالحرب کہہ کر مسلمانانِ ہند پر جہاد یا ہجرت کو واجب قرار دینا نہ اسلام کی خیرخواہی تھی نہ مسلمانوں کی، بلکہ یہ حکم کُند چھُری سے مسلمانوں کو ذبح کرنے اور اسلام کو آزار پہنچانے کے مُترادِف تھا۔

اُس دور میں ہندوستان کے دارُالاسلام ہونے اور اسے دارُالاسلام کہنے کا یہ مطلب تھا اور آج بھی اسے دارُالاسلام کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنی اسلامی شناخت کے ساتھ، اپنے اسلامی اصول واحکام پر عمل کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند یہاں کل بھی تھے، آج بھی ہیں اور اِن شاءَ اللّٰہ کل بھی یہیں رہیں گے۔ اپنا تشخّص اور اپنی شناخت ہر حال میں باقی وقائم رکھیں گے اور اسی کے ساتھ اپنی زندگی گذاریں گے۔

یہ سرزمین ہماری ہے جس سے ہم کسی قیمت پر دست بَردار نہیں ہوں گے۔ اس کے چپّے چپّے اور اس کی وادی وکوہسار پر ہمارا پورا پورا حق ہے۔ اس لئے یہ اعلانِ عام ہے کہ:

کبھی شاخ وسَبزہ و بَرگ پر، کبھی غُنچہ وگل وخار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فَصلِ بہار پر

اِعلامُ الْاَعلام بِاَنَّ ہندوستان دارُالاسلام (محرَّرہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء) جس کی پہلی طباعت بشکلِ رسالہ بماہِ مارچ ۱۹۲۷ء، حَسنی پریس، بریلی سے ہوئی، اس میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا اصولی اور جامع مَوقف آپ پڑھ چکے ہیں۔

دَوَامُ العَیش فِی الْاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے وصال ۱۹۲۱ء کے بعد ۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں حَسنی پریس، بریلی سے شائع ہوئی۔ جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

''سلطنتِ علیّہ عُثمانیہ **اَیَّدَھَا اللّٰہُ تَعَالیٰ**، نہ صرف عثمانیہ، ہر سلطنتِ اسلام، نہ صرف سلطنت، ہر جماعتِ اسلام، نہ صرف جماعت، ہر فردِ اسلام کی خیرخواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں شرطِ قرشیت ہونا کیا معنی؟

دل سے خیرخواہی ہر مسلمان پر فرض ہے اور وقتِ حاجت دُعا سے اِمداد واِعانت بھی ہر مسلمان کو چاہیے۔ کہ اس سے کوئی عاجز نہیں۔

اور مال یا اَعمال سے اِعانت فرضِ کفایہ ہے۔ اور ہر فرض بقدرِ قدرت، ہر حکم بشرطِ اِستطاعت۔

.... مُفلِس پر اِعانتِ مال نہیں، بے دست وپا پر اِعانتِ اَعمال نہیں، وَلِھٰذا مسلمانانِ ہند پر حکمِ جہاد وقتال نہیں۔

بادشاہِ اسلام اگرچہ غیر قرشی ہو، اگرچہ کوئی غلام حبشی ہو، اُمورِ جائزہ میں اس کی اِطاعت تمام رعیّت، اور وقتِ حاجت اس کی اِعانت بقدرِ اِستطاعت سب اہلِ کفایت پر لازم ہے۔

البتّہ اہلِ سُنّت کے مذہب میں خلافتِ شرعیہ کے لئے ضرور شرطِ قرشیت ہے۔ اس بارے میں **رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسَلَّم** سے متواتر حدیثیں (مَروِی ومَنقول) ہیں۔ اسی پر صحابہ کا اِجماع، تابعین کا اِجماع، اہلِ سُنّت کا اِجماع ہے۔

اس میں مخالف نہیں مگر کچھ خارجی یا معتزلی۔ کتبِ عقائد وکتبِ حدیث وکتبِ فقہ

اس سے مالا مال ہیں۔

............اَقولُ وبِاللّٰہِ التَّوفِیق ۔اسم خلافت میں یہ شرعی اصطلاح ہے، جُملہ صدیوں میں اسی پر اِتفاقِ مسلمین رہا۔'' الخ (ص:۱۷۴، فتاویٰ رضویہ مترجَم، ج ۱۴۔ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

حکومت وسلطنتِ تُرکی کی حمایت واِعانت کے سلسلے میں عُلماے اہلِ سُنّت کا واضح مَوقِف یہ تھا کہ:

''اگر چہ سلطانِ تُرکی بوجہ فُقدانِ شرطِ قرشیت، شرعی اصطلاحی خلیفہ نہیں تاہم سلطنتِ تُرکی کی حفاظت واِعانت ہر مسلمان پر بقدرِ اِستطاعت فرض ہے۔

عالَمِ اسلام اور وسیع وعریض سلطنتِ تُرکی میں واقع مقاماتِ مقدّسہ اور مآثرِ شریفہ کی حفاظت وصیانت ہر مسلمان کا اوّلین فریضہ ہے۔مگر اِستطاعت شرط ہے۔''

تفصیل وتحقیق کے لے تحریکِ خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات کے دور کی مطبوعہ مندرجہ ذیل کتب ورسائل کا مطالعہ فرمائیں:

(۱)**دَوَامُ العَیش فی اَلاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش** ۔(۱۳۳۹ھ) مؤلّفہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی۔مطبوعہ بریلی۔

(۲)بَرکاتِ مارَہرہ ومہمانانِ بدایوں (۱۳۴۰ھ) مؤلّفہ سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی۔مطبوعہ حسنی پریس، بریلی۔

(۳)**طُرُقُ الھُدیٰ والاِرْشاد اِلیٰ اَحکامِ الْاِمارۃِ والجہاد** ۔(۱۳۴۱ھ) مؤلّفہ مولانا مصطفیٰ رضا نوری بریلوی۔مطبوعہ بریلی

۱۸۸۸ء میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ایک اِستفتا کے جواب میں ہندوستان کو دارُالاسلام کہا اور اعــــلامُ الاعــــلام تحریر کیا جس کی طباعت آپ کے وصال (۱۹۲۱ء) کے تقریباً سات (۷) سال بعد (۱۹۲۷ء میں) ہوئی۔

اس کے اندر ہندوستان کے دارُالاسلام ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ یہاں اَحکام وشعائرِ اسلامیہ پر پابندی نہیں، نہ ہی انھیں پامال کر کے یہاں مسلمانوں پر اعلانیہ احکامِ شرک جاری ہیں۔

یہ اَساسِ حکم ہے جو شریعتِ اسلامیہ واصولِ فقہ کے مطابق ہے۔اسی طرح اُس دور میں آپ کے وصال تک مسلمانانِ ہند پر حکمِ جہاد نہیں تھا۔کیوں کہ اُن کے اندر قدرت و اِستطاعتِ جہاد نہیں تھی۔

تاجُ العلما مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء) فرماتے ہیں:

''کون کہتا ہے کہ جہاد فرض نہیں؟ لیکن اس کے لئے اپنی طاقت کا دیکھنا بھی تو شرط ہے؟ ہم نے ہتھیار تو خواب میں بھی نہیں دیکھے۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ بندوق کدھر سے چلائی جاتی ہے؟ الخ (ص:۲۴، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم، مرادآباد، شمارہ شوال ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

یہ مسئلہ بھی کہ: جن ایام وحالات میں قدرت واِستطاعتِ جہاد نہ ہو اور جہاد کی شرطیں نہ پائی جائیں، مسلمانوں پر جہاد فرض نہیں۔عین مطابقِ شریعت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دور میں عُلماے ہند میں سے کسی بھی مُستند فقیہ ومفتی نے ہندوستان کے دارُالحرب ہونے اور اس میں جہاد فرض ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔اور اگر کسی نے اس دور میں فرضیتِ جہاد کا فتویٰ دیا ہوتو وہ اصولاً صحیح نہیں اور نا قابلِ عمل بھی تھا۔

اِن دونوں باتوں کو ایک ساتھ سمجھنے سمجھانے کے لئے آزاد ہندوستان کی یہ تاریخ سامنے رکھیے کہ:

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ہزاروں مساجدِ پنجاب وغیرہ مشرکینِ ہند کے قبضے میں چلی گئیں۔ہزاروں مسلمان

عورتوں کی عصمت دری وآبروریزی ہوئی۔اس دورِ وحشت اثر کے بعد بھی سالہا سال
تک ہزاروں ہندومسلم فسادات میں بے شمار مسلمانوں کی جان و مال کی تباہی اور ان کی
عزت و ناموس کی بربادی ہوتی رہی۔اور ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندوستانی کورٹ و گورنمنٹ و
پولیس وملٹری کے سامنے بابری مسجد شہید کی گئی اور ملک بھر میں مسلمانوں کا وَحشیانہ قتلِ
عام اور ان کی خوں ریزی ہوئی۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں صرف صوبۂ گجرات کے اندر
نریندر مودی کی حکومتِ گجرات کی شہ پر تین چار ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے۔

ایسے سنگین ایام و اوقات میں بھی ہندوستان کے کس طبقہ اور کس مسلک کے عُلما نے
ہندوستان کو دارُالحرب قرار دیا؟ اور اس کے اندر جہاد فرض ہونے یا یہاں سے ہجرت
کر جانے کا فتویٰ دیا؟؟؟

حلقۂ دیوبند کے قطبُ الاقطاب و امامِ ربّانی مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ/
۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''ہند کے دارُالحرب ہونے میں اختلاف عُلماء کا ہے۔ بظاہر تحقیق حال، بندہ کو خوب
نہیں ہوئی۔حسب اپنی تحقیق کے سب نے فرمایا ہے اور اصل میں کسی کو خلاف نہیں۔اور بندہ
کو بھی خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔فقط۔ واللّٰہُ تعالیٰ اَعلم۔'' (ص ۵۰۵۔
فتاویٰ رشیدیہ، مکتبہ تھانوی، دیوبند)

سوال: ہندوستان دارُالحرب ہے یا دارُالاسلام؟ مدلّل اِرقام فرمائیں۔

الجواب ''دارُالحرب ہونا ہندوستان کا مختلف عُلمائے حال میں ہے۔اکثر
دارُالاسلام کہتے ہیں اور بعض دارُالحرب کہتے ہیں۔بندہ اس میں فیصلہ نہیں کرتا۔'' فقط واللّٰہُ
اَعلم (ص:۷۔جلدِ اول۔فتاویٰ رشیدیہ۔کتب خانہ رحیمیہ دہلی۔و ص ۸۔فتاویٰ رشیدیہ۔
مطبوعہ میر محمد کتب خانہ۔کراچی)

حلقۂ دیوبند کے حُجّۃُ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) گومگو اور
تردُّد کی کیفیت میں ہیں۔رُجحان دارُالحرب کی طرف ہے مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ:
''ہجرت کے معاملے میں دارُالحرب اور سُود کے معاملے میں دارُالاسلام قرار دینا

چاہیے۔'' (خلاصۂ مفہوم۔ص:۱۷۳و۳۶۲۔از قاسم العلوم، مطبوعہ لاہور)

حلقۂ دیوبند کے حکیمُ الاُمّۃ مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء) فرماتے ہیں:
''عموماً دارُالحرب کا معنیٰ غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں حَرب واجب ہو۔سُو اِس معنی
میں تو ہندوستان دارُالحرب نہیں۔کیوں کہ یہاں بوجہ معاھدہ کے، حَرب درست نہیں۔''
(ص:۱۴۷۔بابِ اول۔ملفوظ ۶۱۴۔کمالاتِ اشرفیہ، مطبوعہ ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، تھانہ بھون)

بینک سے لین دین کے منافع کو سُود قرار دیتے ہوئے انیسویں صدی کے بالکل آخر
میں مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے ۱۸۸۷ء میں تَحذیرُ
الاُخوَان عَنِ الرِّبٰوفِی الھندوستان (مسوّدہ صفر ۱۳۰۵ھ۔مبیّضہ رمضان ۱۳۰۷ھ) لکھا
جوان کی زندگی ہی میں شائع ہوا۔تَحذیرُ الاِخوَان کے اندر دارُالاسلام اور دارُالحرب کی
بحث کرتے ہوئے مولانا تھانوی لکھتے ہیں:

''اور ہندوستان نہ تو صاحبین کے قول پر دارُالحرب ہے۔کیوں کہ
اگرچہ احکام، شرک کے اس میں علیٰ الاِعلان جاری ہیں لیکن اَحکام،
اسلام کے بھی بلاخوف وخطر مُشتہر ہیں۔اور دونوں کے باقی رہنے
سے دارُالحرب نہیں ہوتا۔

اور نہ امام صاحب کے قول پر دارُالحرب ہے۔کیوں کہ اجرائے
اَحکامِ کفر بہ تفسیرِ مذکور یہاں نہیں بلکہ بدستور اَحکامِ اسلام جاری
ہیں اور ایسی صورت میں دارُالحرب نہیں ہوتا۔'' (ص:۸۔ تحذیرُ
الاِخوان عَنِ الرِّبٰو فی الھندوستان از مولانا اشرف علی
تھانوی۔اشرف المطابع، تھانہ بھون)

پھر انقلابِ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں ایک شُبہ کا اِزالہ کرتے ہوئے مولانا تھانوی
لکھتے ہیں:

''شاید کسی کو شُبہ ہو کہ غدر سے تو امانِ اول باقی نہیں رہا بلکہ عہدِ ثانی
کی ضرورت ہوئی۔

اول تو یہ بات غلط ہے۔غدر میں صرف باغیوں کو اندیشہ تھا۔عام

رعایا سرکار سے بالکل مطمئن تھی۔

دوسری سَلّمْنا غایت سے غایت یہ ہوگا کہ:

بعض کے لئے امانِ اول باقی ہے بعض کے لئے امانِ ثانی۔ یہ بھی مثل دونوں اِجراؤں یا دونوں اِتصالوں کے ہوگا اور ترجیح دارُالاسلام کو دی جائے گی۔

اوراگر بِالفَرضِ و التَّقدِیر اس صورت میں دارُالحرب بھی ہوگیا تب بھی دارُالحرب اِجراے احکامِ اسلام مثلِ جمعہ وعید سے دارُالاسلام ہوجاتا ہے۔

فی الدُّرِّ المُختار: وَ دارُالحَرب تصیرُدَارَالْاِسلام بِاِجراءِ اَحکامِ اَھلِ الْاِسلام فیھا کَجُمعۃٍ و عِیدٍ۔ اِن بَقِیَ فِیھا کَافِرٌ اَصلیٌّ و اِن لَّم تَتَّصِلُ بدَارِالاسلام۔ اس صورت میں بھی ہندوستان دارُالاسلام ہوگا۔'' (ص:۹۔ تَحذِیرُ اَلاِخوان عنِ الرِّبٰو فی الھندوستان ۔از مولانا اشرف علی تھانوی۔اشرف المطابع ،تھانہ بھون)

''پس تعجب ہے کہ بعض اھلِ اسلام ہندوستان کو دارُالحرب قرار دے کر آمدنیِ بینک کو حلال سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ لے کر خود نہیں کھاتے ، دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے پہلے سے بُرا ہے۔'' (ص:۔۱۰۔تَحْذِیرُ الْاِخْوَان ازمولانا تھانوی)

ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی لکھنوی (متولد ذوالقعدہ ۱۲۶۴ھ/ اکتوبر ۱۸۴۸ء۔ متوفی ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/ دسمبر ۱۸۸۶ء۔ فرزندِ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی (متولَّد شعبان ۱۲۳۹ھ/ اپریل ۱۸۲۴ء۔متوفی شعبان ۱۲۸۵ھ/ دسمبر ۱۸۶۸ء) لکھتے ہیں کہ:

''بلادِ ہند جو قبضۂ نصاریٰ میں ہیں، دارُالحرب نہیں ہیں۔'' (ص ۳۰۲۔ جلدِ اول فتاویٰ عبدالحیٔ فرنگی محلی ۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ)

واضح رہے کہ سب سے پہلے سراجُ الھند حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی (وصال

۱۲۳۹ھ/ ۲۴۔۱۸۲۳ء) نے ہندوستان کے دارُالاسلام و دارُالحرب ہونے کے مسئلے پر فُقہاے اَحناف کے تین اقوال تحریر کیے اور تیسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''وہمیں قولِ ثالث را محقِّقین ترجیح دادہ اند۔ وبریں تقدیر معمولۂ انگریزاں واشباہِ ایشاں لاشُبہ دارالحرب است''۔ (ص:۱۱۰۔جلد اول فتاویٰ عزیزی۔ مطبع مجتبائی۔ دہلی)

اپنے وقت میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی نے ۱۸۰۳ء کے چند سال بعد برطانوی سامراج کے پنجۂ اِستبداد میں پھڑ پھڑاتے اور شعائرِ اسلام کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر ہندوستان کے دارُالحرب ہونے کو ترجیح دی اور انہیں کے تلمیذِ رشید علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی سامراج اور غاصب وقابض انگریزوں کے خلاف جامع مسجد دہلی میں تقریر کی اور فتواے جہاد دِیا جس پر اس وقت کے مشہور عُلما کی تحریری تصدیقات ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے اس وقت کے عُلماے کرام نے متعدِّد فتاویٰ اس کے علاوہ بھی جاری کیے۔ ایک فتویٰ پر حضرت مفتی صدرالدین آزردہ ، صدرُالصُّد ور دہلی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) شاگردِ شاہ عبدالعزیز محدِّث دہلوی کا بھی دستخط ہے۔مزید فتاویٰ بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زبانی وتحریری طور پر جاری ہوئے۔جن میں مفتی عنایت احمد کاکوری (وصال شوال ۱۲۷۹ھ/اپریل ۱۸۶۳ء) ومولانا سید کفایت علی کافیؔ مرادآبادی (وصال ۱۲۷۴ھ/مئی ۱۸۵۸ء) ومفتی مظہر کریم دریابادی (وصال ۱۴/اکتوبر ۱۸۷۳ء) کے تحریری فتاویٰ شامل ہیں۔عُلماے اہلِ سُنَّت کے یہ فتاویٰ انقلابِ ۱۸۵۷ء کے پیشِ نظر بالکل صحیح اور درست تھے۔

تاریخی ریکارڈ کے مطابق مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ بتاریخ ۲۳/نومبر ۱۸۷۰ء میں مولانا کرامت علی جون پوری (خلیفۂ سید احمد رائے بریلوی متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے اپنی تقریر میں کہا:

''مملکتِ ہندوستان بِالفعل پادشاہِ عیسائی مذھب کے قبضہ و اِقتدار میں ہے۔مطابق فقہِ حنفی کے دارُالاسلام ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔'' (ص:۳۰۔ اسلامی مذاکرۂ علمیہ کلکتہ۔ مطبع نولکشور۔ لکھنؤ)

عُلماے حرمین سے بھی تقریباً ۱۸۷۰ء میں اسی سلسلے میں اِستفتاء ہوا جس کے جواب

میں انھوں نے لکھا کہ:

''محض غیر مسلم کے ہاتھ میں ملک کے چلے جانے سے نہیں بلکہ کل یا اکثر اَحکام اسلام کے اِجرا اور ان پر عمل کرنے میں خَلَل واقع ہونے سے کوئی دارُالاسلام، دارُ الحرب ہوتا ہے۔''

اسی طرح کا جواب شیخ جمال بن عبداللہ مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ و شیخ احمد بن زینی دحلان مفتی شافعیہ مکہ مکرمہ نے دیا۔ (ص ۳۹۔ مذاکرۂ علمیہ کلکتہ۔ مطبوعہ لکھنؤ)

جولائی ۱۸۷۰ء میں ایک فتویٰ دیا گیا کہ اَحکامِ اسلام پر عمل کی آزادی کی وجہ سے ہندوستان میں جہاد ناجائز ہے۔ اس فتویٰ پر مندرجہ ذیل حضرات کے دستخط و مہر ثبت ہیں:

مولوی محمد علی لکھنوی، مولوی عبدالحیٔ لکھنوی، مولوی فیض اللہ لکھنوی، مولوی محمد نعیم لکھنوی، مولوی قطبُ الدین لکھنوی، مفتی سعدُ اللہ لکھنوی، مولوی لطفُ اللہ رام پوری، مولوی غلام علی رام پوری۔ (ص: ۲۱۷۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ترجمہ از صادق حسین۔ ناشر الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی ۲۵۔ مطبوعہ ۲۰۰۲ء)

غیر مقلّد محدّث مولانا نذیر حسین بہاری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے بارے میں اُن کے سوانح نگار مولانا فضلِ حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے ہندوستان کو کبھی دارُالحرب نہ کہا۔'' (۱۳۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ از فضل حسین بہاری۔ مکتبۂ شعیب، کراچی)

غیر مقلّد عالم و مصنّف نواب صدیق حسن بھوپالی (متوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

''پس فکر کرنا ان لوگوں کا جو اپنے حکمِ مذہبی سے جاہل ہیں اِس اَمر میں کہ برٹش حکومت مِٹ جاوے اور یہ امن و امان جو آج حاصل ہے، فساد کے پردے میں جہاد کا نام لے کر اٹھا دیا جائے، سخت نادانی و بے وقوفی کی بات ہے۔

بھلا ان عاقبت نااندیشوں کا چاہا ہوگا یا اس پیغمبرِ صادق کا فرمایا ہوگا جس کا کہا ہُوا آج ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔'' (ص ۷۔ ترجمانِ وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبع محمدی، لاہور، مطبوعہ ۱۳۱۲ھ)

''حنفیہ جن سے یہ ملک بھرا پڑا ہے، ان کے عالموں اور مجتہدوں کا تو یہی فتویٰ ہے کہ یہ

دارُالاسلام ہے اور جب یہ ملک دارُالاسلام ہو تو پھر یہاں جہاد کرنا کیا معنی؟ بلکہ عَزمِ جہاد ایسی جگہ ایک گناہ ہے بڑے گناہوں سے۔'' (ص ۱۵۔ ترجمانِ وھابیہ از نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبع محمدی، لاہور)

''اس مقام پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان دارُالحرب ہی ہو تو بھی حُکّامِ انگلشیہ کے ساتھ جو یہاں کے رئیسوں کا عہد اور صلح ہے اس کا توڑنا بڑا گناہ ہے۔'' (ص ۲۶۔ حوالۂ مذکورہ)

لفظِ ''وھابی'' کی جگہ ۱۸۸۸ء میں حکومتِ انگلشیہ سے ''اھلِ حدیث'' نام رجسٹرڈ کرانے والے معروف غیر مقلّد عالم و صحافی و وکیل مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) لکھتے ہیں:

''جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہو وہ شہر یا ملک دارُالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو اور اَقوامِ غیر نے اس پر تغلُّب سے تسلُّط پالیا ہو تو جب تک اس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی ہے وہ بحکمِ حالتِ قدیم دارُالاسلام کہلاتا ہے۔'' (ص: ۱۹۔ **اَلاِقتِصاد فی مسائلِ الجِهاد** از محمد حسین بٹالوی۔ وکٹوریہ پریس، لاہور)

مرکزی خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) کے بانی حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) اپنے ایک خط مطبوعہ اخبارِ مشرق گورکھپور مؤرخہ ۶/مئی ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کو دارُالاسلام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ہم لوگ ہندوستان کو دارُالاسلام سمجھتے ہیں اور اِعزازِ دین و اِعلائے کلمۃ الحق کی نیت سے قیام کیے ہوئے ہیں۔ اس واسطے ہجرت فرض نہیں جانتے مگر جب چارہ نہ ہو'' الخ۔ (ص ۱۳۸۔ تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبع دوم ۱۹۹۷ء)

سلطنتِ عُثمانیہ کے وارثین یعنی عُثمانی سلاطینِ تُرکی جب غفلت و سستی، خودغرضی و تنگ نظری اور حرصِ جاہ و مال کے ہاتھوں مجبور ہوکر دست بگریباں ہونے لگے اور دنیا کی نام

نہادمتمدّن حکومتوں، بالخصوص برطانیہ کی نگاہیں ان کی طرف تیز ہونے لگیں تو رفتہ رفتہ تُرکوں پر گرفت مضبوط کر کے ظلم واِستبداد کے پہاڑ اُن پر توڑے جانے لگے اور اُن کی سلطنت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہو گیا جس کے نتیجہ میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں، اَربوں روپے کی مالی ومعاشی تباہی و بربادی ہوئی۔

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں تُرکوں نے پوری طاقت اور اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ حصہ لیا تھا اور ایک عالمگیر شورش برپا ہوئی تھی۔اس کے بعد جب انگریزوں کی سازش سے تُرکی کے اندر خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوئے تو ۱۹۱۹ء میں سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت واِعانت کے لئے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) نے ''مرکزی خلافت کمیٹی'' کی داغ بیل ڈالی جس نے مسلمانانِ ہند کے درمیان عجیب وغریب جوش وخروش پیدا کر دیا تھا۔اور ہر طرف اس تحریک کا شور وہنگامہ نظر آنے لگا۔فرنگی محل لکھنؤ سے وابستہ مولانا محمد علی جوہر ومولانا حسرت موہانی نے اس تحریک کی کامیابی کے لئے ملک بھر کے دورے کیے۔

اور بعض عُلمائے اہلِ سُنَّت مثلاً مولانا عبدالماجد قادری بدایونی ومولانا نثار احمد کانپوری ومولانا معین الدین اجمیری ومولانا شاہ محمد فاخرالہ آبادی ومولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی نے بھی اس تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) میں قائدانہ حصہ لیا۔

علاوہ ازیں مفتی کفایت اللہ دہلوی ومولانا حسین احمد مدنی ومولانا ابوالکلام آزاد و حکیم اجمل خاں وڈاکٹر مختار احمد انصاری وشوکت علی اور مختلف طبقات کے بہت سے عُلما و مسلم قائدین بھی اس میں شامل ہو گئے اس لئے ان کے اثر سے تحریکِ خلافت نے کافی وسعت اور جذباتی شِدَّت اختیار کر لی۔

عُلمائے بدایوں، حضرت مولانا عبدالماجد عثمانی قادری بدایونی (وصال ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء) حضرت مولانا عبدالقدیر عثمانی قادری بدایونی (وصال ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء) حضرت مولانا عبدالحامد قادری بدایونی (وصال ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء)

اور بعض خُلَفائے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)۔ مثلاً حضرت مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی (وصال ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) حضرت مولانا نذیر احمد

خجندی میرٹھی (وصال ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) مبلّغِ اسلام مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (وصال ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کی شرکت نے خصوصیت کے ساتھ تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) کو تقویت پہنچائی اور اس کے عروج وفروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

حضرت مولانا معینُ الدین اجمیری (وصال محرم ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) اس تحریک کے اہم قائدین میں تھے۔

حضرت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی مِلّی تحریکات میں پیش پیش رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمود احمد قادری رفاقتی مظفرپوری آپ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''مولانا کی ملکی وقومی خدمات تادیر دِلوں کو رُلائے گی۔مولانا شاہ محمد عبدالباری فرنگی محلی نے حفاظتِ کعبہ کے لئے جب ''خُدَّامِ کعبہ'' (دسمبر ۱۹۱۲ء) کے نام سے مجلس قائم کی تو سب سے پہلے بدایوں حضرت مولانا شاہ عبدالمقتدر بدایونی کی خدمت میں پہنچے اور تعاون وہمدردی کی درخواست کی۔مولانا عبدالماجد بدایونی بحکمِ پیرومُرشد ''خُدَّامِ کعبہ'' کی خدمت پہ مامور ہوئے۔

۲۲۔ ۱۹۱۹ء میں لالہ لاجپت رائے اور شردھانند کی کوششوں سے مَلکانوں میں اِرتداد کی مُہم شروع ہوئی تو دیگر عُلمائے اہلِ سُنَّت کے ساتھ آپ نے بھی رمضانُ المبارک میں جب کہ گرمی شباب پر ہوتی، مَلکانوں کو اِرتداد سے بچانے کے لئے پیدل سفر کیے۔عمر کا بیشتر حصہ سفر میں گذارا۔

پیرومُرشد حضرت مولانا شاہ عبدالمقتدر عُثمانی بدایونی قُدِّسَ سِرُّہ' کی معیت وہمرکابی میں بغدادِ مقدس کا سفر کیا اور حجازِ مقدس حاضر ہوئے۔'' الخ۔

(ص ۱۴۷۔تذکرۂ عُلمائے اہلِ سُنَّت۔مؤلّفہ مولانا محمود احمد قادری۔مطبوعہ کان پور۔۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء)

حضرت مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کے تعارف میں مولانا اُسَید الحق محمد عاصم القادری بدایونی لکھتے ہیں:

''مولانا نے اپنے زمانے کی تمام اہم قومی ومِلّی اورسیاسی تحریکوں میں حصہ لیا اور قائدانہ کردار ادا کیا۔مجلسِ خُدَّامِ کعبہ (۱۹۱۲ء) خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) جمعیۃُ العُلما

(۱۹۱۹ء) تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) تحریکِ تبلیغ (۱۹۲۲ء) تحریکِ تنظیم (۱۹۲۴ء) مسلم کانفرس (۱۹۲۹ء) ہر تحریک میں ایک فعّال کارکُن، مُشیر خصوصی مخلص کارگذار، اور اس تحریک کے مبلّغ وواعظ کے طور پر شریک رہے۔ مدتوں صوبائی خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رُکن رہے۔

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء۔ مضمون ''مولانا عبدالماجد بدایونی''۔ بقلم ڈاکٹر شمس بدایونی)

سید سلیمان ندوی مولانا کے قائدانہ کردار کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خُدّام کعبہ، طرابلس، بلقان، کان پور، خلافت، کانگریس، تبلیغ، مسلم کانفرنس، یہ وہ تمام مجالس ہیں جو ان کی خدمات سے گراں بار ہیں۔'' (ماہنامہ معارفِ، اعظم گڑھ۔ شمارہ جنوری ۱۹۳۲ء۔ بقلم سید سلیمان ندوی)

مولانا عبدالماجد بدایونی نے خلافت کمیٹی کے اجلاسِ بمبئی، اِجلاسِ ناگ پور اور اِجلاسِ کلکتہ سمیت کئی جلسوں کی صدارت کی۔

مجلسِ خلافت نے شریف حسین اور ابنِ سعود کے تنازع کا جائزہ لینے اور ان کے درمیان تصفیہ کا ماحول پیدا کرنے کے لئے ایک وفد حجاز بھیجا۔ جس میں مولانا عبدالماجد بدایونی بھی ایک اہم رُکن کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اور حجاز و مصر کا دورہ فرمایا۔''

(ص ۱۱۱و۱۲۱۔ تعارف بعنوان ''مولانا عبدالماجد بدایونی شخصیت اور خدمات۔ بقلم مولانا اُسَیدُ الحق قادری بدایونی۔ مشمولہ ''فلاحِ دارین'' مؤلّفہ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ مطبوعہ تاج الفحول اکیڈمی، بدایوں۔ ذوالقعدہ ۱۴۲۹ھ/نومبر ۲۰۰۸ء)

........سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''جماعتِ عُلما میں یہی ایک ہستی تھی جس کی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی کسی وقت چین نصیب نہ ہوا۔ ہر وقت اور ہر نفس ان کو کام کی لگن لگی ہوئی تھی۔ آرام، چین، اہل وعیال اور جان ومال ہر چیز قربان تھی۔'' الخ (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ شمارہ جنوری ۱۹۳۲ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر ''سچ'' لکھتے ہیں:

''جس تحریک میں شریک ہوئے، دل وجان، شغف وانہماک، مستعدی وسرگرمی

سے شریک ہوئے۔ جس کام کو ہاتھ لگایا اس میں جان ڈال دی۔'' الخ (''سچ'' ۲۵ نومبر ۱۹۳۱ء)

''ادھر جمعیۃ عُلماے ہند نے کانگریس میں شمولیت کا اعلان کردیا اُدھر بعض عُلما نے کانگریس سے سیاسی نظریات میں اختلاف کی وجہ سے جمعیۃ سے علیحدگی اختیار کر کے دوسری جمعیۃ علماے ہند کی تشکیل شروع کردی۔

مولانا خواجہ نظام الدین بدایونی نے تحریر کیا ہے کہ:

علی برادران، مولانا حسرت موہانی، حضرت اَقدس مولانا عبدالقدیر بدایونی اور حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی جیسے رہنمایانِ آزادی جمعیۃ سے دور ہوتے گئے۔ اور جمعیۃ عُلماے کان پور مقابل میں رُونما ہوئی۔

حضرت اقدس (مولانا شاہ عبدالقدیر بدایونی) جو صوبہ جمعیۃ کے صدر تھے، حضرت مولانا عبدالماجد بدایونی، حضرت مولانا نثار احمد صاحب کان پوری اور حضرت مولانا شاہ فاخر الہ آبادی کے بعد جمعیۃ علما کان پور کے صدر تجویز کیے گئے۔'' ختم شد اِقتباس از مضمون مولانا اُسَیدُ الحق بدایونی۔ مشمولہ ''فلاحِ دراین'' مطبوعہ بدایوں ۲۰۰۸ء۔

حضرت مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی کے تعارف میں مولانا محمود احمد قادری رفاقتی مزید لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے خلاف لڑائی میں کافی حصہ لیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید فضلُ الحسن حسرت مولانا ہانی، مولانا سید مصباح الحسن قُدِسَتْ اَسْرَارُھُم آپ کے رُفقاے خصوصی تھے۔ کاکوری کے مشہور کیس کی آپ نے پوری رہنمائی کی۔

مولانا قطبُ الدین عبدالوالی فرنگی محلی کے ساتھ صوبۂ سرحد کا دورہ کیا۔ انگریزی حکومت کی دست درازی سے دیسی ریاستوں کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے لاہور میں کل ہند کانفرنس بلائی اور خطبۂ صدارت پڑھا۔

مسجد شہید گنج (لاہور) کے لئے حضرت مولانا سید جماعت علی شاہ علی پوری نے جدوجہد کی تو آپ نے ان کی پوری مدد کی۔

انگریزوں نے عرب اکثریت کا توازن برباد کرنے کے لئے ارضِ مقدس میں باہر

سے لاکر یہودیوں کو آباد کرنا شروع کیا اور عربوں نے ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے آپ نے ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے فلسطین کا سفر کیا۔

مفتیِ اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے عربی یونیورسٹی کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا تو ان کے ترجمان وسکریٹری کا کام کیا۔

سیاسی حالات کی اَبتری کا مشاہدہ کر کے ایک عمر صَرف کرنے کے بعد کنارہ کش ہوگئے۔'' الخ۔

(ص ۱۵۰۔ تذکرۂ عُلمائے اہلِ سُنّت۔ مؤلّفہ مولانا محمود احمد قادری۔ مطبوعہ کان پور)

حضرت مولانا عبدالحامد قادری بدایونی (وصال ۱۵؍جمادی الاولی ۱۳۹۰ھ/ ۲۰؍جولائی ۱۹۷۰ء) کے تعارف میں مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء) نے مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) اور مولانا شوکت علی (متوفی ۱۹۳۸ء) کو بدایوں بھیجا۔ ملاقات وگفتگو کے بعد:

''مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالحامد بدایونی نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں جا کر تحریکِ خلافت کا پیغام پہنچایا۔

مولانا عبدالحامد بدایونی ڈسٹرکٹ خلافت کمیٹی، بدایوں کے جنرل سکریٹری رہے ۔خلافت پراونشل کمیٹی اور سنٹرل خلافت کمیٹی، بمبئی کی مجلسِ عاملہ کے رکن رہے۔

گاندھی نے خلافت تحریک میں شامل ہو کر قائدانہ پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ مسلمان اپنی سادہ لوحی کی بنا پر ہندوؤں کو اپنا ہمدرد تصور کر بیٹھے تھے۔ لیکن شُدّھی تحریک کے شروع ہونے پر منکشف ہوا کہ ہندو کے عَیّار ذہن میں مسلمانوں کے خلاف کیا کیا منصوبے پرورش پا رہے ہیں۔

مولانا عبدالحامد بدایونی شُدّھی تحریک کے شروع ہوتے ہی کانگریس سے الگ ہوگئے اور مرکزی انجمن تبلیغُ الاسلام، انبالہ اور آگرہ میں شریک ہو کر ہر اُس جگہ پہنچے جہاں شدّھی تحریک کام کر رہی تھی۔'' (ص ۴۲۔ گلدستۂ عقیدت۔ مرتّبہ محمد عابد القادری فرزندِ

مولانا عبدالحامد بدایونی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۱ء)

ہندوؤں کی تنگ نظری اور اسلام دشمنی کے پیشِ نظر ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کی ایک الگ جماعت قائم ہونی چاہیے۔ چنانچہ جب مسلم کانفرنس قائم ہوئی تو مولانا عبدالحامد بدایونی اور تحریکِ خلافت کے اکثر مسلم رہنُما مسلم کانفرنس میں شریک ہوگئے۔

لندن کانفرنس کے بعد دہلی میں مولانا شوکت علی کی قیام گاہ پر مسلم زُعَما کا اِجلاس ہوا تو مولانا عبدالحامد بدایونی نے بھی اس میں شرکت کی۔'' الخ

(ص ۲۰۳ و ۲۰۴۔ تذکرۂ اکابر اہلِ سُنّت پاکستان۔ مؤلّفہ محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ۔ لاہور۔ طبع دوم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء)

حضرت مولانا شاہ احمد مختار صدیقی میرٹھی (وصال ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) کے تعارف میں مولانا محمود احمد قادری رفاقتی لکھتے ہیں:

''قومی اور مِلّی معاملات سے آپ کو خصوصی دل چسپی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک میں پُر جوش حصہ لیا۔ آپ نے اور آپ کے دونوں چھوٹے بھائیوں، مولانا نذیر احمد خجندی اور مولانا شاہ عبدالعلیم نے ۱۹۲۱ء میں مرکزی خلافت فنڈ میں تین لاکھ کا چندہ جمع کیا۔ ۱۹۲۲ء میں جیل بھی گئے۔'' الخ۔

(ص ۳۳۔ تذکرۂ عُلمائے اہلِ سُنّت، مؤلّفہ محمود احمد قادری۔ مطبوعہ کان پور۔ یوپی، انڈیا)

حضرت مولانا نثار احمد کان پوری (وصال فروری ۱۹۳۱ء) فرزندِ حصرت مولانا احمد حسن کان پوری (وصال ۳؍صفر ۱۳۲۳ھ) کے تعارف میں خواجہ رضی حیدر (کراچی) تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کو شرفِ بیعت فاضلِ بریلوی مولانا احمد رضا خاں سے حاصل تھا اور اپنے پیرومرشد سے عقیدت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

مولانا نثار احمد کان پوری نے ۱۹۰۰ء میں ہندوستانی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بہت جلد پورے ہندوستان میں آپ کی شہرت عام ہوگئی.........

مولانا نثار احمد کی ہندوستان گیر قومی سیاست کا آغاز اُس مقام سے ہوتا ہے جب کہ

۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کان پور کے سانحہ میں آپ کی شہرت کو دَوَام حاصل ہوا۔اس تحریک کے ہَراوَّل دَستہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی ،مولانا محمد علی جوہر ،مولانا آزاد سُبحانی ،مولانا عبدالماجد بدایونی ، بیرسٹر مظہرالحق اور مولانا نثار احمد کان پوری شامل تھے۔

.........مولانا نثار احمد کان پوری اور مولانا محمد علی جوہر کے درمیان تعلقات کا آغاز ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے موقع پر ہوا۔اور پھر ان تعلقات کو ایسا اِستحکام حاصل ہوا کہ مَرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوٹا۔

مولانا محمد علی کی ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد مولانا نثار احمد کان پوری نے کان پور کی رہائش تَرک کر کے آگرہ کو اپنا مُستقر بنالیا اور آگرہ کے مفتی مقرر ہوئے ۔اس زمانے میں خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ پورے ملک میں جلسے ہو رہے تھے۔

مولانا نثار احمد کان پوری کے پیرومُرشد فاضلِ بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے تَرکِ موالات کے سلسلے میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ جب انگریزوں سے تَرکِ موالات ہے تو ہندوؤں سے موالات کیا معنی رکھتی ہے؟ کیوں کہ قرآن کی رُو سے دونوں کافر اور اسلام دشمن قومیں ہیں۔

مولانا حکیم قاری احمد پیلی بھیتی نے لکھا ہے کہ:

مولانا نثار احمد کان پوری کا بریلی سے رِشتہ اس قدر مستحکم تھا کہ تَرکِ موالات کی حمایت کے باوجود آپ خانقاہِ رضویہ بریلی کی حاضری سے نہیں رُکے۔'' (ص ۳۵۲۔ تاریخ ہندو پاک ۔مؤلّفہ مولانا قاری احمد پیلی بھیتی ۔مطبوعہ قرآن محل، کراچی ۔۱۹۷۶ء)

فاضلِ بریلوی کے خلیفہ اور حضرت (مولانا وصی احمد) محدِّث سورتی کے صاحب زادے سلطانُ الواعظین مولانا عبدالاحد قادری پیلی بھیتی جو ہندو مسلم اتحاد کے سخت مخالف اور تَرکِ موالات کے سلسلے میں فاضل بریلوی کے فتویٰ کے زبردست مبلّغ تھے، ان سے بھی مولانا نثار احمد کان پوری کے مَراسم ہمیشہ برادرانہ رہے اور تمام عمر دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

انجمن خُدَّامِ کعبہ، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے علاوہ مولانا نثار احمد کان پوری نے انجمن خُدَّامُ الحرمین (۱۹۲۵ء) کے قیام میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔اس انجمن کے

آرگنائزروں میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی ،مولانا نثار احمد کان پوری ،مولانا حسرت موہانی اور مُشیر حسین قدوائی شامل تھے۔'' (ص ۳۹۱۔عُلما اِن پالیٹکس ۔مؤلّفہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۔مطبوعہ کراچی ۱۹۷۴ء)

.......خلافت کانفرنس کراچی ۱۹۲۱ء میں تقریر کے خلاف مقدمہ اور گرفتاری کے بعد مولانا نثار احمد کان پوری کی دوسری گرفتاری ۱۹۲۵ء میں عمل میں آئی جب کہ آپ نے یتیم خانہ اسلامیہ، پریڈ گراؤنڈ ،کان پور میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے حجاز میں مقاماتِ مقدسہ کے اِنہدام پر شدید احتجاج کیا اور حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے حکومتِ حجاز سے احتجاج کرے اور نجدی کارروائیوں کو رُکوائے۔

غرض کہ مولانا نثار احمد کان پوری کی پوری زندگی عالَمِ اسلام کی سَربلندی کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے گذری۔

آپ نے جب اور جس تحریک میں حصہ لیا اس کے لئے بے پناہ قربانیاں دیں اور اپنی ذات کو قومی خدمات کے لئے وقف کر کے رکھ دیا۔'' الخ۔

(ص ۲۶۵ تا ۲۶۷۔تذکرۂ محدِّث سورتی ،مؤلّفہ خواجہ رضی حیدر۔طبعِ دوم رضا اکیڈمی ،بمبئی۔اپریل ۲۰۱۲ء۔طبعِ اول محدِّث سورتی اکیڈمی، ناظم آباد، کراچی ستمبر ۱۹۸۱ء)

مولانا عبدالصَّمد مقتدری بدایونی مُریدِ حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی وخلیفۂ حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی کے تعارف میں مولانا عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں:

''سیاست میں مولانا عبدالماجد بدایونی کے تربیت یافتہ تھے۔تقریر وتحریر میں کمال رکھتے تھے۔تحریکِ خلافت اور تبلیغ و تنظیم میں بھرپور حصہ لیا۔آگرہ اور اس کے گرد و نَواح میں شُدّھی تحریک اور سنگھٹن تحریک نے زور پکڑا تو اس کے سَدِّ باب کے لئے آگرہ میں مستقل قیام کیا۔'' الخ

(ص ۲۲۹۔تذکرۂ اکابرِ اہلِ سُنَّت پاکستان ۔مؤلّفہ محمد عبدالحکیم شرف قادری۔مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور۔طبعِ دوم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء)

سلسلۂ خیرآباد کے نامور فاضل حکیم سید برکات احمد ٹونکی (وصال ربیع الاول

۱۳۴۷ھ/اگست ۱۹۲۸ء) تلمیذِ ارشد علاّمہ عبدالحق خیرآبادی وفرزندِ حکیم سید دائم علی بہاری ثُمَّ ٹونکی (طبیبِ خاص نواب ریاستِ ٹونک، راج پوتانہ) تلمیذِ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے قابلِ فخر شاگرد حضرت مولانا معین الدین اجمیری (وصال عاشورۂ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) کے بارے میں سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''جملہ منقول ومعقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب سے ہی ہوئی۔علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ (علی گڑھی) سے حاصل فرمایا۔ بائیس (۲۲) سال کی عمر میں علوم میں ایسا رُسوخ ہوگیا جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے۔اس وقت سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

.........ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۲۶ھ میں اجمیر کو شرفِ سکونت بخشا اور ۱۳۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا۔سرکار نظام (حیدرآباد دکن) جب اجمیر شریف تشریف لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متأثر ہوئے کہ خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا اور مولانا انوارُ اللہ صاحب (حیدرآبادی) رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو مدرسہ معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اس کے لئے جاری فرمایا۔ مولانا اس کے صدر مدرس ہوئے۔

.........اس زمانۂ تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے۔چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہوسکا۔

.........آخری زمانے میں درگاہ بِل کے اِصلاح کے متعلق جو فتویٰ مولانا نے مرتّب فرمایا تھا، وہ اس قدر جامع اور مؤثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے عُلما نے اس کی تائید کی اور دوسری طرف ممبرانِ اسمبلی نے اس بِل کے ان تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعتِ اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

.........تحریکِ خلافت کے زمانے میں مذھبی فتویٰ کے جُرم میں دو سال کے قید وبند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لیے۔

......تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد

میں نمازِ جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔

.........ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی۔مولانا کے والد شاہ عبدالرزّاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے۔ اور خود مولانا اجمیری، شاہ صاحب کے صاحب زادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوھاب صاحب (حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کے والدِ ماجد) سے بیعت تھے۔

..........اِستغنا، رُجوع اِلی اللہ، توکُّل وغیرہ آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن چکے تھے۔

.........عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سِوا نوافل ومستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے۔تادمِ واپسیں اپنے اَوراد واَشغال میں فرق نہ آنے دیا۔حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے۔

.........ذاتِ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وسَلَّم کے ساتھ محبت وشیفتگی کا یہ عالم تھا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ:

حضور کے مرضِ وصال کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنھَا بے اختیار پکار اٹھیں: یا اَبتاہ! اے میرے باپ!

سرکارِ دوعالم نے فرمایا: لا کربَ علی اَبیک بعدَالیوم۔آج کے دن کے بعد تمھارے باپ پر مصیبت نہیں ہے۔

تو اس جُملہ پر حضرت مولانا اجمیری بے تاب ہوجاتے۔آنسو نکل آتے۔چیخ نکل جاتی۔بسا اوقات غشی طاری ہوجاتی۔

مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔'' الخ

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔یوپی۔شمارہ اپریل ۱۹۴۰ء۔بقلم سید سلیمان ندوی)

حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (ولادت ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء۔وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۴۶ء) کے تعارف میں مولانا محمود احمد قادری رفاقتی لکھتے ہیں:

''قُدوۃُ الخَلَف، بَقیۃُ السَّلَف حضرت علاّمہ شاہ عبدالباری بن حضرت مولانا شاہ عبدالوَھّاب بن حضرت مولانا شاہ محمد عبدالرزّاق بن حضرت مولانا شاہ محمد جمال الدین

فرنگی محلی قُدِّسَتْ اَسْرَارُھُمْ ۱۲۹۵ھ میں فرنگی محل لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالباقی فرنگی محلی مدنی علیہ الرَّحمۃ سے اکثر علوم کا درس لیا۔ چند کتابیں حضرت مولانا عینُ القُضاۃ حیدرآبادی ثُمَّ لکھنوی تلمیذِ مولانا ابوالحسنات عبدالحئی فرنگی محلی سے پڑھیں۔

۱۳۲۳ھ میں حرمین طیبین کا سفر کیا اور حج کے بعد مدینہ طیبہ میں حضرت علاّمہ سید علی بن ظاہر الوتری المدنی اور شیخُ الدَّلائل علاّمہ سید امین بن رضوان اور علاّمہ سید احمد برزنجی مدنی اور شیخُ المشائخ حضرت سید عبدالرحمٰن بغدادی نقیبُ الاشراف قَدَّسَ اللّٰهُ اَسْرَارَھُمْ سے سند و اجازتِ حدیث و سلاسلِ طریقت حاصل کی۔

آپ کو تمام علوم میں تبحرِ تام حاصل تھا۔ فاضلِ بریلوی مولانا احمد رضا آپ کو ''فاضلِ اکمل'' کہتے تھے۔

حرمین طیبین سے واپسی کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ پوری قوت سے درس دیتے تھے۔ پہلے فنون سے دل چسپی تھی۔ آخر میں صرف حدیث شریف پڑھاتے تھے۔ بڑے بڑے عُلما اور فُضَلا نے آپ سے اَخذِ علوم کیا۔

آپ کو سیاست سے بھی دل چسپی تھی۔ مسٹر گاندھی کو آپ کی ذات سے شہرت نصیب ہوئی۔

............جواد و سخی تھے۔ مہمانوں کے اِکرام میں کافی مبالغہ کرتے تھے۔ نماز باجماعت کے خیال سے ہر سفر میں دو آدمیوں کو ساتھ رکھتے تھے۔'' الخ۔

(ص ۱۷۳ و ۱۷۴۔ تذکرہ عُلمائے اہلِ سُنّت۔ مؤلّفہ مولانا محمود احمد قادری، مطبوعہ کان پور)

حضرت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) اپنے دور میں ہندوستان کی مسلم سیاست کے مرکز اور فرنگی محل لکھنؤ کے جلیلُ القدر عالمِ دین تھے۔ آپ کا پدری و مادری شجرۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری رَضِیَ اللّٰهُ عنہُ سے ملتا ہے۔ آپ کے والد حضرت مولانا شاہ عبدالوَھَّاب فرنگی محلی رَحمۃ اللّٰہ علیہ عظیمُ المرتبت فرنگی محلی عالم حضرت مولانا شاہ عبدُ الرَّزَّاق فرنگی محلی رحمۃُ اللّٰہ علیہ کے فرزند تھے۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ولادت ۱۰/ربیع الآخر ۱۲۹۶ھ/۷۸-۱۸۷۷ء کو بمقام محل سرا فرنگی محل لکھنؤ ہوئی تھی۔

مولانا حسرت موہانی (۱۸۸۱ء-۱۹۵۱ء) لکھتے ہیں:

''آپ کی رسمِ تسمیہ خوانی بڑے اِہتمام سے ہوئی اور آپ کے جَدِّ اکرم حضرت مولانا شاہ عبد الرَّزَّاق قُدِّسَ سِرُّہٗ نے آپ کو بسم اللہ پڑھائی۔'' (رسالہ اردوئے معلّٰی علی گڑھ۔ جنوری ۱۹۴۶ء)

حافظ حاتم علی نے آپ کو قرآن شریف پڑھایا اور حافظ نواب عبدالوھَّاب خاں نے حفظِ قرآن مکمل کرایا۔

مولانا عبدالباقی فرنگی محلی، مولانا غلام احمد پنجابی، مولانا عینُ القُضاۃ حیدرآبادی ثم لکھنوی سے آپ نے کتبِ متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۱۸ھ میں تکمیلِ درس کے وقت آپ کے خصوصی استاذ مولانا عبدالباقی فرنگی محلی نے اجازتِ حدیث (مفصَّلاً) سے آپ کو نوازا۔

تعلیم و تدریس کا معیار بہتر کرنے کے لئے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ۱۳۱۳ھ میں اپنا مدرسہ نظامیہ قائم کیا جس میں مدت تک علمِ دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مطالعہ و تصنیف کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ آپ کی تحریر کردہ کتب و حواشی کی تعداد سو (۱۰۰) سے مُتجاوِز ہے۔ قومی و ملّی مسائل سے دل چسپی کچھ زیادہ تھی۔ اس حد تک کہ ہندوستان کی تحریکی و تنظیمی مسلم سیاست کے آپ نُقطۂ پرکار بن گئے تھے۔

جنگِ طرابلس و بلقان (۱۲-۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر دسمبر ۱۹۱۲ء میں آپ نے ''انجمن خُدَّامِ کعبہ'' اور ۱۹۲۵ء میں ''انجمن خُدامُ الحرمین'' کی بنیاد ڈالی تھی۔

۱۹۱۹ء میں شروع ہونے والی تحریکِ خلافت کا مرکزی کردار آپ ہی کی ذات تھی۔ تحریکِ خلافت کے کاندھے پر سوار ہو کر ملک گیر سطح کے لیڈر بننے والے گاندھی کا جب دورۂ لکھنؤ ہوتا تھا تو وہ فرنگی محل لکھنؤ پہنچ کر حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنؤ کے ہی مہمان ہوا کرتے تھے۔

اس تحریکِ خلافت میں سیاست کی آمیزش درحقیقت گاندھی کی وجہ سے ہی ہوئی اور مولانا فرنگی محلی سے کچھ قابلِ مؤاخذہ اُمور و معاملات کا صُدُور اِسی سیاسی آمیزش کے

سبب ہوا۔ کچھ سیاسی مُبَصّرین کا خیال ہے کہ گاندھی نے تحریکِ خلافت میں سرگرم شرکت اس لئے کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے دَباؤ میں انگریز ہندوستان چھوڑ جائیں اور حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے ۔ یہ خیال کتنا صحیح اور کتنا محض قیاس ہے؟ اس کا تاریخی تجزیہ کر کے مؤرخین صحیح نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہرحال ! ایک اہم پہلو اور ایک الگ مسئلہ یہ ہے کہ تحریکِ خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات کے دوران حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے کچھ ایسی لغزشیں سرزد ہوئیں جو شرعاً قابلِ مؤاخذہ تھیں اور کچھ مدت گذرنے کے بعد آپ نے ان سے رُجوع بھی کرلیا تھا۔

تحریکِ خلافت کے دوران خلافتِ شرعی کی بحث نے کافی شِدَّت اختیار کرلی تھی اور چوں کہ یہ ایک اہم شرعی مسئلہ ہے اس لئے مسلمانانِ ہند نے اس سلسلے میں فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی طرف خصوصیت کے ساتھ رُجوع کیا۔

ایک سائل نے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے یہ سوال کیا کہ:

''سلطنتِ عُثمانیہ کی اِعانت مسلمانوں پر لازم ہے یا نہیں؟ فرضیتِ اِعانت کے لئے بھی سلطان کا قرشی ہونا شرط ہے یا صرف خلافتِ شرعیہ کے لئے یا کسی کے لئے نہیں؟

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خطبۂ صدارت میں اس سے متعلق چند سطور ہیں۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۲۰ء میں اپنے لکھے ہوئے رسالہ ''مسئلۂ خلافت اور جزیرۃُ العرب'' میں ص ۳۲ سے ص ۷۰ تک حسبِ عادت اسے بہت پھیلا کر بیان کیا ہے۔

ان دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ ''خلافتِ شرعیہ میں بھی قرشیت شرط نہیں''۔

یہ صحیح ہے یا غلط؟ اور اس بارے میں مذہبِ اھلِ سُنَّت کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اولاً اجمالی طور پر اس طرح رقم طراز ہیں:

(امابعد) رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں:

اَلدِّینُ النَّصِیحَۃُ لِلّٰہِ ولِکِتابِہٖ وَلِرَسُولِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ المُسلِمِین وَعَامَّتِہِم۔

رَوَاہ احمد ومسلم وابوداؤد والنَّسائی عن تمیمِ الدَّاری والتّرمذِی والنّسائی عن ابی ھُرَیرۃ و احمد عن ابن عبَّاس و الطَّبرَانی فی الاوسط عن ثوبان رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنھُم۔

بے شک دین یہ ہے کہ اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسول سے سچّا دِل رکھے اور سلاطینِ اسلام اور جُملہ مسلمانوں کی خیر خواہی کرے۔

سلطنتِ عَلِیّہ عُثمانیہ اَیَّدَھَا اللّٰہُ تعالیٰ نہ صرف عُثمانیہ ہر سلطنتِ اسلام، نہ صرف سلطنت، ہر جماعتِ اسلام، نہ صرف جماعت، ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں شرطِ قرشیت کیا معنی؟

دل سے خیر خواہی مطلقاً فرضِ عین ہے اور وقتِ حاجت دُعا سے اِمداد و اِعانت بھی ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس سے کوئی عاجز نہیں۔

اور مال یا اَعمال سے اِعانت فرضِ کفایہ ہے۔ اور ہر فرض بقدرِ قدرت۔ ہر حکم بشرطِ اِستطاعت۔ قالَ اللّٰہُ تعالیٰ: لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلَّاوُسعَھَا۔

وقالَ تَعالیٰ: فَاتَّقُوااللّٰہَ مَااستَطَعتُم۔

مُفلس پر اِعانتِ مال نہیں۔ بے دست و پا پر اِعانتِ اَعمال نہیں۔ وَلِھٰذا مسلمانانِ ہند پر حکمِ جہاد و قتال نہیں۔

بادشاہِ اسلام اگرچہ غیر قریشی ہو، اگرچہ کوئی غلام حبشی ہو، اُمورِ جائزہ میں اس کی اِطاعت تمام رعیت اور وقتِ حاجت اس کی اعانت بقدرِ استطاعت سب اہلِ کفایت پر لازم ہے۔

البتّہ اہلِ سنّت کے مذہب میں خلافتِ شرعیہ کے لئے ضرور قرشیت شرط ہے۔

اس بارے میں رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم سے متواتر حدیثیں منقول ہیں۔

اسی پر صحابہ کا اِجماع، تابعین کا اِجماع، اہلِ سُنَّت کا اِجماع ہے۔ اس میں مخالف نہیں مگر خارجی یا کچھ معتزلی۔ کتبِ عقائد و کتبِ حدیث و کتبِ فقہ اس سے مالامال ہیں۔

بادشاہِ غیر قرشی کو سلطان، امام، امیر، والی، مَلِک کہیں گے۔ مگر شرعاً خلیفہ یا امیرُ المومنین کہ یہ بھی عُرفاً اسی کا مُرادِف ہے، ہر بادشاہِ قرشی کو بھی نہیں کہہ سکتے سِوا اُس کے جو ساتوں

شرطِ خلافت۔ اسلام، بلوغ، عقل، حُرِّیّت، ذکورت، قدرت، قرشیت، سب کا جامع ہو کر تمام مسلمانوں کا فرماں روائے اعظم ہو۔" (ص:۱۳ تا ۱۵ - دوامُ العَیش فی الْاَئمَّةِ مِن قُرَیش۔ مطبوعہ حسنی پریس، بریلی۔ ۱۳۳۹ھ۔ وص:۱۷۴و ۱۷۵، فتاویٰ رضویہ جلد ۱۴۔ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

کچھ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:۔

"زمانۂ صحابہ سے برابر عُلمائے کرام، خُلَفا و مُلُوک کو علیحدہ کرتے آئے حتیٰ کہ خود سلاطین اسی کے پابندرَہے۔ اور آج تک ہیں۔

بڑے بڑے جبّار بادشاہ گذرے۔ کبھی غیرِ قریش نے تُرک ہوں یا مغل یا پٹھان یا کوئی، اپنے آپ کو خلیفہ نہ کہلوایا، نہ خلافتِ مصطلحۂ شرعیہ کا دعویٰ کیا۔

جب تک خلافتِ عباسیہ قائم رہی، خلیفہ ہی کی سرکار سے سلاطین کی تاج پوشی ہوتی۔ سلطان دستِ خلیفہ پر بیعت کرتا اور اس منصبِ شرعی کا مستحق اسی کو جانتا اگرچہ زور و طاقت وسطوت میں اس سے کہیں زائد ہوتا۔" (ص ۱۰۵۔ دَوامُ العَیش فِی الْاَئِمَّةِ مِن قُرَیش۔ مطبوعہ حسنی پریس، بریلی (۱۳۳۹ھ)۔ وص:۱۷۵، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

سلاطینِ اسلام کے متعدّد واقعاتِ بیعت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"الحمدُ لِلّٰه! کیسے روشن بیانوں سے ثابت ہوا کہ:

یہ سارے جلوے شرطِ قرشیت کے تھے۔ تمام سلاطین کا خود یہی عقیدہ تھا کہ ہم بوجہ عدمِ قرشیت لائقِ خلافت نہیں۔ قرشی کے سِوا دوسرا شخص خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہر وقت و قرن کے عُلما انہیں یہی بتاتے رہے۔ اور قطعاً یہی مذہبِ اہلِ سُنَّت ہے۔ اور اسی پر اجماعِ صحابہ و اجماعِ امت ہے۔ اور اسی پر اَحادیثِ مصطفیٰ صلّی اللّٰه علیه وسلّم کی متواتر شہادت ہے۔ فَمَاذَا بَعدُ الحَقِّ اِلَّاالضَّلَال؟

رہا مسئلۂ اِعانت! کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطانِ اسلام کی اِعانت کچھ ضروری نہیں؟ صرف خلیفہ کی اِعانت چاہیے؟ کہ مسلمانوں کو اِعانت پر اُبھارنے کے لئے اِدّعائے خلافت ضرور ہوا؟

یا سلطانِ مسلمین کی اِعانت صرف قادِروں پر ہے۔ اور خلیفہ کی اِطاعت بلا قدرت بھی فرض ہے؟ یہ نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہے۔

اور جب کوئی وجہ نہیں۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات میں جھگڑا ڈالنے کے لئے جُملہ عُلمائے کِرام کی واضح تصریحاتِ متظافرہ اور اجماعِ صحابہ و اِجماعِ امّت و اَحادیثِ متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ "خلافت" سے شروع کر کے عقیدۂ اِجماعیت کا خلاف کیا جائے؟ خارجیوں، معتزلیوں کا ساتھ دیا جائے؟

دور اَز کار تاویلوں، تبدیلیوں، تحریفوں، خیانتوں، عِنادوں، مُکابروں سے حق چھپانے اور باطل پھیلانے کا ٹھیکہ لیا جائے۔ والعیاذُ بِاللّٰهِ تعالیٰ۔" (ص:۱۸۳، فتاویٰ رضویہ، ج ۱۴، مطبوعہ لاہور)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے تقریباً پچاس (۵۰) احادیثِ کریمہ اور کتبِ عقائد و تفسیر و حدیث و فقہ کی بانوے (۹۲) عبارتوں سے خلافت کے لئے قرشیت کا شرط ہونا ثابت کیا ہے۔

حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۴۴ھ/ جنوری ۱۹۲۶ء) جو اُس وقت تحریکِ خلافت کے قائد و قافلہ سالار تھے، ان کا ایک خطبۂ صدارت جس میں ۱۵ سطریں اس موضوع سے متعلق تھیں، اُس میں انہوں نے کہا کہ:

"خلافت کے لئے شرطِ قرشیت صرف حضراتِ شَوافِع کے نزدیک ہے۔ اور بعض اَحناف کا کلام بھی ہے۔ اس میں بھی تصریح نہیں۔"

پینتیس (۳۵) وجوہ سے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اس کا رَد فرمایا اور آخر کلام میں لکھا ہے کہ:

"آغاز میں کہا: اہلِ سُنَّت، مسلم متغلّب یعنی فاقِدُ الشرط کی اِطاعت کو فرض اور اِمامت کو درست مانتے ہیں"۔

اس امامت سے مراد اگر خلافت ہے جیسا کہ یہی ظاہر ہے۔ تو قطعاً مَردود، جس کا روشن بیان گذرا۔ اور اگر سلطنت مقصود تو حق ہے۔

مگر گذارش یہ ہے کہ جب مسئلہ یوں تھا اور بے شک تھا کہ متغلِّب کی بھی سلطنت صحیح

اور اطاعت واجب، تو کیا ضرورت تھی کہ خواہی نخواہی مسئلۂ خلافت چھیڑا جائے اور اجماعِ صحابہ واُمّت اُکھیڑا جائے؟۔ مذہبِ اہلِ سُنّت و جماعت اُدھیڑا جائے؟

تُرکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹّی ہے۔ اصل مقصود بغُلامیِ ہنود ''سوراج'' کی چکی ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔ بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔ عوام بپھریں۔ چندہ خوب ملے اور گنگا وجمنا کی مقدس زمین آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پس رَوِ مُشرِکاں بزمزم نہ رَسی
کیں رَہ کہ تو می رَوی بہ گنگ وجمن ست

نَسألُ اللّٰہَ العَفوَ وَالعَافِیۃَ۔

تُرکی سلاطین پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔ وہ خود اہلِ سُنّت تھے اور ہیں۔ مخالفتِ مذہب انہیں کیوں کر گوارہ ہوتی؟ انہوں نے خود خلافتِ شرعیہ کا دعویٰ نہ فرمایا۔ اپنے کو سلطان ہی کہا۔ سلطان ہی کہلوایا۔

اس لحاظِ مذہب کی برکت نے انہیں وہ پیارا خطاب دلایا کہ امیرُ المُؤمنین و خلیفۃُ المُسلِمین سے دل کشی میں کم نہ آیا۔ یعنی ''خادمُ الحَرَمین الشَّریفَین''

کیا اِن القاب سے کام نہ چلتا جب تک مذہب و اجماعِ اہلِ سُنّت پاؤں کے نیچے نہ کچلتا؟ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِمَّا لَا یَرضَاہ۔ (دوامُ العَیش فی الاَئِمۃِ مِن قُرَیش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعہ حسنی پریس، بریلی)

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کی تحریر پر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے قلم برداشتہ پچیس (۲۵) طریقوں سے خلافت کے سلسلے میں ان کے مَوقِف کا رَد فرمایا ہے:

(۱) مسٹر آزاد نے بڑا زُور اس پر دیا ہے کہ اسلام تو قومی امتیاز کو اُٹھانے کے لئے آیا ہے پھر وہ خلافت کو قریش کے لئے کیسے خاص کر سکتا ہے؟

مقاصد وشرحِ مقاصد سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے اس کا جواب دیا ہے کہ:

''یہ خارجیوں کا پُرانا اعتراض ہے۔ اہلِ سُنّت کے نزدیک امام کا قریشی ہونا شرط ہے۔ اس لئے کہ مَصالحِ سلطنت و دین میں شرفِ نسب کو ضرور دخل ہے۔ خصوصاً اس

حالت میں کہ سیّدُ الانبیاء صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم نے انہیں میں سے ظہور فرمایا۔

(۲) بزورِ زبان بڑا زُور اس پر دیا ہے (ص ۶۰) کہ خلافتِ قریش کی نسبت جس قدر روایات ہیں، سب پیشگوئی وخبر ہیں کہ قریشی ہی خلیفہ ہوں گے، نہ حکم کہ قریشی ہی خلیفہ ہوں۔

شرحِ عقائدِ نسفی، وقواعدُ العقائد امام حجۃُ الاسلام، واِتحاف سید زبیدی، ومسامرہ شرح مسایرہ، وتعلیقاتِ علّامہ قاسم، وطوالعُ الانوار علامہ بیضاوی، ومواقف علامہ قاضی عضد، و شرحِ مواقف علامہ سید شریف، ومقاصد وشرحِ مقاصد، وشرحِ صحیح مسلم لِلامام النووی، وارشادُ الساری، ومرقاۃِ قاری، وشرحِ صحیح مسلم لِلقرطبی، وابن المنیر، وعمدۃُ القاری امام عینی، وفتح الباری امام عسقلانی، وشرح مشکوٰۃ علامہ طیبی، وشرح مشکوٰۃ علامہ سید شریف وامام اجل ابوبکر باقلانی، واَشِعۃُ اللّمعات شیخ محقق (دہلوی) وغمزُ العیون سید حموی، وحاشیہ الدُّر لِلسید الطّحطاوی ولِلسید ابن عابدین، وکواکب کرمانی، ومجمعُ البحار، وشرح فقہ اکبر بحر العلوم وغیرہا کی عباراتِ کثیرہ ابھی گذریں (دوامُ العیش میں) جو اِس مُہملہ کے رَد کو بَس ہیں۔

مسٹر آزاد اگرچہ اپنے نشے میں تمام ائمۂ مُجتہدین کرام سے اپنے آپ کو اعلیٰ جانتے ہیں۔ ان کے ارشادات کو ظنی اور اپنے توہُّمات کو وحی سے مکتسب قطعی مانتے ہیں۔'' الخ (ص ۶۷ و ۶۸ دَوَامُ العَیش فِی الاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعہ بریلی)

(۳) مسٹر آزاد نے اشد ظلم حدیثِ صحیحین ''لایزالُ ھذا الاَمرُ فی قُرَیش'' پر کیا ہے۔ اس میں لفظ وہ لیے جو صحیح بخاری میں واقع ہوئے مابَقِیَ مِنھُم اِثنانِ۔ اور کہہ دیا کہ اگر اس کا مطلب یہ قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی قریش میں ہیں، خلافت انہیں کے قبضے میں رہے گی۔ تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر قریش میں دو بھی خلافت کے اہل ہوں گے تو کبھی خلافت سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا۔

شوخ چشمی ہو تو اتنی ہو، نام صحیح مسلم کا بھی لیا اور کہا عُمدہ طریق وہ ہیں جو بخاری نے اختیار کیے ہیں۔

اوّلاً ___ مسلم نے یہ حدیثیں خود انہیں استاذِ بخاری احمد بن عبداللہ یونس سے جن سے بخاری نے سُنی، یوں روایت کی:

ولایزالُ ھذا الامرُ فِی قُرَیش مَابَقِیَ مِنَ النَّاسِ اِثنانِ۔

ہمیشہ خلافت قریش ہی میں رہے گی جب تک دنیا میں دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔

اسی طرح اسمٰعیلی نے مستخرج میں روایت کی:

مَابَقِیَ فِی النَّاسِ اِثنانِ۔

جب تک آدمیوں میں دو بھی رہیں۔

یہ روایتیں روایتِ بخاری کی مفسِر ہیں کہ:

مِنھُمُ سے مرادمِنَ النَّاسِ ہے۔

لاجرم مرقاۃ علی قاری میں اس کی یہی تفسیر کردی:

(مِنھُم)ای مِنَ النَّاسِ (اِثنان)۔

جب تک ان میں سے یعنی آدمیوں میں سے دو بھی رہیں۔

ولہٰذا امام اجل ابوزکریا نووی نے اوّلاً مسلم کی روایتیں ذکر کیں۔ پھر فرمایا:

وفی رِوایۃِ البُخاری مابَقِی مِنھُم اِثنانِ۔ ھذہٖ الاحادیثُ واشباھُھا دلیلٌ ظاھرٌ اَنَّ الخِلافۃَ مُختَصَّۃٌ بِقُرَیش لا یجُوزُ عَقدُھا لِاَحدٍ مِن غَیرِھم۔ الخ۔

ثانیاً۔ اگر تفسیر نہ مانو، تعارض جانو۔ تو متعدد کی روایت کیوں نہ اَرجح ہو؟

اور نہ سہی۔ مُعارِض تو ہوگی؟ تو تمہاری سند کہ مِنھُم ہے، ثابت نہ رہے گی۔

ثالثاً۔ کسی پرچہ، اخبار کی ایڈیٹری اور چیز ہے اور حدیث وفقہ کا سمجھنا اور۔

وہ مِنْ کا ترجمہ ''سے'' اور اِلیٰ کا ترجمہ ''تک'' کر لینے سے نہیں آتا۔

اگر ضمیر قریش کی طرف ہوتی تو اِثنان کی جگہ اَحَدٌ فرمایا جاتا۔ یعنی جب تک ایک قریشی بھی رہے۔ جس طرح ابھی امام قرطبی اور امام عینی وامام عسقلانی کے لفظ سن چکے۔

اس کی تاویل آپ حسبِ عادت کہ قرآنِ کریم میں اپنی طرف سے اِضافے کر لیتے ہیں، حدیث میں یہ پچّر بڑھاتے کہ یعنی جب تک کہ ایک قریش خلافت کا اہل رہے۔

دو کی اہلیت پر موقوف فرمانا کیا معنی؟ کیا خلیفہ ایک وقت میں دو بھی ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔

ہاں! آدمیوں کی طرف ضمیر ہو تو ضرور دو کی ضرورت تھی۔ کہ خلافت حکومت ہے۔ اور حکومت کو کم سے کم دو درکار، ایک حاکم، ایک محکوم۔

اب تو آپ نے جانا کہ مِنھُم کی ضمیر قریش کی طرف پھیرنا کیسی سخت جہالت تھی۔''

الخ۔ (ص ۷۰۔ دوامُ العَیش فی الْاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعہ بریلی)

(۴) مسٹر آزاد فرماتے ہیں: تاریخ شاھِد ہے کہ دو قریش بھی حکمرانی کے اہل نہ رہے''۔

کون سی تاریخ شاھِد ہے؟ کہ سات سو یا بلحاظ خلافتِ مصری چار سو سولہ برس سے تمام روئے زمین پر کوئی دو قریشی، دو ہاشمی دو سید ابن الرَّسُول صلّی اللّٰہ علیہ وسلَّم حکمرانی کے لائق پیدا ہی نہ ہوئے؟ فضلِ الٰہی قومِ محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلَّم وخاندانِ محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلَّم وآلِ محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلَّم سے صدہا سال سے اُٹھالیا گیا اور این وآں کو بٹتا ہے اور بٹا کیا؟

آپ کے نزدیک مدارِ لیاقت، وقوع پر ہے؟ جس نے حکمرانی نہ پائی، نااہل تھا۔ جس نے پائی، اہل تھا؟ تو ضرور آپ پلیدمَر یدخَبیث عَنِید نجس یزید کو لائق بتائیں گے اور حضرت امام عرش مقام عَلیٰ جَدِّہٖ وعلیہِ الصَّلوۃ والسَّلام کو معاذ اللہ نالائق ٹھہرائیں گے۔ اور جب یہ معیار نہیں بلکہ صفاتِ ذاتیہ پر مدار ہے۔ تو کیا آپ نے سات سو چار برس سے آج تک کے تمام قریشیوں کی جانچ کر لی ہے کہ نالائق تھے؟ نَعوذُ بِاللّٰہ۔

افسوس! آپ کا مَبْلَغِ علم یہی تاریخی کہانیاں ہیں۔ ان پر بھی ایسا جیتا اِفترا جوڑا۔ تاریخیں ہزار بے تکی ہوں، ایسا پورے نشے کا ہذیان بکتے انہیں بھی عار آئے گی۔'' **(ص ۷۱۔ دوامُ العَیش فِی الْاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش۔ از امام احمد رضا۔ مطبوعہ بریلی)**

(۵) مسٹر آزاد نے یوں ہی دوسری حدیث اَلْاَئِمَّۃُ مِن قُرَیش سے تشریح اُڑانے اور نری خبر بتانے کے لئے کیا کیا ڈوبتے سوار پکڑے ہیں۔ لکھتے ہیں: (ص ۶۳)

صحیح بخاری کے ترجمۂ باب سے صاف واضح ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ انہوں نے باب باندھا (اَلْاُمَراءُ مِن قُرَیش) قریش میں اِمارت واُمَرَاء۔ اس مضمون کا

باب نہ باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش ہی میں ہونی چاہیے۔

سُبحٰن اللّٰہ! زہے مسٹری ولیڈری واڈیٹری۔

امام بخاری کی عادت ہے کہ الفاظِ حدیث سے ترجمۂ باب کرتے ہیں۔ نیز وہ الفاظ جو اُن کی شرط پر نہ ہوں، ترجمہ سے ان کا پتہ دیتے ہیں۔

حدیث انہیں لفظوں سے تھی۔ انہیں سے باب باندھا۔ نیز یہ لفظ ان کی شرط پر نہ تھے۔ ترجمہ سے ان کا اِشعار کیا۔

اس سے یہ سمجھ لینا کہ امام بخاری کا مذہب یہ ہے اور اس پر یہ تحکّم کہ ''صاف واضح ہے'' کس قدر جَہلِ فاضح ہے۔'' الخ۔ (ص ۷۲۔دوامُ العَیش فی الائِمَّۃِ مِن قُرَیش۔ از امام احمد رضا۔مطبوعہ بریلی،وص:۲۳۴،فتاویٰ رضویہ، ج ۱۴۔رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اس طرح بعض عُلماے تحریکِ خلافت نے نُصُوص کو توڑ مروڑ کر اَحکامِ شریعت کی سراسر مخالفت کی۔ اور خلافت کے نام سے پورے ملک کے مسلمانوں میں عام طور پر حرارت وگرمی پیدا کردی اور دوسری طرف انگریز حاکموں کے خلاف بھی ملک کے طول وعُرض میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ جو تحریکِ خلافت کا اِستحصال کرنے والے سیاسی لیڈروں کا اصل مقصد تھا کہ مذہبی جذبات برانگیختہ کرکے ان سے اپنے سیاسی مقاصد وعزائم پورے کیے جائیں۔ جب کہ مسئلۂ خلافت ایک خالص شرعی مسئلہ ہے جیسا کہ اپنے دورۂ انگلینڈ (۱۹۲۰ء) کے وقت بھی سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مسٹر فِشر سے کہا تھا۔ اور اس کی روداد سید صباحُ الدین عبدالرحمٰن اِس طرح بیان کرتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی نے اس موقع پر ایک مختصر تقریر کی جس میں انھوں نے فرمایا کہ:

''میں صرف اس بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں شاید پہلا ہندوستانی مولوی ہوں جو یہاں آیا ہوں۔ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں۔

مولانا عبدالباری صاحب نے جو لکھنؤ کے فرنگی محل کے مشہور خاندان سے ہیں، مجھ کو

خاص طور پر اپنی نمایندگی کے لئے بھیجا ہے تاکہ میں بادشاہ سلامت کی حکومت پر واضح کردوں کہ:

''ہم لوگوں کے لئے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ خالص ایک مذھبی مسئلہ ہے۔''

محمد علی کی یاد میں۔ مؤلّفہ صباحُ الدین عبدالرحمٰن۔ (ص ۳۶۔تحریکِ خلافت۔ مؤلّفہ قاضی عدیل عباسی۔مطبوعہ نئی دہلی)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی اس تنبیہ وھدایت پر عُلماے تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات نے توجہ دینے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی تو دیگر زُعَما وحامیانِ تحریک سے کیا شِکوہ؟ جب کہ آپ کا یہ شرعی واصولی موقف کتنا واضح وصریح اور مُفید وصحیح تھا کہ:

''رہا مسئلۂ اِعانت، کیا آپ لوگوں کے زعم میں سلطانِ اسلام کی اِعانت کچھ ضرور نہیں؟ صرف خلیفہ کی اِعانت جائز ہے کہ اِدّعاے خلافت ضرور ہوا؟

یا سلطانِ مسلمین کی اعانت صرف قادِروں پر ہے اور خلیفہ کی اِطاعت بلا قدرت بھی فرض ہے؟ یہ نصوصِ قطعیۂ قرآن کے خلاف ہے۔

اور جب کوئی وجہ نہیں پھر کیا ضرورت تھی کہ سیدھی بات میں جھگڑا ڈالنے کے لئے جملہ عُلماے کرام کی واضح تصریحاتِ متظافرہ اور اِجماعِ صحابہ واِجماعِ امّت واَحادیثِ متواترہ کے خلاف یہ تحریک لفظ ''خلافت'' سے شروع کرکے عقیدۂ اِجماعیہ اہلِ سُنّت کا خلاف کیا جائے؟ خارجیوں، معتزلیوں کا ساتھ دیا جائے؟ دوراَز کار تاویلوں، تبدیلیوں، تحریفوں، خیانتوں، عِنادوں، مُکابَروں سے حق چھپانے اور باطل پھیلانے کا ٹھیکہ لیا جائے؟ **والعیاذُ بِاللّٰہِ تعالیٰ**۔'' (دوامُ العیش مطبوعہ، بریلی۔وص: ۱۸۳، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴۔رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''تُرک سلاطینِ اسلام پر اللہ کی رحمتیں ہوں، وہ خود اہلِ سُنّت تھے اور ہیں۔ مخالفتِ مذہب انہیں کیوں کر گوارہ ہوتی؟

انہوں نے خود خلافتِ شرعیہ کا دعویٰ نہ فرمایا۔ اپنے آپ کو سلطان ہی کہا، سلطان ہی کہلوایا۔ اِس لحاظِ مذہب کی برکت نے انہیں وہ پیارا خطاب دلایا کہ **امیرُ المُؤمنین**

وخلیفۃُ المُسلمین سےدل کشی میں کم نہ آیا۔یعنی خادمُ الحَرَمین الشَّرِیفَین۔

کیااِن القاب سے کام نہ چلتا جب تک مذہب واجماعِ اہلِ سُنَّت پاؤں کے نیچے نہ کچلتا؟نعُوذُ بِاللّٰہِ مِمَّا لا یَرْضاہ۔والصَّلوٰۃُ والسَّلامُ علیٰ مُصطفاہ وآلِہٖ و صَحْبِہٖ الْاَ کارِمِ الھُداۃ۔'' (دوامُ العَیش ،مطبوعہ بریلی۔ص:۲۲۵،فتاوٰی رضویہ،ج ۱۴، رضافاؤنڈیشن،لاہور)

سلطنتِ عُثمانی تُرک کے لئے لفظِ ''خلافت'' کے استعمال پر اِصرار کرتے ہوئے زُعَمائے تحریکِ خلافت نے عجیب وغریب نکتہ آفرینی کی اور خلافتِ شرعی اصطلاحی کے مفہوم میں اس تحریک کے دوران،توسیع کر کے اپنی مقصد برآری کے لئے اسے اس معنی ومفہوم تک پہنچادیا جوفرد، جماعت، معاشرہ اور حکومت وسلطنت ہرایک کوعام ہے۔چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء)اس موضوع پر اپنی تحقیقاتِ عالیہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے رَقم طراز ہیں:

''خلافت عربی زبان کا ایک مصدر ہے۔اس کا مادّہ خلف ہے اوراسی سے خلیفہ آتا ہے ۔خلیفہ کے لُغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔یہ لفظ قرآنِ کریم کے اِختیاراتِ لُغویہ میں سے ہے۔یعنی عربی زبان کے لفظوں میں سے ہے جن کو لُغت میں عام معانی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا مگر قرآنِ کریم نے اپنے خاص مصطلحہ سے شرعی معنی کے لئے اختیار کرلیا۔ جیسے ایمان بِالغیب، تقدیر، صلوٰۃ وغیرہ۔

ایمان کے لُغوی معنی یقین وطمانیت اور زوالِ خوف وشک کے تھے لیکن قرآنِ کریم نے اس کوایک خاص طرح کے یقین واقرار اور عمل کے لئے استعمال کیا۔اوراب ایمان،قرآن کی زبان میں عام لُغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پائی۔

قرآن کی زبان میں خلافت اور اِستخلاف فی الارض اور وراثت وتَمکُّن فی الاُرض سے مقصود زمین کی قومی عظمت وریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت وسلطنت ہے۔

قرآنِ کریم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اوراچھے کاموں کے بدلے اَقوامِ عالَم کو دنیا میں مل سکتی ہے۔

قرآن کے نزدیک اس خلافتِ اَرضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی

ھِدایت وسعادت کے لئے ایک خاص ذِمّہ دار قوم اور حکومت قائم ہو۔وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے۔ظلم وجَور اور ضلالت وطُغیان سے اس کی زمین پاک ہوجائے۔ایک عام امن وسکون اور راحت وطمانیت دنیا میں پھیل جائے۔

اللہ کا وہ ہمہ گیر قانونِ عدل جو تمام کائناتِ ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے حشراتُ الارض تک نافِذ وقائم ہے اور جس کو قرآن اپنی زبان میں صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتا ہے ،زمین کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں جاری وساری ہوکر کرۂ ارضی کو سعادت واَشرفیت کی ایک بہشت زار بنادے۔

لُغت کے اعتبار سے یہ اِطلاق اس لئے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد، خلیفہ ہُوا وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی۔اور خلیفۂ سابق کا قائم مقام۔

ظُہورِ اسلام کے بعد جب خلافتِ ارضی کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلے کا پہلا خلیفۃُ اللہ شارعِ اسلام تھا۔یعنی نبی کریم محمد صلّی اللّٰہ علیہ وسلَّم ۔

پھران کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں اسلام کی مرکزی حکومت آئی،وہ اس خلیفۃُ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے۔اسی لئے ان پر خلیفۃُ اللہ کا اطلاق ہوا۔

یہ زمین کی وراثت وخلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دینِ حق کے خدمت گذار رہے۔قرآنی آیات میں جگہ جگہ اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔یہی چیز زمین کی تمکین یعنی طاقت وعظمت کا جَماؤ اور قیام بھی ہے جو سرزمینِ فَراعِنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی۔جب کہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عملِ حق وصالح کی قوت سے ایک دن مصر کے تاج وتخت کا مالک ہوگیا۔

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔آٹھ نو برس کے بعد داعیِ اسلام دنیا سے تشریف لے گئے تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں کے قبضہ واختیار میں آچکا تھا اور رومیوں سے مقابلہ کے لئے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں۔

اس سلسلۂ خلافتِ اسلامیہ کا پہلا خلیفۃُ اللہ خود داعیِ اسلام،نبیِ کریم صلّی اللّٰہ علیہ

وسلّم کا وجود تھا اور آپ نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خُلَفَا سے تعبیر کر کے واضح کر دیا تھا کہ وہ آپ کے نائب اور قائم مقام ہوں گے۔

نبی کریم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے بعد خلافت اپنے خصائص ونتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہوگئی۔ خود نبیِ کریم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے نہ صرف اس کی پہلے ہی خبر دی تھی بلکہ تمام عَلائم وخَصائص صاف صاف بیان کر دیے تھے۔

اس سلسلے میں جو احادیث مذکور ہیں، وہ کثرتِ طُرُق سے، شہرتِ متن، قبولِ طبقات کی بنا پر حدِّ تواتر کو پہنچ چکی ہیں۔

پہلا سلسلۂ خلافت، خُلَفائے راشدین کا تھا جن کی خلافت منہاجِ نبوت پر تھی۔ یعنی وہ صحیح اور کامل معنوں میں مَنصبِ نبوت کے جانشین اور جامعیتِ شخص ورسالت کے قائم مقام تھے۔ ان کا طریق کار ٹھیک ٹھیک طریقِ نبوت کے مطابق تھا۔

دوسرا سلسلۂ خلافت، منہاجِ نبوت سے الگ مُجرّد حکومت وبادشاہت کا تھا۔ جب عجمی بدعتیں خالص اسلامی وعربی تمدن سے مل کر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔

یہ سلسلۂ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھا، لیکن خلافتِ راشدہ کی حقیقی خصوصیتیں ناپید تھیں۔ خُلَفائے بنواُمیَّہ سے لے کر خلافتِ عثمانیہ تک یہ سلسلہ جاری وساری رہا۔''

(ص ۱۲ تا ص ۱۵۔ مسئلۂ خلافت ازمولانا ابوالکلام آزاد۔ مطبوعہ اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۱۹۸۷ء)

خلافت کانفرنس منعقدہ رفاہِ عام لکھنؤ مؤرخہ ۲۶ رفروری ۱۹۲۶ء کی اِستقبالیہ کمیٹی کے صدر مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۷۷ء) ممبر مرکزی خلافت کمیٹی وصدرِ خلافت کمیٹی اَوَدھ اپنے صدارتی کلمات میں ارشاد فرماتے ہیں:

''بزرگو! عزیزو! آج مختلف سَمتوں سے یہ صدائیں بلند ہو رہی ہیں کہ:

اب خلافت کمیٹی کی ضرورت کیا باقی رہی؟ اور اگر کچھ ضرورت ہو بھی تو کیا یہ ضرور ہے کہ اس کو اس نام سے باقی رکھا جائے؟

حیران ہوں کہ اِن سوالات کا کیا جواب دوں؟ اس سے بڑھ کر حیرانی یہ ہے کہ یہ

سوالات کسی مسلمان کے دل میں پیدا کیوں کر ہوئے؟

جس انسان کو خلافت سے عار آتا ہے، درحقیقت اسے خود اپنے وجود سے عار آنا چاہیے کہ انسان کی حیثیت اس کائناتِ ارضی میں بجز خلیفہ کے کچھ اور نہیں۔

اور یہ کسی فقیہ کا فتویٰ نہیں۔ کسی مؤرخ کی رائے نہیں۔ کسی بشر کا قول نہیں۔ بلکہ اس وقت جب نہ آدم کا وجود تھا اور نہ بنی آدم کا، نہ بشر کا نہ ابوالبشر کا۔ اُس وقت سب کے پیدا کرنے والے، سب کو نیست سے ہست کرنے والے نے صاف صاف صریح اور غیر مُشتبہ الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ: میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَة)

یہ نہیں ارشاد ہوا تھا کہ انسان کو حاکم پیدا کیا جائے گا، عالم پیدا کیا جائے گا، شاعر پیدا کیا جائے گا، فقیہ پیدا کیا جائے گا، مجاہد پیدا کیا جائے گا۔ بلکہ صرف اور صرف یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اسے روئے زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا جائے گا۔ انسانوں کے مختلف طبقے اور گروہ شروع سے قائم ہیں اور آخر تک قائم رہیں گے۔''

(مولانا محمد علی جوہر! سیرت وافکار۔ از عبدالماجد دریابادی)

حُجَّۃ الاسلام امام محمد غزالی (وصال ۵۰۵ھ) اور امامُ الھند شاہ ولی اللّٰہ محدّث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی تحریر گذشتہ صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ خلیفۂ شرعی کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے۔

اِس منصبِ خلافتِ شرعی دینی کے فرائض بڑے عظیم ہیں۔ چنانچہ خلافت کی جامع ومانع تعریف کرتے ہوئے اِزالۃُ الخَفاء عن خِلافۃِ الخُلَفاء میں شاہ ولی اللّٰہ مُحدّث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

الخِلافۃُ ھِی الرِّءَاسۃُ العامَّۃ فی التَّصَدِّی لِاِقامۃِ الدّین واِحیاءِ العُلومِ الدِّینیہ واِقامۃِ اَرکانِ الاسلام والقیام بالجھاد ومایتعلّق بہٖ مِن ترتیبِ الجُیوش والفرض لِلمقاتلۃ واِعطاءِ ھِم مِنَ الفئی والقیام بِالقضاءِ واِقامۃِ الحُدودِ ورَفعِ المَظالم والامرِ بِالمعروفِ والنَّھی عنِ المُنکرِ نِیابۃً عنِ النَّبی صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم۔

(اِزالۃُ الخفاء عن خِلافۃِ الخُلفاء۔ جلدِ اول مؤلّفہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی)

اپنی دانشوری واِنشاپردازی کے زور اور جھونک میں اگر مذکورہ دونوں لیڈر واڈیٹر صاحبان یہ گوہرافشانی بھی فرمادیتے تو ان کے ''تفقُّہ'' اور ان کی ''تاریخ دانی'' کی صلاحیت بھی آشکار ہو جاتی کہ:

(۱) ہندوستان کے مغل وسُوری ولُودی وتُغلق وغَوری وغَزنوی مسلم سلاطین ''خُلَفَا'' تھے اور ان کی حکومت وسلطنت ''خلافت'' تھی۔

(۲) ہندوستان کے عُلما وفُقہا ومُفتیانِ کرام آغازِ اَمر ہی سے ان ''خُلَفَا'' اور ان کی ''خلافت'' کو تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔

(۳) اسی بنیاد اور اسی تسلسل کو قائم وباقی رکھنے کے لئے عُثمانی تُرکی سلاطین کو ''خَلَفَاے اسلام'' سمجھ کر ان کی ''خلافت'' کے تحفُّظ وبَقا کو ہم نے اپنا مذھبی فریضہ قرار دے رکھا ہے۔

(۴) کتاب وسُنّت کے مَنصوص اَحکام کی روشنی میں ہر کافر ومشرک ومجوسی ویہود وہنود سے موالات کے یکساں حرام ہونے کے باوجود اِس وقت نصاریٰ کو مخصوص کر کے ان سے ''تَرکِ موالات'' اور ہنود کو مستثنیٰ کر کے ان سے وداد وموالات کو ہم جائز سمجھ رہے ہیں۔

(۵) ہندوستانی مسلمانوں کے اندر صلاحیت واِستطاعت وقدرت ہو یا نہ ہو، انھیں زُعَما وقائدین تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات جو حکم دیں اس پر عمل کرنا ان کا فریضۂ مذھبی ہے اور اسے نظر انداز کرنے والے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہے۔

(۶) مسلمانوں کی مذھبی وسیاسی قیادت صرف ہم کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم ہی ان کے منتخب ونامزَد نمائندہ بلکہ خلیفہ بھی ہیں۔

اور ہماری قیادت ونمائندگی کی باگ ڈور اُس ''مہاتما گاندھی'' کے محفوظ و''متقی ہاتھوں'' میں ہے جو ''بھارتی فلسفۂ حیات'' اور ''سوراجیہ'' کا صحیح نمائندہ اور قائدِ اعظم ہے۔ وغیرہ وغیرہ

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) ہی کے بَطن سے پیدا ہونے والی تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) کے بارے میں سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں:

'' یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد طویل نظر بندی سے رِہا ہو کر خلافت کے جلسوں میں شریک ہوئے اور پراونشل کانفرنس کے جلسہ کو جو ۲۹ رفروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں

منعقد ہوا، صدارت فرمائی۔

اور تَرکِ موالات کا شرعی پروگرام سب سے پہلی بار جناب موصوف نے پیش کیا۔ اس تجویز نے ہندوؤں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔

......ایک سَب کمیٹی میں مولانا ابوالکلام نے اپنا ''تَرکِ موالات'' کا پروگرام اور مہاتما گاندھی نے ''نان کوآپریشن'' کا پروگرام پیش کیا۔ حُسنِ اتفاق سے دونوں ایک تھے۔

............آخر کار ۳۰ رمئی ۱۹۲۰ء کو بنارس میں کانگریس کمیٹی کے جلسے نے بھی طے کر دیا کہ حکومت سے تَرکِ موالات کی جائے۔

اس کے ایک مہینے بعد یکم و ۲ رجون ۱۹۲۰ء کو ہندوستان کا ایک عظیم الشان مشترک جلسہ الٰہ آباد میں منعقد ہوا جس میں ''تَرکِ موالات'' کو باقاعدہ منظور کیا گیا۔

............۱۸ رجولائی ۱۹۲۰ء کو ایک اور زبردست جلسہ تَرکِ موالات کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اسی جولائی میں مسلمانوں میں ''ہجرت'' کی تحریک شروع ہوئی، اور ہجرتِ اول سِندھ سے شروع ہوئی۔

............یکم اگست ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے ایک عام ہڑتال کی۔ تَرکِ موالات کے لیڈر مہاتما گاندھی قرار پائے۔

............مگر اب وقت آیا کہ تُرکی نے اپنا مسئلہ حل ہونے کا خود انتظام کیا اور وہ یہ کہ اگست ۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں پر حملہ کر کے انہیں اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ تب یورپ کی طاقتوں نے ''لوزان کانفرنس'' طلب کی۔ مگر دِقّت یہ ہوئی کہ اس کانفرنس نے ''حکومتِ استنبول'' اور ''حکومتِ انگورہ'' دونوں کو شرکت کی دعوت دی۔ اس پر تُرکوں کی قومی اسمبلی کا جلسہ کیا گیا اور ۲۱ رنومبر ۱۹۲۲ء کو اس نے یہ طے کر دیا کہ:

خلافت اور سلطنت کو جُدا جُدا کر دیا جائے۔

............آخر ۱۹۲۳ء میں انگورہ اسمبلی نے طے کر دیا کہ وہاں جُمہوری سلطنت قائم کی جائے اور غیر مسلم بھی اس کا صدر ہو سکے گا۔

............جس خلافت کے قائم رکھنے کے لئے ہندوستان کے مسلمان اپنی جان ومال قربان کر رہے تھے، نوجوان تُرکوں نے اسی کے ہاتھوں سخت مصائب برداشت کیے تھے۔

سلطان عبد الحمید کے وقت سے ''خلافت'' اور ''اتحاد بین المسلمین'' (پین اسلامزم) اہلِ یورپ کے نزدیک خطرناک چیزیں تھیں مگرانہیں خطرناک چیزوں کے ذریعہ سلطانُ المعظّم اتحادیوں کی سازش سے، جو عیسائی تھے، انگورہ کے نوجوان تُرکوں کی سَرکوبی کرتے اور انہیں کافرقرار دے کران پر جہاد کرتے تھے۔

اس کا ردِّعمل ایک قدرتی عمل تھا۔ چنانچہ انگورہ میں حکومت قائم ہوتے ہی ''خلافت'' کا منصب توڑ دیا گیا اور ''شیخُ الاسلام'' کا عہدہ منسوخ کردیا گیا۔

اس کی اطلاع ہندوستان میں ۱۰؍مارچ ۱۹۲۴ء کو پہنچی جس کے صدمہ سے مسلمانانِ ہند بلبلا اٹھے۔'' (اَخذ و اقتباس، از ص: ۴۹۷، تا ص: ۵۰۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ از سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔ مطبوعہ مکتبۃ الحق، جوگیشوری، بمبئی)

مسٹر گاندھی کا ذِکر مسئلۂ خلافت وترکِ موالات وغیرہ میں بار بار آتا رہتا ہے اس لئے ایک اِجمالی تعارُف بقلم ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی نذرِ قارئین ہے:

''کرم چند گاندھی یعنی مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ء۔۱۹۴۸ء) کا نام بھی تحریکِ خلافت کے سَرکردہ رہنماؤں میں ہے۔ تحریکِ خلافت کا خمیر اگرچہ خلافتِ عثمانیہ کی بقا اور اس کے تحفظ کے لئے اُٹھا تھا لیکن اس کا نصبُ العین بھی آزادی تھا۔ جو آگے چل کر ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں ایسا تحلیل ہُوا اور ملک کے عوام میں آزادی کے لئے جاں فروشی کی ایسی روح پھونکی کہ اس کی مثال کسی اور ملک کی آزادی کی تاریخ میں شاید نہ مل سکے۔

تحریکِ خلافت کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ:

خلیفۃُ المسلمین تُرکی حکمراں کی اخلاقی اور مادی مدد کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی، لیکن پھر اس کا رِشتہ بنیادی طور پر ہندوستان کی جنگِ آزادی سے اُستوار ہوتا چلا گیا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت میں ہندوستان کے علاوہ اور کسی ملک بلکہ یوں کہیے کہ کسی مسلم ملک سے بھی کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

ایک اور تحیُّر خیز بات یہ ہے کہ:

سلطنتِ عثمانیہ اور خلیفۃُ المسلمین کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برادرانِ وطن نے اپنے طور پر اَخلاقی اور مادّی ہر طرح سے بھر پور امداد کی۔ نہ

صرف امداد کی بلکہ برادرِ وطن ''کرم چند'' جو اَب ''مہاتما گاندھی'' کہلانے لگے تھے، تحریکِ خلافت کے ایک قائد کے طور پر سامنے آئے۔

اُس وقت تحریکِ خلافت کے سرکردہ رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، شیخُ الھند مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مفتی کفایت اللہ، سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں، بنگال کے سرکردہ لیڈر فضلِ حق، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (امرتسر) ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی قومی سطح پر اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ یا کسی نہ کسی مقام پر اپنی الگ حیثیت رکھتے تھے۔

تاریخ کے طالب علموں کے ذہن میں یقیناً یہ سوال اُبھر رہا ہوگا کہ تحریکِ خلافت کا، یہ غیر مسلم، قائد کیوں بنا؟ اور اس کے پیچھے کیا عوامل تھے؟

تحریکِ خلافت کے ایک قائد کی حیثیت سے ''مہاتما گاندھی'' کی، خلافت کے سلسلے میں جو خدمات ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

مہاتما گاندھی نے اس تحریک کے ذریعہ بڑا قائدانہ کردار ادا کیا۔

اور پھر بڑی خوش اسلوبی سے:

تحریکِ خلافت کے پلیٹ فارم سے جنگِ آزادی کا وہ بِگل بجایا کہ اس نے بالآخر ہندوستان کو آزادیِ کامل کی وہ صبح عطا کی جس کا ملک وقوم کو صدیوں سے انتظار تھا۔''

(ص ۱۶۴ و ۱۶۵۔ تحریکِ خلافت وجدوجہدِ آزادی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۲۰۰۷ء)

''مولانا شوکت علی نے خلافت کانفرنس جو کوکناڈا میں ۲۷؍دسمبر ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوئی، اپنے خطبۂ صدارت کے دوران کہا کہ:

''مہاتما گاندھی اس تحریک میں ہمہ تن شریک ہوگئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ''خلافت کا کام کرنے والا'' کہتے تھے۔

تمام ملک کا دورہ ''کانگریس کے خرچ'' سے نہیں کرتے تھے بلکہ ''بہ حیثیت خلافت کا رُکن'' کرتے تھے۔ اور ''خلافت کے فنڈ'' سے ہی شروع سے آخر تک دورے کرتے رہے ''۔ الخ (ص ۱۶۷۔ تحریکِ خلافت وجدجہدِ آزادی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ مطبوعہ

دہلی۔۲۰۰۷ء)

..........''نیشنل کانگریس'' کے پاس سرمایے کی کمی تھی ،اس وجہ سے ''تحریکِ عدمِ تعاون'' کی ابتدا بھی ''خلافت فنڈ'' سے کی گئی۔ص ۶۳۔انتخابِ خطباتِ تحریکِ خلافت ۔ مرتّبہ محمود الٰہی۔اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ۔۱۹۸۸ء۔

(ص ۱۶۸۔تحریکِ خلافت وجد جہدِ آزادی۔مؤلّفہ ڈاکٹر منورحسن کمال قاسمی۔مطبوعہ دہلی۔۲۰۰۷ء)

قارئین کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ مسئلۂ خلافت پر اس زمانے میں کافی علمی وقلمی معرکہ آرائی ہوئی تھی اور خلافت کی شرعی حیثیت بار بار زیرِ بحث آتی رہی۔چنانچہ خلافتِ شرعیہ اور خلیفۂ شرعی کے لئے شرائطِ سبعہ وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے امام احمد رضا بریلوی لکھتے ہیں:

''خلیفہ میں قریشی ہونے کی شرط جمیع عُلما کا مذہب ہے۔اور بے شک اسی سے صدیقِ اکبر وفاروقِ اعظم نے روزِ سقیفہ، اَنصار پر حُجت فرمائی۔اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہ کیا۔اور بے شک عُلما نے اسے مسائلِ اجماع میں گِنا اور سلفِ صالح میں کوئی قول یا فعل اس کے خلاف منقول نہ ہوا۔یوں ہی تمام زمانوں میں عُلماے مابعد سے'' ۔الخ (ص:۳۶۔ **دَوَامُ العَیش فی الائِمَّةِ من قُریش**۔مطبوعہ بریلی)

خلافتِ شرعیہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے حُجَّۃُ الاسلام امام محمد غزالی (وصال ۵۰۵ھ) اور امامُ الھند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے تحقیق وتفصیل کے ساتھ احادیثِ کریمہ کی روشنی میں لکھا ہے کہ استحقاقِ خلافت کے لئے پدری نسب کے لحاظ سے قریشی ہونا شرط ہے۔(دیکھیے **اَلاِقتصاد فی الاعتقاد** مؤلّفہ امام محمد غزالی۔اور **اِزالۃُ الخَفاء عن خِلافۃِ الخُلفاء**۔جلدِ اول۔مؤلّفہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی)

علمِ کلام کی اپنی انتہائی اہم کتاب ''**المُعتَقَدُ المُنتَقَد**'' (۱۲۷۰ھ) میں **سیفُ اللّٰہِ المَسلُول** علّامہ فضلِ رسول عثمانی قادری بدایونی (وصال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) خلافت کے لئے قرشیت کے لازم ہونے کی صراحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ویشترط بعد الاسلام الذکورۃ ،والورعُ،والعلمُ،والقیامِ بِاُمورِ الاِمامَۃ ،ونسبُ قریش،خلافاً لِکثیرٍ مِنَ المُعتزلۃ۔

ولایشترط کونہ ھاشمیاً ولامعصوماً۔لِاَنَ العِصمۃ مِن خصائصِ الانبیاء خِلافاً لِلرَّوَافِض۔

(ص۱۹۱۔**البابُ الرابع فی الامامۃ ۔المعتقَدالمنتقَد۔لِلعلامۃ فضل رسول العُثمانی القادری البدایونی** ۔زیرِ نگرانی واہتمام المجمع الاسلامی۔مبارک پور۔ناشر رضا اکیڈمی بمبئی۔صفر ۱۴۲۰ھ/جون ۱۹۹۹ء)

آپ کے صاحبزادے مُحبّ الرسول تاجُ الفحول مولانا عبدالقادر عثمانی قادری برکاتی (وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) اپنی مختصر اور جامع کتاب ''**احسنُ الکلامِ فی تحقیقِ عقائدِ الاسلام**'' میں تحریر فرماتے ہیں:

ونعتقد ان یجب علی المسلمین فی کل عصرٍ وزمانٍ نَصبُ امامٍ مِن قُرَیش لِاجراءِ احکامِ الایمان۔

(ص۳۳۔**القولُ الخامس فی بحثِ الامامۃ ۔اَحسنُ الکلام فی تحقیقِ عقائدِ الاسلام** ۔مؤلّفہ حضرت مولانا عبدالقادر عثمانی قادری بدایونی۔طبعِ جدید ۱۴۳۳ھ/۲۰۱۲ء۔تاجُ الفحول اکیڈمی۔بدایوں۔طبعِ قدیم ۱۳۰۰ھ/۱۸۹۹ء)

اس کا اردو ترجمہ اسی کتاب میں اس طرح ہے:

ہمارا عقیدہ ہے کہ:

ہر زمانے میں مسلمانوں پر ایمان کے احکام جاری کرنے کے لئے خاندانِ قریش میں سے ایک امام برحق کو مقرر کرنا لازم وضروری ہے۔

(ص۷۱۔**احسنُ الکلام** ۔مطبوعہ تاجُ الفحول اکیڈمی،بدایوں)

حضرت سید مہر علی چشتی (متوفی ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۶ء۔گولڑہ ضلع راولپنڈی،پنجاب) مسئلۂ خلافت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''صحیح حدیث کی رُو سے جناب نبی کریم ﷺ کے بعد صرف تیس (۳۰) برس تک اسلامی خلافت (راشدہ) قائم رہی۔

بعد اَزاں سلطنت ہوگئی تھی جس کے لئے حدیث شریف میں ''عضوضیت'' اور ''جبر'' کا مفہوم آیا ہے۔مذہبِ اسلام ایسی سلطنت کو خلافتِ جاریہ ضرور یہ قرار دیتے ہوئے اس

کے جواز کی ذِمّہ داری قبول کرے تو یزید بن معاویہ اور منصور عباسی بھی سلاطینِ جبابرہ کی بجائے خُلفائے نبوی قرار پائیں گے۔'' الخ۔ (ص:۲۷۰۔ مہرِ منیر، مؤلّفہ مولانا فیض احمد، مطبوعہ پاک وہند)

واضح رہے کہ جماعتِ دیوبند کے شیخُ الھند مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۸۵۱ء۔ نومبر ۱۹۲۰ء) کی جانب سے اجلاسِ دوم جمعیۃ العلماء ہند منعقدہ دہلی (۱۹ تا ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء) میں جو خطبۂ صدارت پیش ہوا تھا اس خطبۂ صدارت میں تُرکی خلافت کے بارے میں اپنے خیال وموقف کا اس طرح اظہار کیا گیا ہے:

''دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطانِ تُرکی کی واحد سلطنت، اسلامی شوکت کی ضامن تھی۔ اور حرمین شریفین، بیت المقدس، عراق وغیرہ کے تمام اَماکنِ مقدسہ ومقاماتِ محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔

جمہور اہلِ اسلام کے اتفاق سے سلطانِ تُرکی، خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے۔'' (خُطباتِ جمعیۃ علماء ہند۔ مطبوعہ لاہور ولکھنؤ)

تحریکِ خلافت کی بنیاد، اس کا مقصد، اس کی بے اعتدالی، اس کے انجام وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جن کا مطالعہ متعلقہ کتب ورسائل میں کیا جا سکتا ہے۔

حضرت سید شاہ ابو القاسم محمد اسمٰعیل حسن قادری برکاتی مارہروی (ولادت محرمُ الحرام ۱۲۷۲ھ۔ وصال صفر المظفر ۱۳۴۷ھ) اپنے ایک مکتوب محرَّرہ غرَّۂ جمادی الآخرہ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء، بنام محمد عوض، سیتاپور (اَوَدھ) تحریر فرماتے ہیں:

............خلافت کمیٹی کی شرکت واِعانت خواہ وہ بصورتِ ممبری ہو یا کسی طرح...... سخت ہلاکت اور دین وایمان کی اشد درجہ تباہی وبربادی کی طرف منجر ہے۔

.... یہ کمیٹی غریب وناواقف مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے نام تو لیتی ہے حمایتِ سلطنتِ اسلامیہ ومقاماتِ مقدسہ واِعانتِ مظلومینِ تُرک کا، اور کام کرتی ہے ''سوراج'' یعنی ہندوراج کا۔

جس کی اندھادھند میں ابھی یہ حالت ہے کہ:

مسٹر ابو الکلام آزاد وشوکت علی ومحمد علی ایک ایک ہندو مُشرک کے بدلے دس دس بیس بیس مسلمانوں کی جانیں بھینٹ چڑھانے کو تیار اور اپنے ہندو بھائیوں کے پیچھے خاص خلافت سے جس کے یہ سرگرم حامی بنتے ہیں، برسرِ پیکار ہیں۔

کون سی، ایمان واسلام سے ضد تھی جو ان نام نہاد خُدّامِ خلافت نے نہ باندھی؟

............اس کمیٹی کی ضلالات و بطالات وکفریات عُلمائے اہلِ سُنّت نے اپنی تحریرات وتقریرات میں کھول کھول کر دکھا دی ہیں۔ برخوردار محمد میاں سَلّمہٗ نے اپنی تحریروں میں ان خلافت کمیٹیوں میں شرکت کی سخت اشد ہلاکت عیاں کردی۔

............فقیر بِحمدِ اللّٰہ وحُسنِ تَوفیقِہٖ اس کمیٹی اور اس میں جو کسی طرح شریک ہوا، اوس سے قطعاً بیزار وبری وبے علاقہ ہے۔

''انگورہ فنڈ'' بھی غریب ناواقف جُہّال عوام سے دام سیدھے کرنے کا ایک خوش آئند نام ہے۔ ورنہ حقیقت اس کی بھی وہی ہے جو خلافت کمیٹی کے اور دوسرے جاری کردہ فنڈوں کے چندوں کی ہوئی۔

لیڈروں نے خوب گُل چھَرّے اُڑائے............اور پھر جو اس سے بچا اس سے اپنے ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کا مطلقُ العنان حکمراں بنانے کا کام کیا۔

اسی خاص انگورہ فنڈ کی مرکزی کمیٹی بمبئی کے صدر اور نائب صدر اور سکریٹریوں کے دستخط سے ابھی حال ہی میں ۱۸ر جنوری کے ''ہمدم'' میں اعلان شائع ہوا۔ جس میں یہ تمام لیڈران بیخ کنِ اسلام صاف صاف لکھتے ہیں کہ:

ہم نے نہایت وفاداری سے سب سے بڑے متقی اور پرہیزگار شخص یعنی ''مہاتما گاندھی'' کی واحد مطلقُ العنان حکومت تسلیم کرلی ہے۔ جب ہمارے یہ مطلقُ العنان حکمراں حکم دیں تو ہمیں بے چون وچرا جیل خانے بھر دینے چاہئیں۔ اور ان کا ہر حکم بے کم وکاست ماننا سب سے زائد اہم اور ضروری ہے۔

دیکھو! نام تو ہے کہ یہ انگورہ فنڈ کے لئے غریب مظلوم تُرکوں کی اِعانت کے لئے روپیہ جمع کرنے کے واسطے ہدایات دے رہے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غریب وناواقف عوام کو اپنے مُشرِک امام کی مطلقُ العنان واحد حکومت مَنوا رہے ہیں۔ ایسے فنڈوں میں چندہ دینا،

دین وایمان کو ہلاک کرنا ہے۔

تُرک ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔ ہم اُون کی بطریقِ جائز ومُفید اپنی حتی الوسع اِمداد واِعانت کریں، ہمارا دین وایمان ہے۔ مگر اِن فنڈوں میں دینا تُرکوں کی اِعانت نہیں بلکہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانے پر اِعانت ہے۔ **والعیاذُ باللّٰہِ تعالیٰ۔**

.... ان کے اس کہنے میں نہ آؤ کہ یہ چندہ انگورہ کو بھیجا جائے گا۔ یہ سلطنتِ اسلامیہ کی حفاظت میں لگے گا۔ یہ چُنیں چُناں ہوگا۔

اول تو ان کے ان زبانی دَم دِلاسوں کی حالت خود ان کے اعمال ہی سے عیاں ہے کہ انگورہ، ونگورہ کہیں نہیں جائے گا۔ لیڈران کے پیٹ میں سما جائے گا۔ جو اس سے پہلے جانے کتنے ہزاروں، لاکھوں کے چندوں کی صاف ڈِکار لے چکے ہیں۔

جو اس سے بچے گا وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنانے میں کام آئے گا۔" اِلیٰ آخرہٖ۔"

فقیر محمد اسمٰعیل حسن عفی عنہ قادری برکاتی۔ از خانقاہِ برکاتیہ، مارَہرہ۔ دوشنبہ، غرّہٗ جمادیٰ الآخرہ ۱۳۴۰ھ، (ص: ۵۸، تا ۶۱، مفاوضاتِ طیبہ، (۱۳۵۴ھ) جمع وترتیب حضرت سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی۔ دارُالاشاعت برکاتی، خانقاہ برکاتیہ، مارَہرہ ضلع ایٹہ)

تُرکی اِقتدار وحکومت کے بدلتے حالات نے مرکزی خلافت کمیٹی اور اس کے عُلما وزُعَما کو تشویش ناک حالات اور عبرت ناک نتائج سے دوچار کر دیا۔

جولائی ۱۹۱۹ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں تُرکی کے اندر ایک قومی تحریک اُبھری جس نے ۱۹۲۱ء کے آغاز ہی میں ایک قومی حکومت تشکیل دے کر سلطانِ تُرکی کے اختیارات کا خاتمہ کر دیا۔

۱۰؍اگست ۱۹۲۰ء کو مغربی ممالک اور تُرکی کے درمیان ہونے والے "معاھدۂ سیورے" ہو چکا تھا جس سے قومی تحریک کو طاقت ملی تھی۔ پھر اتحادیوں اور تُرکوں کے درمیان "معاھدۂ لوزان" ".Treaty of lauzanae" نے تُرکی حدودِ سلطنت طے کرنے کے ساتھ مختلف تنازعات کا فیصلہ کر دیا۔

۲۱؍نومبر ۱۹۲۲ء کو مصطفیٰ کمال پاشا کی قومی حکومت نے خلافت کو بے اثر کر دیا تھا۔ پھر ۲؍مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ خاتمۂ خلافت کا باضابطہ اعلان کر دیا۔

چَوراچَوری (گورکھ پور) حادثہ (۱۹۲۲ء) کو بنیاد بنا کر گاندھی نے خلافتی وموالاتی لیڈروں سے کوئی مشورہ کیے بغیر محض کانگریس سے مشورہ کر کے "تحریکِ تَرکِ موالات" واپس لینے کا اعلان اس سے پہلے ہی کر دیا تھا۔ اب تُرکی کی قومی جمہوری حکومت نے خلافت کی بے اثری اور اس کے خاتمہ کی قرارداد پاس کر دی۔

ان سرگرمیوں اور بدلتے فیصلوں سے ظاہر ہے کہ خاتمۂ تَرکِ موالات وخلافت کے فیصلہ واعلان کے پیچھے مذھبی نہیں بلکہ سیاسی وجوہ واَسباب تھے۔ ایسی صورت میں خلافتی وموالاتی عُلما وزُعَما کو جس خِفَّت وندامت اور اضطراب وبے چینی سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اسے ادنیٰ عقل وفہم رکھنے والا آدمی بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ **فَاعْتَبِرُوْا یاُولِی الْاَبْصَار۔**

مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کی یہ دو تحریریں جو "خاتمۂ خلافت" سے پہلے اور بعد کی ہیں، آج بھی مسلمانوں کو دعوتِ غور وفکر دے رہی ہیں:

"اولین کام روپے کی اِعانت ہے۔ اور تیس لاکھ روپے آپ کے پاس فراہم شدہ موجود ہے۔ پس یہ کیا بے غیرتی اور دل اور روح کی موت ہے کہ زخمی تُرکوں کی زبان سے **العَطش العَطش** کی چیخیں آ رہی ہیں۔ آپ کے پاس پانی کا ایک لبریز حوض موجود ہے۔ مگر ان تشنہ کاموں کو اس سے ایک قطرہ بھی نصیب نہیں؟

آپ کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ آپ پانی کو کوٹھریوں میں مقفّل کر رہے ہیں؟

کم بخت یونیورسٹی (علی گڑھ) مسلمانوں کے کیا کام آئے گی جب آج فلی پولی اور قرق قلعسی کے میدانوں کے زخمیوں کو اس فنڈ سے مَرہم کی ایک پٹی بھی نصیب نہیں؟

میں کیا کہتا ہوں؟ حالاں کہ یہ الفاظ تو میرے مطلب کے اظہار کے لئے کافی نہیں۔ مجھ کو کہنا چاہیے کہ:

اللہ اور رسول اور ملائکہ کی لعنت ہو، اس یونیورسٹی (علی گڑھ) پر جس کا تیس لاکھ روپیہ ہندوستان کے بینکوں میں جمع ہو اور مسلمان زخمیوں کی صفیں میدانِ قتل کی برف باری میں ایڑیاں رَگڑ رہی ہوں۔" (ص ۲۔ الہلال۔ کلکتہ۔ ۶؍نومبر ۱۹۱۲ء بحوالہ ص ۲۷۲ تحریکِ خلافت وجدوجہدِ آزادی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ مطبوعہ دہلی)

"جس مَنصبِ خلافت کو انھوں (مصطفیٰ کمال پاشا) نے موقوف کیا ہے، وہ اسلامی

خلافت نہ تھی۔ یہ ایک ساختہ منصب تھا جو انھوں نے خود غلطی سے قرار دیا تھا۔ جس دن انھوں نے اپنا صدر منتخب کیا، اسی دن خلیفہ بھی منتخب ہوگیا۔ کیوں کہ:

خلیفہ اور درپیش حکومت دو الگ الگ منصب نہیں ہیں، ایک ہی منصب کے دو مختلف نام ہیں۔

پس اگر انھوں نے اس خود ساختہ منصب کو موقوف کردیا اور کہتے ہیں کہ حکومت کی موجودگی میں یہ ضروری ہے تو جہاں تک اسلامی خلافت کا تعلق ہے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' (ص۲۱۲۔ تبرکاتِ آزاد مرتّبہ غلام رسول مہر۔ مطبوعہ لاہور۔ بحوالہ ص ۲۷۳۔ تحریکِ خلافت اور جدوجہدِ آزادی، مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ کوچہ پنڈت، لال کنواں۔ دہلی۔ ۲۰۰۷ء)

مولانا آزاد کی تبدیلیِ موقف کا یہ حادثہ صرف مسئلۂ خلافت میں نہیں ہے بلکہ فلسفۂ گاندھی سے مَسحور ہونے سے پہلے اور بعد کے موقف میں بھی ان کے یہاں بنیادی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان پر ایک دَور وہ بھی گذرا ہے کہ وہ بڑے طَنطَنہ اور ہمہمہ کے ساتھ اِس خیال وموَقِف کے مبلّغ تھے کہ:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ:

جو مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لئے بھی اس کتاب (قرآنِ حکیم) کے سِوا دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہ نُما بنالے وہ مسلم نہیں بلکہ مُشرِک فی صفاتِ اللّٰہ کی طرح شرک فی صفاتِ القُرآن کا مُجرم اور اس لئے مُشرِک ہے۔

اسلام اس سے بہت ارفع واعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی ''پولیٹکل پالیسی'' قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔

مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ:

وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جُھک کر نیا راستہ پیدا کریں۔

ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔

وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہو جائے۔''

(الہلال، کلکتہ۔ شمارہ ۱۹/دسمبر ۱۹۱۲ء)

تبدیلیِ فکر میں غالبًا سحرِ سامری کا ہی یہ اثر ہے کہ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''اس (اسلام) نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کردیا ہے کہ:

اس کی دعوت کا مقصد اس کے سِوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہوجائیں۔ وہ کہتا ہے کہ: تمام مذاہب سچے ہیں۔''

(ص ۱۶۳ و ۱۶۴۔ ترجمانُ القرآن۔ جلد اول)

اور اپنی اثر آفرینی کے ذریعہ گاندھی نے مولانا آزاد سے جو چیز حاصل کی وہ کچھ اس طرح ہے کہ جامعہ مِلّیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے ایک جلسے (۱۹۳۱ء) کو خطاب کرتے ہوئے گاندھی نے انکشاف کیا کہ:

''مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا کہ اسلام ایسا تنگ نظر مذہب نہیں ہوسکتا کہ وہ نجات وسعادت کو اپنے پیروؤں تک ہی محدود رکھے اور سچائیاں صرف اپنے اندر ہی بتلائے۔ لیکن مجھے اس بات کی سند کہیں سے نہیں ملتی تھی۔

اب جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر شائع کی ہے تو مجھے اس خیال کی سند مل گئی کہ: اسلام تمام مذاہب میں یکساں سچائیوں کا مدّعی ہے۔

لہٰذا ہم نے اس تفسیر کے متعلقہ ٹکڑوں کا ہندی میں ترجمہ کرکے شائع کرادیا ہے۔''

(ص ۱۳۵۔ مسلم انڈیا۔ از کاش البرنی۔ مطبوعہ اسٹار لائٹ پبلشنگ کمپنی، لاہور ۱۹۴۲ء)

یہاں چند جدید تحریریں، تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے سلسلے میں قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں:

جناب محمد الیاس اعظمی سابق صدر مسلم مجلس اتر پردیش وسابق ممبر پارلیمنٹ لکھتے ہیں:

''۱۹۲۱ء تک کانگریس اپنی حکمتِ عملی یا مسلم لیڈر شپ کی حماقتوں کی وجہ سے تحریکِ خلافت اور تَرکِ موالات کے ذریعہ مسلمانوں کو مکمل شکست دے چکی تھی۔ اور مسلمانوں کو ''برہمنی ورن آشرم'' کا ایک مَفلوج حصہ بنادینے کے لئے وہ پوری طاقت کے ساتھ ''مسلم ماس کنٹکٹ'' اسکیم پر یک سُو ہوچکی تھی۔ اس کے سامنے کوئی چیلنج نہیں رہ گیا تھا۔'' (ص:۳۱، مسلمانوں کی سیاست، زخم اور علاج۔ از محمد الیاس اعظمی۔ خواجہ باغ، چِنہٹ، لکھنؤ۔ طبعِ اول

جون۱۹۹۵ء)

'' کانگریس کومعلوم تھا کہ تحریکِ خلافت میں انگریز سے بھڑا ہوا مسلمان ''سودیشی'' اور ''تَرکِ موالات'' کو بھی اپنا کر انگریز سے مزید دور ہوگا اور ہُوا بھی یہی۔

چند چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کو چھوڑ کر اونچی ذات کے کسی ہندو نے اس تحریک کو گھاس بھی نہیں ڈالی۔ ہوسکتا ہے کہ کانگریس دل سے یہی چاہتی بھی رہی ہو۔

البتّہ انگریز دشمنی میں ''اندھا مسلمان'' چلتا پھرتا ''کھنڈر بھنڈار'' بن گیا۔

کانگریس کے بَنیا سرمایہ دار اور اس کے ٹاٹا اور بِرلا بدستور کانگریس سے جُڑے بھی رہے اور بدیسی تجارت بھی کرتے رہے۔

گاندھی بھی سودیشی تحریک کی حمایت حاصل کرنے بنارس ہندو یونیورسٹی گئے۔ وہاں پنڈت مدن موہن مالویہ نے انہیں گھسنے بھی نہیں دیا۔ نہ کسی نے ان سے پوچھا کہ تم کس لئے اور کہاں سے آئے ہو؟ لیکن جب گاندھی جی اسی مقصد سے علی گڑھ گئے تو باوجودیکہ مسلم یونیورسٹی ابھی نئی نئی ملی تھی، وہاں کے طلبہ نے ان کی حمایت میں یونیورسٹی بند کرادی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

جب مِلّت کے جذبات صحیح یا غلط طور پر بھڑکا دیئے جائیں تو صرف ''مُلاَّ'' ہی نہیں ''مِسٹر'' بھی بہ جایا کرتے ہیں۔

بہرحال! اس تحریک سے کانگریس کے مطلوبہ مقاصد پورے ہوتے ہی نیز ترکی میں خلافت کے خاتمہ کے ساتھ ہی گاندھی نے ''چَورَاچَورِی'' (گورکھ پور) تشدّد کا بہانہ لے کر یہ تحریک ختم کردی۔

ان حالات میں عام مسلمانوں کا اپنی لیڈرشپ سے اعتماد اُٹھ جانا ایک فطری امر تھا۔ اب مسلمانوں کا ہر لیڈر بالکل بے وزن اور ہر تنظیم نیم مُردہ حالت تک پہنچ گئی۔''
(ص:۲۶و۲۷، مسلمانوں کی سیاست، زخم اور علاج۔ از محمد الیاس اعظمی، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۹۵ء)

'' کانگریسی مسلمانوں نے صرف اپنی ایک آنکھ کھلی رکھی تھی۔ وہ صرف انگریز کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اُن دِنوں چوں کہ سارے پریس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا، اس لئے حضرت مولانا

احمد رضا خاں بریلوی اور آپ کے ہم خیال لوگوں کے خلاف سخت پروپگنڈہ کیا گیا اور انہیں بدنام کرنے کی مُہم چلائی گئی۔

لیکن تاریخ نے انہیں حضرات کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اب اس پروپگنڈے کا طلسم ٹوٹ رہا ہے، اور حق کھل کر سامنے آرہا ہے۔'' (ص:۱۲۰، پاکستان کا پس منظر و پیش منظر، مطبوعہ ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، دانش گاہِ پنجاب، لاہور۔ طبعِ سوم ۱۹۸۹ء از میاں عبدالرشید، کالم نگار بعنوان ''نوائے بصیرت'' روزنامہ نوائے وقت، لاہور)

'' اگر گاندھی نے خلافت موومنٹ کا ساتھ دیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ خلافت کے خواہاں تھے، کیوں کہ خلافت اس وقت خلفائے راشدین والی خلافت رہی ہی نہیں تھی۔

گاندھی نے سوچا کہ:

اگر اسی بہانے ہندوستانی مسلمان اس کے ساتھ آتے ہیں تو کیا ہرج ہے؟

ہمیں تو یہ بعد میں معلوم ہوا کہ خلافت تحریک ہمارے لئے بالکل بے فیض تھی۔'' (ص:۳۰، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، شمارہ ۲۵؍نومبر، ۲۰۰۶ء۔ بقلم حسن کمال)

'' خلافت تحریک کے لئے مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے گاندھی نے اسے کانگریس کے پروگرام میں شامل کرلیا اور اس طرح کانگریس کو مسلمانوں کی حمایت مل گئی۔

چنانچہ جب کانگریس کا ۳۵ رواں اجلاس زیرِ صدارت آچاریہ راگھو، ناگ پور میں منعقد ہوا تو اجلاس میں 14852 مندوبین شریک تھے جس میں اکثریت یعنی 10500 صرف مسلمانوں کی تھی۔

اس اجلاس کی تجویز کے تحت یکم اگست ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی نے تَرکِ موالات کی تحریک شروع کی۔'' (ص:۴۴و۴۵، ماہنامہ تہذیبُ الاخلاق علی گڑھ، جلد ۱۹، شمارہ فروری ۲۰۰۰ء۔ بقلم مختار احمد مکی، کریم کالج، جمشید پور۔ بہار)

جامعہ مِلّیہ اسلامیہ نئی دہلی کے جشنِ تاسیس کی سالانہ تقریب (۲۹؍اکتوبر ۲۰۱۱ء) پر اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کرتے ہوئے محمود عالم صدیقی ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، لکھتے ہیں:

(دو چار ابتدائی جملوں کے بعد) جب تَرکِ موالات کے تحت سرکاری اسکولوں،

کالجوں سے تعلیم چھوڑنے کی باری آئی تو گاندھی جی نے ان ہندو طلبہ سے ترکِ موالات کے تحت تعلیم چھوڑنے کا مطالبہ نہیں کیا جو بنارس ہندو کالج اور دیگر سرکاری کالجوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ تاہم گاندھی جی کے ساتھ مل کر ہمارے مسلم لیڈران نے اپنا پورا زور اُن مسلم طلبہ کو سرکاری تعلیمی اداروں سے نکالنے پر صَرف کر دیا جو علی گڑھ کالج اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں زیر تعلیم تھے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ میں زیرِ تعلیم طلبہ جنہوں نے ترکِ موالات کی وجہ سے اپنی تعلیم ترک کی تھی، ان کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں ہی ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو مدرسہ کامیابی کے منازل طے نہیں کر سکا، اور حوادثِ زمانہ کا شکار ہو گیا۔

خدا جانے اُن طلبہ کا کیا حشر ہوا جو مدرسہ عالیہ سے تعلیم چھوڑ کر اس مدرسہ سے منسلک ہوئے تھے؟

ادھر جن طلبہ نے ترکِ موالات کی وجہ سے علی گڑھ مسلم کالج کو چھوڑا تھا، ان کی تعلیم کے لئے علی گڑھ میں ہی ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کا وجود عمل آیا۔

جامعہ وہاں ایک مدرسہ کی طرح کام کر رہا تھا اور قریب تھا کہ اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو کلکتہ میں مولانا آزاد کے قائم شدہ مدرسہ کا ہوا تھا۔ تاہم عین وقت پر علی گڑھ کے ہی ایک ہونہار پروڈکٹ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو جرمنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، نے اسے آکر سنبھالا اور اپنی مالی و جانی خدمات سے اس ادارے کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔

اگر ذاکر صاحب نہ ہوتے تو اس ادارے کی حالت بھی وہی ہوتی جو مولانا آزاد کے قائم شدہ مدرسہ کی ہوئی تھی۔ اس طرح قوم کو دو بڑے نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

اس تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو جامعہ کی تاسیس ایک منفی قدم تھا اور جامعہ اسی سوچ کے ساتھ کام کرتا۔ کیوں کہ اس ترکِ موالات کی تحریک کی وجہ سے سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلیم کو اور سرکاری نوکریوں کو چھوڑنے والے زیادہ تر صاحبان، مسلمان ہی تھے۔

اس تحریک کا منفی پہلو واضح طور پر آزادی کے بعد سامنے آیا کہ:

آج ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت پس ماندہ قوموں سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔

بلاشبہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم، آزاد ہندوستان میں حکومتوں کا مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک، جہاں مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب ہے وہیں دوسری طرف ترکِ موالات تحریک سے جُڑے ہوئے مسلم لیڈران کے ان جیسے فیصلوں کا بھی مسلمانوں کی پسماندگی کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار رہا ہے۔

واضح رہے کہ گاندھی جی کی اس تحریک سے متأثر ہو کر جن مسلمانوں نے اپنی تعلیم اور سرکاری نوکریوں کو خیرباد کہا تھا، تقسیمِ ہند کے بعد ان میں سے زیادہ تر مسلمان یہیں ہندوستان میں قیام پذیر رہے۔

اگر وہ مسلمان اپنی سرکاری نوکریوں کو نہ چھوڑتے تو شاید آج مسلمانوں کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی۔

بہرکیف! ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس تاریخی ادارے کو عین وقت پر آکر سنبھالا اور اس کا رُخ مثبت پہلو کی طرف کر دیا۔ جس کی وجہ سے جامعہ آج پوری قوم و مِلّت میں علم کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ اس لئے میری نظر میں:

جامعہ کا یومِ تاسیس منانا کسی طرح درست نہیں، کیوں کہ یہ جشن، تاریخ کے اُن گہرے زخموں کو ہرا کر دیتا ہے جس سے یہ قوم کبھی لہولہان ہوئی تھی۔''

(روزنامہ انقلاب، دہلی۔ شمارہ ۳/نومبر ۲۰۱۱ء۔ بقلم محمود عالم صدیقی۔ ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دہلی)

☆☆☆☆

تحریکِ ترکِ موالات (۱۹۲۰ء)

گزشتہ صفحات میں تحریکِ خلافت کے ساتھ تحریکِ ترکِ موالات کے بارے میں بھی اچھا خاصا مواد آ چکا ہے تاہم بعض اہم پہلوؤں کی واضح نشان دہی کے لئے ''تحریکِ ترکِ موالات'' کے عنوان سے مزید کچھ چیزیں پیش کی جا رہی ہیں جن سے اِس تحریک کے کچھ نئے گوشے اور مقاصد ونتائج واضح ہو کر سامنے آ جائیں گے۔

سابقہ حقائق سے واضح ہو چکا ہے کہ اپنے منصوبہ کے مطابق تحریکِ خلافت کی جذباتی سرگرمیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسٹر گاندھی وجواہر لال نہرو اور ان کے بعض دوسرے ساتھیوں نے نہ صرف یہ کہ کھل کر مسلم لیڈروں کا ساتھ دیا بلکہ کانگریس نے انہیں ایام میں بماہِ اگست ۱۹۲۰ء ترکِ موالات کا اعلان کر کے اپنے اصل منصوبے کی طرف پیش قدمی کر دی۔

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی رجب ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) جو تحریکِ خلافت کے مرکزی قائد اور فرنگی محل لکھنؤ کے معروف عالمِ دین تھے، اُن کا ''تحریک عدمِ تعاون'' اور ''تحریکِ ترکِ موالات'' کے دوران یہ حال تھا کہ خواجہ حسن نظامی دہلوی (متوفی ۱۹۵۴ء) کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

مُکرَّمی دَامَ مَجدُھُم — السَّلامُ علیکم —

جناب کا تار موصول ہوا۔ فقیر ''نان کوآپریشن'' کے مسئلے میں بالکل پَس رَو گاندھی صاحب کا ہے۔ کیوں کہ اس طریقِ کار کا واقف نہیں ہے۔

ان کو اپنا راہنما بنالیا ہے۔ جو وہ کہتے ہیں وہی مانتا ہوں۔ میرا حال تو سرِ دست اس شعر کے موافق ہے:

عُمرے کہ بآیات واحادیث گذشت
رفتی ونثارِ بُت پَرستے کردی

(ص: ۱۰۷، مہاتما گاندھی کا فیصلہ، از خواجہ حسن نظامی۔ مطبوعہ دِلّی پرنٹنگ پریس دِلّی ۱۹۲۰ء)

تحریکِ تَرکِ موالات کے چوٹی کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''حکومت سے تَرکِ موالات اس طرح فرض ہے جس طرح نماز اور روزہ اور دوسرے اَرکانِ اسلام فرض ہیں۔'' (ص ۱۶۴۔ تبرکاتِ آزاد از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

تَرکِ موالات کے پس منظر میں مسلمان کی تعریف کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

''مسلمان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ:

وہ وجود کہ جس وجود کو اگر رائی برابر اللہ اور اس کی شریعت اور اس کا ایمان محبوب ہے، وہ ایک منٹ کے لئے انگریزی گورنمنٹ کی غلامی کو، اس کی اطاعت کو، اس کی وفاداری کو، اس کے وجود کو، اس کی بقا کو، قبول نہیں کر سکتا۔'' (ص: ۲۷۔ خطبۂ صدارت مولانا آزاد، در جلسۂ جمعیۃ العلماء ہند، بمقام لاہور، ۱۹۲۱ء۔ مؤلفہ مشتاق احمد، مطبوعہ دہلی)

اصل مقصدِ تحریک از تحریکِ خلافت تا تحریکِ تَرکِ موالات کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مولانا آزاد کہتے ہیں کہ:

''کوشش اور لڑائی صرف اَماکنِ مقدسہ اور خلافت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دلانے کے لئے ہے۔

اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی جائے تا ہم جد و جہد جاری رہے گی اُس وقت تک

کہ ہم گنگا و جمنا کی مقدس سرزمین آزاد نہ کرالیں۔'' (اشتہار از یوسف کھڑک پوری۔مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۰ء، وص:۲۴۔دَوَامِغُ الحَمِیر۔مطبوعہ بریلی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۰ء)

''ہم ترکِ موالات کے ذریعہ ملک کو موجودہ غلامی کی حالت سے نکال کر آزاد کرانا چاہتے ہیں۔'' (ص:۲۲،ترکِ موالات، از محمد اَبرار صدیقی، مدینہ پریس بجنور، ۱۹۲۰ء)

شریعت وخلافت کا سہارا لے کر ''انگریز دشمنی'' کی آڑ میں ''مُشرک دوستی'' کے لئے مسئلۂ موالات کی صورت مسخ کرنے اور اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کی شورش اور شریعت مخالفت بیانات واقدامات کی عُلمائے اہلِ سُنّت کی غالب اکثریت نے شدید مخالفت کی۔

یہی خیالات وکیفیات وحالات دیکھ کر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کون سا دین ہے؟ نصاریٰ کی اَدھوری سے اِجتناب اور مشرکین کی ''پوری'' میں غرق آپ؟

فَرَّمِنَ المَطرِ وَوَقفَ تَحتَ المِیزاب ۔مینہ سے بھاگ کر چلتے پرنالہ کے نیچے ٹھہرے۔'' (ص:۱۴،اَلْمَحَجَّةُ المُؤتَمَنة،مطبوعہ بریلی۔مشمولہ فتاویٰ رضویہ جلد ۱۴۔مطبوعہ لاہور)

عبدالقوی دسنوی اس دور کی اِتحادی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۱۹ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا اس قدر زور تھا کہ کلکتہ اور دہلی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو بھی جلسوں میں شریک ہونے کے لئے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔دہلی کے مسلمانوں نے شَردھانند سے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔''

(ص:۶۶۔ابوالکلام آزاد۔از عبدالقوی دسنوی۔ساہتیہ اکیڈمی،نئی دہلی۔۱۹۸۷ء)

استاذُ العُلَماء حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھی (وصال ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) کے شاگرد اور پنجاب کے مشہور عالم وشیخ طریقت حضرت سید مہر علی شاہ چشتی (گولڑہ شریف ضلع راولپنڈی، پنجاب۔ وصال ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۶ء) خلیفۂ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی چشتی (وصال ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء) فرماتے ہیں کہ:

''یہود اور مشرکین کی عداوت قرآن شریف میں صراحۃً مذکور ہے۔پس ترکِ موالات

ہندو اور انگریز اور یہود سب سے ہونی چاہیے۔تفریق اور ترجیح بلا مُرَجّح ٹھیک نہیں۔''

(ص:۲۷۴۔باب ۵،فصل ۷۔مہرِ منیر۔مؤلّفہ مولانا فیض احمد۔مطبوعہ پاک وہند)

بریلی کے اِجلاسِ جمعیۃ العُلَمائے ہند مارچ ۱۹۲۱ء/ رجب ۱۳۳۹ھ میں مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) نے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) و مفتی کفایت اللہ دہلوی (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) وغیرہ کو مخاطب کرتے ہوئے واضح کیا کہ:

''ہمیں تُرکی کی اسلامی سلطنت کی ہمدردی واعانت سے انکار نہیں۔یہ امداد واِعانت تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہے۔نہ ہی ہم انگریزوں کی دوستی کو جائز قرار دیتے ہیں۔

موالات ہر نصرانی ویہودی سے ہر حال میں حرام اور حرامِ قطعی ہے۔ہمیں تو ہندو مسلم اتحاد اور اس اتحاد کی بنا پر کیے جانے والے غیر اسلامی افعال واقوال سے اختلاف ہے۔''

(رودادِ مناظرہ،طبعِ دوم مطبوعہ بریلی ۱۹۲۱ء)

جمعیۃُ العُلَما کے اِس اِجلاسِ بریلی منعقدہ رجب ۱۳۳۹ھ/ مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا سید سلیمان اشرف نے عُلمائے اہلِ سُنّت کا مَوقف بڑی جرأت اور نہایت صراحت ووضاحت کے ساتھ بیان کیا۔آپ کے بیان کے بعض اہم حصے درج ذیل ہیں:

''فقیر کی حاضری کی غایت اور خطاب کا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ نہایت وضاحت وصراحت سے اَمرِ **مابہٖ الاتفاق** اور **مابہٖ الاختلاف** کو آپ حضرات کے سامنے پیش کردوں۔

مسئلۂ خلافت وتحفظ وصیانتِ اَماکنِ مقدسہ اور تَرکِ موالات، یہ وہ مسائل ہیں جن میں نہ صرف یہ فقیر بلکہ تمام عُلمائے کرام نہیں بلکہ تمام عامّۂ مسلمین ہمیشہ متفق اللّسان ہیں۔

تُرکوں کی خلافت بمعنی قوتِ دفاعی ایک امرِ مسلَّم ہے۔خدمتِ حرمین شریفین ہر مسلمان پر فرضِ کفایہ ہے۔نیز محافظتِ حرمین شریفین بھی فرضِ کفایہ ہے۔

سلطنتِ تُرکی علاوہ ازیں کہ اسلام کی قوتِ دفاعی ہے، ہم مسلمانوں کی طرف سے ان دونوں کے فریضہ کو انجام دینے والی ہے۔'' (ص۔رودادِ مناظرہ۔مُرتَّبہ شُعبۂ علمیہ، جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی۔طبعِ دوم، نادری پریس، بریلی)

.............''سلطنتِ تُرکی ہماری دینی بھائی، اوس پر اسلامی سلطنت، اور اوس

پر اسلام کی قوتِ دفاعی ۔ پھر حرمین شریفین کی خادم ومحافظ۔ پس ان کی اِعانت اور نُصرت نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام مسلمانانِ عالم پر بقدرِ اِستطاعت فرض ہے۔

حاضرینِ جلسہ! یہ وہ مسائل شرعیہ ہیں جسے نہ میں صِرف اِس وقت بیان کررہا ہوں بلکہ آج سے دس (۱۰) برس پیشتر فقیر نے لکھا، چھاپا، ملک میں شائع کیا۔

میرا، نیز دیگر عُلمائے اہلِ سُنّت وجماعت کا آپ سے اس مسئلہ میں اختلاف ہرگز نہیں۔ ہاں! اختلاف اس میں ہے کہ آپ ہندوؤں سے موالات برتتے ہیں اور مسلمانوں کوحرام وکفریات کا مُرتکب بناتے ہیں۔'' (ص۵۔ رودادِ مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

..........................ہر کافر سے موالات حرام، خواہ وہ مُحارِب ہو یا غیر مُحارِب، لَایَتَّخِذُالْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ۔الآیۃ۔

آپ حضرات انگریزوں سے تو موالات حرام بتاتے ہیں اور کافروں سے نہ صرف جائز بلکہ عینِ حکمِ الٰہی کی تکمیل بتاتے ہیں۔ دلیل میں سورۂ ممتحنہ کی آیت لَایَنْھٰکُمُ اللّٰہُ ۔الآیۃ پیش فرماتے ہیں۔

کیا یہ کھُلی تحریف نہیں؟ آیتِ کریمہ میں کافرِ غیر مُحارِب کے ساتھ اجازت ''برواِقساط'' کی ہے نہ کہ ''موالات'' کی۔ یعنی محبت واِتحاد وخلوص واِخلاص جو آپ برت رہے ہیں۔

براہِ کرم آپ کسی مفسّر کسی محدّث کسی فقیہ کا قول اس ثبوت میں پیش فرمادیں کہ برواِقساط، موالات کے مُرادِف ہیں۔؟

یا یہ ثابت کیجیے کہ سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت ناسخ ہے اون آیاتِ متعددہ کثیرہ کی جن میں مطلقاً ہر کافر وبے دین سے موالات کو منع فرمایا گیا ہے؟

لفظ ولا اور تولّی جب کہ کلام پاک میں بکثرت جابجا نازل ہوا۔ پھر اس لفظ کا مفہوم ومصداق کیا عُلمائے مفسّرین نے بیان نہیں فرمایا ہے؟

جو کچھ عُلمائے دین نے اپنی تحقیقات سے موالات کا معنی بیان کیے ہیں، اوس پر عمل پیرا ہوئیے۔ نہ کہ اپنی طرف سے ایک معنی ایجاد کیجیے۔

ہمیں بتایا جائے کہ اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں کس نے سورۂ ممتحنہ کی آیت کو ناسخ قرار دیا؟ کس نے برواِقساط کو مُرادفِ موالات کہا؟ (ص۵و۶۔ رودادِ مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

.........اربابِ دین کے پاس دنیا خدمت گذاریِ دین کے لئے ہے نہ کہ دنیا کمانے کے لئے۔

آپ نے قَشقہ لگایا۔ گاندھی کی جے ایک دوجگہ، ایک دوبار نہیں بلکہ بیسیوں بار پکاری کہ مہاتما گاندھی کی جے۔

جس طرح صَلیب علامتِ تثلیث ہے۔ کیا قَشقہ علامتِ شرک نہیں؟ کیا آپ کی غیرت گوارہ کرتی ہے کہ شرک کی علامت ''قَشقہ'' اپنی پیشانیوں پر لگائیے؟

آپ ہمارے سامنے سمرنا وغیرہ کے مظالم بیان کرکے ہمارے جذبات اُبھارتے ہیں۔ مگر کیا ہندوؤں نے آرہ، شاہ آباد، کٹار پور وغیرہ میں قربانی بند کرنے کے لئے ایسے ہی مظالم نہیں کیے؟ قرآن مجید نہیں پھاڑے؟ عورتوں کی بے حُرمتی نہیں کی؟ مسلمانوں کی جانیں نہیں لیں؟ مسجدوں میں بے ادبیاں نہیں کیں؟

آج آپ سبز گنبد کی بے ادبی ہونے سے غیرت دلاتے ہیں۔ مگر کیا آپ کے لئے یہ غیرت کی بات نہیں تھی جب کہ دربارِ نبوت ورسالت کی یہ کہہ کر اِہانت کی گئی کہ:

''اگر نبوت ختم نہ ہوگئی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔''

آپ نے اس پر کیوں نہ انکار کیا؟ کیوں خاموش رہے؟

(ص۷۔ رودادِ مناظرہ۔ طبعِ دوم۔ نادری پریس۔ بریلی)

.........آپ ملکی مفاد اور بہبود کے لئے مل کر کوشش کیجیے۔ مگر جہاں سے مذھبی حُدود آئیں، مسلمان الگ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے مذھب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کرسکتے۔

غرض مقاماتِ مقدسہ وخلافتِ اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں خلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے، اس سے ہمیں خلاف نہیں۔

خلاف اون حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی ومخالفِ دین کررہے ہیں۔ ان حرکات کو دور کردیجیے، ان سے باز آجائیے، عوام کو اُن سے باز رکھیے تو خلافتِ اسلامیہ وممالکِ مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر کرنے کو تیار ہیں۔'' (ص۷و۸۔ رودادِ مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

اسی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی نے

فرمایا کہ:

حرمین شریفین ومقاماتِ مقدسہ وممالکِ اسلامیہ کی حفاظت وخدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وُسعت وقدرت فرض ہے۔ اس میں ہمیں خلاف نہ ہے نہ تھا۔

اسی طرح سلطانِ اسلام وجماعتِ اسلام کی خیرخواہی میں ہمیں کچھ کلام ہے، نہ تھا۔

تمام کفّار ومشرکین ونصاریٰ ویہود ومُرتدین وغیرھُم سے تَرکِ موالات ہم ہمیشہ سے ضروری وفرض جانتے ہیں۔

ہمیں خلاف آپ حضرات کی اون خلافِ شرع وخلافِ اسلام حرکات سے ہے جن میں سے کچھ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان کیں۔ اور جن کے متعلق جماعت کے ستر (۷۰) سوال بنام ''اِتمامِ حُجّت تامّہ'' آپ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے جواب دیجیے۔

جب تک آپ اون تمام حرکات سے رجوع نہ شائع کردیں گے اور اون سے عہدہ برآنہ ہولیں گے، ہم آپ سے علیٰحدہ ہیں۔ اور اس کے بعد خدمت وحفاظتِ حرمین شریفین ومقاماتِ مقدّسہ وممالک اسلامیہ میں ہم آپ کے ساتھ مل کر جائز کوشش کرنے کو تیار ہیں۔''
(ص ۱۰۱۔ رودادِ مناظرہ۔ مرتّبہ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔ مطبوعہ نادری پریس، بریلی)

اس اجلاسِ بریلی سے مرادآباد واپسی کے بعد صدرُ الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی نے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے نام ایک مکتوب میں لکھا:

''حقیقتُ الاُمر یہ ہے کہ:

یہ لوگ تَرکِ موالات کو حکمِ شریعت سمجھ کر نہیں مانتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے موافق کرنے کے لئے آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔ مانتے تو ہیں گاندھی کا حکم سمجھ کر۔

یہی وجہ ہے کہ تَرکِ موالات کے ساتھ ہندو سے موالات فرض سمجھتے ہیں۔ آج تمام ہندوستان جانتا ہے کہ

خلافت کمیٹی صرف گورنمنٹ سے تَرکِ موالات بتاتی ہے۔ اور ہنود سے موالات بلکہ ان کی رضا میں فنا ہوجانا ضروری قرار دیتی ہے۔ اور اس پر ہمیشہ جلسوں میں زور دیے جاتے ہیں۔ اخباروں میں اس پر مضامین کس شدومد سے لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ خلافت کمیٹی کا مقصودِ اعظم اور پہلا نصبُ العین ہے۔

خلافت کمٹی، گاندھی کی بدولت تو وجود ہی میں آئی۔ اس کے اشاروں پر تو چل ہی رہی ہے۔ پھر ہنود سے تَرکِ موالات حرام وکفر نہ ہو تو کیوں نہ ہو؟

کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ابوالکلام نے بھرے مجمع میں صاف الفاظ میں اقرار کیا کہ:

بے شک موالات تمام کفّار ومشرکین سے ممنوع وحرام ہے۔ جیسے نصاریٰ سے ناجائز ویسے ہی ہنود سے ناجائز۔ کون کہتا ہے کہ آیۂ ممتحنہ سے موالاتِ غیرِ مُحارِبین کا جواز نکلتا ہے؟ کس ذمہ دار شخص نے ایسا کہا ہے؟

اگر ہندوستان کے بائیس (۲۲) کروڑ ہندو سب کے سب گاندھی ہوجائیں اور مسلمان ان کو اپنا رہنما بنالیں تو یہ بُت پرست ہیں اور وہ سب کے سب بُت۔'' (ص ۱۸۔ رودادِ مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

روانگی کے وقت بریلی اسٹیشن پر ایک تاجر صاحب نے مجھ سے کہا کہ:

ابوالکلام جس وقت بریلی سے جارہے تھے، میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ کہتے جاتے تھے کہ:

اون کے جس قدر اعتراض ہیں، حقیقت میں سب درست ہیں۔ ایسی غلطیاں کیوں کی جاتی ہیں جن کا جواب نہ ہوسکے؟ اور ان کو اس طرح گرفت کا موقع ملے؟

میں اس مسرت کا اظہار نہیں کرسکتا جو مجھے اس فتح سے حاصل ہوئی۔ میدان مولوی سلیمان اشرف کے ہاتھ رہا۔'' الخ (ص ۱۹۔ رودادِ مناظرہ، مطبوعہ نادری پریس بریلی ۱۹۲۱ء)

اجلاسِ بریلی منعقدہ مارچ ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا سید سلیمان اشرف کے بیان کردہ حقائق اور پیش کردہ سوالات کا مناسب ومعقول جواب دینے یا انھیں صحیح سمجھ کر اپنی اصلاح کرنے کی بجائے جمعیۃُ العلما نے زوروشور کے ساتھ یہ پروپگنڈہ کیا اور اخبارات ورسائل میں یہ خلافِ حقیقت بیانات چھپوائے کہ مولانا سید سلیمان اشرف کو مولانا ابوالکلام آزاد نے قائل کردیا اور اب وہ تَرکِ موالات کے حامی ہوگئے۔

چنانچہ اس اَفواہ اور پروپگنڈہ کے خلاف مولانا سید سلیمان اشرف کو بیان جاری کرنا پڑا جو متعدد اَخبارات ورسائل میں شائع ہوا۔ علی گڑھ گزٹ سے منقول یہ بیان روزانہ پیسہ اخبار، لاہور میں شائع ہوا:

’’جناب سید عبدالوَدُود صاحب بریلوی (ناظمِ جمعیۃ العُلما بریلی) کا تار مختلف صحایف میں شائع ہو رہا ہے۔

فقیر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دیانت وامانت کا یہ حال ہے تو پھر مصالحتِ باہمی اور اصلاحِ امت کی کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

فقیر کا مُکالمہ مولانا ابوالکلام آزاد سے تھا جو صدر مجلس جمعیۃُ العُلماء تھے۔ انھیں سے چلتے وقت اس کا وعدہ لیا گیا تھا کہ اصل حقیقت کی اِشاعت فرمائیں گے۔

لیکن اس وقت تک نہ مولانا صاحب موصوف نے کچھ لکھا ہے نہ مولانا عبدالماجد صاحب ناظمِ جمعیۃ العُلماء نے کچھ لکھا ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت کا اِنکشاف انھیں دونوں ذِمّہ داراَصحاب کا فرض ہے۔ لیکن بایں خیال کہ ایک بے بنیاد اِفترا کی بذریعہ تار ومراسلات اشاعت کی گئی ہے اور اس پر ذِمّہ دار عُلما (جمعیۃُ العُلماء) کی خاموشی ملک میں اِضطراب پیدا کرنے والی ہے، یہ مختصر بیان حوالۂ قلم کیا جاتا ہے:

امر مَابِہٖ النزاع یہ تھا کہ:

جس طرح اہلِ ہنود کی عموماً اور مسٹر گاندھی کی خصوصاً محبت وعظمت مسلمانوں کے قلوب میں پیدا کی جارہی ہے، اسے شریعت نے حرام فرمایا ہے۔ موالات ووداد مطلقاً کفّار سے حرام ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نے جواباً فرمایا کہ:

بلاتحقیق اِلزام عائد کرنا شیوۂ اہلِ علم نہیں ہے۔ کِس ذِمّہ دار نے کہا ہے کہ: موالات ہندؤں سے جائز ہے؟

فقیر نے جوابُ الجواب میں عرض کیا کہ:

جمعیۃُ العُلماء کا اِجلاس بماہِ نومبر دہلی میں منعقد ہوا۔ حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب بحیثیت صدر اِستقبالیہ کمیٹی اپنا خطبہ پڑھتے ہیں۔ آیت لَا یَنۡہٰکُمُ اللّٰہُ الخ کے متعلق تفسیرِ ابن جریر کی ناتمام عبارت نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’اگر اس کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ نہیں، مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ بھی تَرکِ موالات کرنی چاہیے، تو اَب کہنے ولے کو خدا ہی بہتر سمجھا سکتا ہے۔‘‘

(ص۱۵۔ سطر۶و۷)

بیان کیا جاتا ہے کہ جلسۂ دہلی میں پانسو عالم رونق افروز تھے۔ جب ان سب نے سنا اور سکوت فرمایا تو سب ذِمّہ دار ہوئے۔

پھر یہ خطبہ بشکلِ پمفلٹ شائع ہوا۔ مختلف صحایف وجرائد میں بھی اس کی اشاعت ہوئی۔ لیکن جمعیۃ کے ایک عالم نے بھی اس کی تصحیح نہ فرمائی۔

خود بریلی میں جب مسٹر گاندھی کا آنا ہوا تو اس وقت جو قصیدہ حُضوریِ عُلما میں پڑھا گیا اس میں حمد کے مصرع کی اس طرح تضمین کی گئی۔

تعریف ان کی کر سکے کوئی یہ نا دُرُست
خاموشی از ثَنائے تو حَدِّ ثنائے تُست

یہ قصیدہ بھی چھپا۔ تقسیم ہوا۔ عُلما نے دیکھا اور سنا مگر خاموش ہو رہے۔

اگر یہ موالات اور وداد نہیں ہے تو کیا ہے؟

ہنود سے مصالحت کیجیے مگر اسی حد میں کہ مذہب کی حق تلفی نہ ہوتی ہو۔

اس موقع پر **الاصلاح** حصہ اول **الرَّشاد** میں اتفاقِ ہنود ومسلم پر جو کچھ کہا گیا ہے اور جو مثال دی گئی ہے اسے بھی بیان کیا گیا۔

مسلۂ خلافت اور حفاظتِ اَماکنِ مقدسہ کے متعلق سب سے پہلے جس نے لکھا وہ یہی فقیرِ بےنَوا ہے۔

..........اختلاف یہی ہے کہ نام خلافت کا لیا جاتا ہے اور عظمت مسٹر گاندھی کی پیدا کی جاتی ہے۔ اگر خلافت کمیٹی ہنود سے پاک وصاف ہو جائے اور اعمال وافعالِ کفریہ سے بے زاری کا اظہار کر دیا جائے تو فقیر بھی بحیثیت ادنیٰ خادم ہر طرح کمیٹی کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔

فقیر کی تقریرِ جوابُ الجواب کے بعد سکوت وخاموشی تھی۔

فقیر محمد سلیمان اشرف عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُ۔

(ص۳۔ روزانہ پیسہ اخبار، لاہور۔ شمارہ یوم جمعہ ۲۲/اپریل ۱۹۲۱ء۔ منقول از علی گڑھ گزٹ)

تحریک کے اندر پائی جانے والی غیر شرعی حرکات کی مخالفت کرتے ہوئے امام

احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے خَلفِ اکبر مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے بھی اسی اِجلاسِ جمعیۃ العُلماے ہند (منعقدہ بریلی، مارچ، ۱۹۲۱ء) کے اسٹیج سے اپنا یہ موقف واضح کرتے ہوئے اظہارِ حق کیا تھا کہ:

''حرمین شریفین و مقاماتِ مقدسہ و ممالکِ اسلامیہ کی حفاظت و خدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وُسعت و طاقت فرض ہے۔اس میں ہمیں خلاف نہ ہے نہ تھا۔اسی طرح سلطانِ اسلام و جماعتِ اسلام کی خیر خواہی میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔تمام کفّار و مُشرکین و نصاریٰ و یہود و مُرتدین وغیرھُم سے تَرکِ موالات ہم ہمیشہ سے ضروری و فرض جانتے ہیں۔'' (ص:۲۸۔رودادِ مناظرہ، مطبوعہ بریلی۔طبع دوم ۱۹۲۱ء)

''مُشرکین سے اتحاد و وداد، دوستی، موالات کہ سب کا حاصل ایک ہے بلکہ اتحاد سب میں زائد ہے، حرام قطعی و کبیرۂ شدیدہ ہے۔'' (مکتوبِ امام احمد رضا بریلوی بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی برائے ھدایتِ توبہ۔محرَّرہ۔شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء)

تحریکِ عدمِ اِشتراکِ عمل اور عدمِ تعاون کو تحریکِ عدمِ موالات و موَدَّت بنانا، آیات و احادیث کی غلط تعبیر و تشریح کرنا اور کفّار و مشرکین کے ساتھ وداد و محبت کا رشتہ قائم کرنا، نیز شرعی اصول اور تقاضوں کو نظر انداز کرنا، عُلما و قائدینِ تحریک کی بنیادی اور زبردست غلطی تھی۔ اگر مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے یہ پیغام دے کر تحریکِ آزادیِ ہند سے وابستہ کیا جاتا کہ انگریز اس ملک کے غاصِب و قابِض حکمراں ہیں۔انھوں نے ہمارے ملک کو غلام بنا لیا ہے۔ ہندوستانیوں پر ظلم وستم کر رہے ہیں۔مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا رہے ہیں۔اس لئے ان کے خلاف محاذ بنا کر ان کے غلبہ و تسلُّط سے ہندوستان کو آزاد کیا جائے۔

اِس طرح کی باتیں ہوتیں تو بہت سے وہ عُلما و مَشائخ بھی اِس تحریک کا کسی نہ کسی انداز سے ضرور تعاون کرتے جو اِس کی بے اصولی و بے اعتدالی و کج رَوِی کی وجہ سے اس سے دور رَہے۔

جمعیۃُ العُلما کے اِجلاسِ بریلی منعقدہ رجب ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کی تفصیلات جماعتِ رضاے مصطفیٰ، بریلی نے حَسنی پریس، بریلی سے ۱۹۲۱ء میں بنام دَوامغُ الحمیر (۱۳۴۰ھ) چھپوا کر اسے عام کر دیا تھا۔اسی طرح ''رُودادِ مناظرہ'' کے نام سے اس کی تفصیلات اسی دور میں بریلی سے شائع ہوئیں۔

اِن واقعات و حقائق کو مفصَّل و مَبسوط مقدّمہ کے ساتھ مولانا محمد جلالُ الدین قادری نے مُرتَّب کر کے اس کا نام ''ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست'' رکھا جسے ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں مکتبہ قادریہ، لاہور نے شائع کیا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔

وفدِ عُلماے اہلِ سُنَّت کے ساتھ بُرھانِ ملَّت مفتی محمد عبدالباقی بُرھانُ الحق رضوی جبل پوری (وصال ۱۹۸۴ء) تلمیذ و خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی بھی جمعیۃُ العُلما کے اِجلاسِ بریلی ۱۹۲۱ء میں شریک تھے۔اپنے مُشاھدات و تجربات و تأثرات آپ نے اِختصار اور اِجمال کے ساتھ تحریر کر دیے ہیں۔جن کے چند اِقتباسات درج ذیل ہیں:

''۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء میں گاندھی کی تحریکِ تَرکِ موالات اور ہندو مسلم اتحاد بہت زور کے ساتھ اُٹھی۔اسی کے ساتھ مسئلۂ خلافت کو مِلا دیا گیا۔سلطانِ تُرکی کو ''خلیفۃُ المسلمین'' ''امیرُ المؤمنین'' کہا جانے لگا۔

اِس تحریک میں ہندوستان کے بعض پُختہ مغز، نامور، ذی اثر، معزَّز مسلمان شامِل ہو گئے اور تحریک زور پکڑ گئی۔

شوکت علی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرھُم نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہو کر عام مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دینے لگے۔

.........اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی کو اور ہم لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور کانگریس کمیٹی سے اس کا اتحاد ہو گیا۔تحریک زور پکڑ گئی یہاں تک کہ جن حق پسند مسلمانوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا، ان کے بائیکاٹ اور ان سے مکمل مقاطعہ کا اعلان کر دیا گیا۔

اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی اور حضرت عیدُ الاسلام مولانا عبدُ السّلام (رضوی، جبل پوری) اور دوسرے عُلماے اہلِ سُنَّت کے خلاف نہایت گندے حملے کیے جانے لگے۔

.........خلافت کمیٹی کی طرف سے تُرکوں کے لئے خلافتِ راشدہ کی نہج پر خلافت کے حق میں مضامین اور بیانات شائع ہوئے تو مسئلۂ خلافت کی شرعی تحقیق اور وضاحت کے لئے کتاب ''دَوَام العَیش فِی الْاَئِمَّۃِ مِن قُرَیش'' (۱۳۳۹ھ۔مطبوعہ بریلی) اعلیٰ حضرت کی طرف سے شائع ہوئی۔

اس میں بتایا گیا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سلطانِ تُرکی ،خلیفۃُ المسلمین ،امیرُ المؤمنین تونہیں ہوسکتا تاہم سلطانِ اسلام کی حیثیت سے ان کی اور سلطنتِ اسلام کی حیثیت سے تُرکی کی اِمداد اِعانت ہر مسلمان پر بقدرِ اِستطاعت فرض ہے۔

''ہندو مسلم اتحاد'' کے بارے میں آیتِ کریمہ ۔**لَایَنۡہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ** ۔الآیۃ ۔پر بہت زور دیا گیا۔

اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی طرف سے فتویٰ **اَلْمَحَجَّۃُ الْمُؤْتَمَنَۃُ فِی اٰیَۃِ الْمُمْتَحَنَۃ**'' (۱۳۳۹ھ) شائع ہوا۔

........رجب شریف ۱۳۳۹ھ/ مارچ ۱۹۲۱ء میں اجمیر شریف حاضری کے بعد بریلی حاضر ہوا۔ آستانۂ رضویہ (بریلی شریف) پر چند مقتدر عُلمائے کرام کی مجلسِ شوریٰ ہو رہی تھی ۔مولانا سید سلیمان اشرف (صدرِ شعبۂ علوم اسلامیہ ،مسلم یونیورسٹی ،علی گڑھ) صدرِ مجلس تھے۔سب سے سلام و مصافحہ کے بعد میں بھی بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ جمعیۃُ العلماء ہند کے اِہتمام سے ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت ایک کھُلا اجلاس بریلی میں ہو رہا ہے ۔جس میں وہ اِتمامِ حُجت کریں گے ۔اس اَمر کا اظہار انھوں نے مختلف اشتہارات شائع کر کے کیا ہے۔

............صدرُ الشریعہ مولانا امجد علی صاحب رضوی کے مُرتَّب کردہ ستَّر سوالات کا مجموعہ بعنوان ''اِتمامِ حُجَّت تامّہ'' (۱۳۳۹ھ) شائع ہو کر اراکینِ خلافت کمیٹی تک پہنچ چکا تھا۔

ابوالکلام آزاد نے اِن تمام کوششوں کے برعکس اعلیٰ حضرت کو جلسہ میں شرکت اور رفعِ منازعت کی دعوت بھیج دی ۔آستانے پر حاضر عُلما ،جماعتِ رضائے مصطفیٰ کی طرف سے اس سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس میں شرکت کرنے اور رَفعِ نزاع کے لئے ایک زور کا اعلان بذریعۂ اشتہار کر چکے تھے ۔جو کھُلے اجلاس میں ابوالکلام آزاد اور خلافتی لیڈروں سے، جا کر گفتگو کرے گا۔

.......''ابوالکلام آزاد نے (اجلاسِ بریلی میں) سید سلیمان اشرف کو تقریر کی دعوت دی ۔سید سلیمان اشرف تقریر کے لئے کھڑے ہوگئے ۔تقریر کے دوران انھوں نے اپنا مَوقف نہایت وضاحت سے بیان کیا۔ اپنے مَوقف کی حمایت میں قوی دلائل پیش کیے۔

''اِتمامِ حُجَّتِ تامہ'' کا جواب طلب کیا۔آزاد کے کچھ اخباری بیانات، کچھ تقریروں، اور بعض حرکات پر شدید اِعتراضات کیے۔ اپنی کتاب ''الرشاد'' اور ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد سے جواب طلب کیا۔ اور اپنی پوزیشن صاف کرنے کا مطالبہ کیا۔ آزاد کے پاس اِن باتوں کا جواب نہ تھا۔

.............(میں آزاد کے قریب کھڑا ہو گیا اور) میں نے آزاد سے بلند آواز میں کہا:

آنجناب نے ابھی اپنی جوابی تقریر میں زور دے کر فرمایا کہ:

مجھ پر تمام اِلزامات غلط اور بے بنیاد ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں۔

میری گذارش یہ ہے کہ:

اخبار ''زمیندار'' لاہور کے فلاں نمبر، فلاں تاریخ میں نہایت نمایاں ،جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ:

''ناگ پور میں خلافت کانفرنس کے پنڈال میں امامُ الھند ابوالکلام آزاد صاحب نے جمعہ پڑھایا اور خطبۂ جمعہ میں مہاتما گاندھی کی صداقت وحقانیت کی شہادت دی۔''

ایک مُشرک کی صداقت وحقانیت کی شہادت خطبۂ جمعہ میں ....یہ کیسا اسلام ہے؟

یہ سنتے ہی مولانا آزاد کا چہرہ فق ہو گیا.........ایک دو منٹ تک مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بولے:

لَعَنَۃُ اللّٰہِ قَائِلِہٖ۔

میں نے کہا: آزاد صاحب! یہ کلماتِ لعنت اسی اخبار میں بِالاِعلان شائع کرا دیجئے۔ امید ہے کہ توبہ کے قائم مقام ہو جائیں۔

پھر میں نے کہا: ایک بات اور عرض کرنی ہے۔

اخبار، تاج (جبل پور) فلاں تاریخ، فلاں خبر میں ہے کہ:

الہ آباد کے ایک جلسۂ عام میں مولانا آزاد صاحب نے کرسیِ صدارت سے اعلان فرمایا کہ:

''مقاماتِ مقدسہ کا فیصلہ اگر ہمارے حسبِ منشا بھی ہو جائیں تب بھی ہم اُس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک گنگا اور جمنا کی مقدس سرزمین کو آزاد نہ کرالیں۔''

بحیثیت مسلمان ہونے کے گنگا و جمنا بھی آپ کے نزدیک مقدس ہیں؟ اَستَغفِرُ اللّٰہَ۔
اس پر آزاد نے کہا:
''میں نے یہ پرچے نہیں دیکھے ہیں۔ لَعنۃُ اللّٰہِ عَلٰی قائِلِہٖ۔
اس پر بھی میں نے یہی کہا کہ:
''لعنت کے یہی الفاظ توبہ کے قائم مقام، اخبارات میں بِالْاِعلان شائع ہونے چاہئیں۔''
اس کے ساتھ ہی میں نے ''اِتمامِ حُجتِ تامّہ'' کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے ابوالکلام آزاد سے کہا:
''یہ ستّر (۷۰) سوالات کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کے ہر سوال کا مفصّل اطمینان بخش جواب آپ کی طرف سے دیا جانا چاہیے۔''
اس کے بعد حُجّۃُ الاسلام مولانا حامد رضا خاں صاحب نے ابوالکلام آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
''مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور خلافتِ اسلامیہ کی خدمت ہر مسلمان پر بقدرِ وُسعت فرض ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔
آپ کی خلافِ شرع حرکات میں سے کچھ کا بیان مولانا سید سلیمان اشرف کی تقریر میں آچکا ہے۔ باقی کا ذکر جماعتِ رضائے مصطفیٰ کی طرف سے شائع کردہ اشتہار بعنوان ''اِتمامِ حُجتِ تامہ'' میں ہے۔ وہ اشتہار آپ کو پہنچ چکا ہے۔
علاوہ ازیں بعض غیر اسلامی حرکات پر مولانا بُرھان الحق صاحب نے آپ کا مؤاخذہ کیا ہے۔
آپ جب تک ان تمام حرکات سے رُجوع نہ شائع کریں گے، ہم آپ سے علیحدہ ہیں۔''
ابوالکلام آزاد نے وعدہ کیا کہ:
''اِجلاس کی روداد میں ان تمام غیر اسلامی حرکات سے رُجوع شائع کردیا جائے گا۔''
ہمارا وفد اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس روانہ ہوا۔
..............راستہ میں وفد کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے صدرُ الافاضل مولانا

نعیم الدین مرادآبادی نے میرا ہاتھ پکڑ کر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:
بُرھان میاں! آپ کے ابتدائی دو سوالوں نے تو ابوالکلام کو بالکل مبہوت کردیا۔''
ہم سب مکان پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت انتظار فرمارہے ہیں۔
..........(ملاقات کے بعد) اعلیٰ حضرت نے دعائیں دیں۔ ہم سب باہر گئے۔
مولانا نعیم الدین صاحب اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جو باہر سے تشریف لائے تھے۔ اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ ہم لوگوں نے آرام کیا۔
صبح نمازِ فجر کے بعد ایک صاحب اسٹیشن سے آئے..........انھوں نے بتایا:
دِہرہ دُون میل میں ابوالکلام صاحب کو ایک مجمع گھیرے ہوئے تھا۔ میں بھی کھڑا ہوگیا۔ ان کی زبان سے میں نے یہ الفاظ سنے:
''بعض باتیں حقیقت ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہمیں آزادی کا جو مسئلہ حل کرنا ہے، اس کے آگے اب تمام باتیں فی الحال زیادہ توجہ کے قابل نہیں ہیں۔ مگر احتیاط بہر حال ضروری ہے۔''
میں دو ہفتہ بریلی رہا۔ پھر واپس جبل پور چلا آیا۔''
(ص ۳۶ تا ص ۳۸۔ ماہنامہ حجاز جدید، دہلی، شمارہ رجب ۱۴۰۹ھ/ فروری ۱۹۸۹ء۔
بقلم مفتی محمد عبدالباقی بُرھانُ الحق رضوی جبل پوری (وصال ۱۹۸۴ء)
راقم سُطور (یٰسٓ اختر مصباحی) نے بعض اَحباب کے ساتھ آج سے تقریباً بتّیس (۳۲) سال پہلے بُرھانِ مِلّت حضرت مولانا مفتی محمد عبدالباقی بُرھان الحق رضوی جبل پوری سے بریلی شریف میں تفصیلی ملاقات کی اور کئی گھنٹوں پر مشتمل طویل گفتگو کی سعادت حاصل کر کے تحریکِ خلافت و تحریکِ تَرکِ موالات و تحریکِ آزادیِ ہند سے متعلق بہت سی معلومات حاصل کی تھیں۔ اس گفتگو میں مختلف دینی و علمی موضوعات بھی زیرِ بحث آئے تھے۔ مندرجہ بالا تحریر کے بیشتر واقعات اور ان کے متعدد گوشے اس تحریر کے مطالعہ سے پہلے ہی آپ کی زبانی میرے علم میں آچکے تھے۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ علٰی ذالِکَ۔
مسلم مفادات و مسائل پر تحریکِ تَرکِ موالات کی اولین ضرب کاری ملاحظہ فرمائیے۔
قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں:

''۲۳؍مارچ ۱۹۲۰ء کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مہاتما گاندھی زمین کے گز بنے ہوئے تھے اور بڑی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہر ضروری آدمی سے مل کر بات کرنا، ہر جلسہ میں شریک ہونا، گویا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

میرٹھ کانفرنس میں بھی وہ شریک ہوئے۔ انھوں نے وہاں بھی دِلّی کے لیڈروں کا فیصلہ سنایا کہ اگر ٹرکی کے خلاف فیصلہ ہوا تو ہم کو اتنا اور کرنا ہوگا۔ اس میں عدمِ تعاون کی پوری اسکیم تھی۔

مہاتما گاندھی نے یہ بھی کہا کہ: اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لئے ''ہندو مسلم اتحاد'' کی سخت ضرورت ہے۔ پوری اسکیم مہاتما گاندھی نے اس طرح بیان کیا:

(۱) تمام سرکاری خطابات اور سِول عہدوں سے علیٰحدگی۔ (۲) فوج اور پولیس کی نوکری سے علیٰحدگی (۳) ٹیکس اور دوسرے سرکاری واجبُ الادا رقوم کی ادائیگی سے انکار۔

اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ اور ابھی بھرپور ترکِ تعاون شروع بھی نہیں ہوا تھا نہ کسی جماعت نے اسے پاس کیا تھا کہ حکیم اجمل خاں صاحب نے پہل کی اور انھوں نے ڈپٹی کمشنر کو حسبِ ذیل چٹھی لکھی:

(مکتوب، مطبوعہ اخبار مشرق گورکھپور۔ شمارہ ۸؍اپریل ۱۹۲۰ء۔ مشتمل بر واپسیِ خطاب ''حاذِقُ الملک'' نقل کرنے کے بعد)

اسی طرح کالجوں میں بھی طوفان اُٹھ رہا تھا۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور، ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی انجمن تھی۔ اس کی سرکردگی میں نہ صرف ایک عالی شان عربی مدرسہ اور ایک یتیم خانہ تھا بلکہ ایک ہائی اسکول، ایک انٹر کالج، ایک ڈگری کالج بھی تھا اور ایک بڑا پریس تھا جہاں تصنیف وتالیف کا بھی کام اعلیٰ پیمانے پر ہوتا تھا۔

انجمن حمایت الاسلام لاہور کی مفید کتابیں سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے سرکاری امدادی مکاتب میں بھی وہیں کا کورس منظور شدہ تھا۔ اس کے کالج کے لڑکوں نے یونیورسٹی کو اپنے اِستعفا داخل کر دیے۔

ان سے کہا گیا کہ استعفا واپس لے لو خواہ قواعد میں شریک نہ ہونا۔ مگر انھوں نے استعفا واپس نہیں لیے۔''

(ص ۱۴۰ تا ۱۴۲ تحریکِ خلافت۔ مؤلّفہ قاضی محمد عدیل عباسی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء)

اس سے پہلے کی تیاری کچھ اس طرح ہے:

''لندن اور پیرس میں دُوَلِ عُظمیٰ کی صلح کانفرنس ہو رہی تھی اور مولانا محمد علی وفد لے کر لندن گئے تھے اور وہاں کام کر رہے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا جوش وخروش ہندوستان میں حد سے مُتجاوز ہو چکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک طرف اپنے ''اِمامُ الھند'' ہونے کی بیعت لے رہے تھے تاکہ کُل ہندوستانی مسلمانوں کو متحد کر کے اور ان پر شرعی پابندی عائد کر کے انھیں سیاست میں لاکر ہَوا کا رُخ موڑ دیں۔ ''ہجرت'' کا فتویٰ بھی دے دیا تھا۔

لوگ چل پڑے تھے۔ عوام اپنے جذبات سے بے قابو ہو رہے تھے۔ جلسوں اور کانفرسوں کی بھرمار تھی۔ مگر صرف جذبات میں اُبال لانے اور بے مقصد قربانی دینے سے تو کوئی کام بن نہ سکتا تھا۔

البتّہ ان صحیح جذبات کو عمل کے میدان میں جھونک دینے کے لئے مہاتما گاندھی، مکمل عدمِ تعاون کا کوئی طبلِ جنگ بجانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ صلح کانفرنس کی بس ضابطہ کی کارروائی کے لئے انتظار تھا۔'' (ص ۱۳۹۔۱۴۰۔ تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔ مطبوعہ نئی دہلی ۱۹۹۷ء)

ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی کی تحقیق کے مطابق مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۸۷۵۔۱۹۵۲ء)۔ صدر جمعیۃ علمائے ہند ترکِ موالات کے اولین مجوّز ومحرّک ومفتی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

............مفتی کفایت اللہ نے ایک فتویٰ لکھا جس پر مقتدر عُلما نے دستخط کیے اور تحریکِ تَرکِ موالات کو شرعاً جائز قرار دے دیا۔ اس کے دس ماہ بعد ۴؍تا ۹؍ستمبر ۱۹۲۰ء کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مہاتما گاندھی نے عدمِ تعاون کی قرارداد پیش کی جسے کانگریس نے منظور کر لیا۔

اصل میں مہاتما گاندھی ذاتی طور پر تحریکِ عدم تعاون کے حامی تھے اور انھوں نے نومبر ۱۹۱۹ء سے ہی جب کہ خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی میں تحریکِ عدم تعاون کی قرارداد منظور کی گئی تھی، اپنی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر مارچ ۱۹۲۰ء میں قومی دن کے موقع پر مہاتما

گاندھی نے اپنے خیالات کا اِعادہ کرتے ہوئے کہا کہ:

اگر اتحادیوں نے شرائطِ صلح، ترکی کے ساتھ نا قابلِ قبول رکھیں تو میں عدم تعاون کی تحریک جاری کر دوں گا۔

مگر یہ سب کچھ، اُن کی ذاتی رائے تھی۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو باقاعدہ کانگریس کے اجلاس سے منظور کرایا۔ تاکہ بہ حیثیتِ جماعت اس کی تائید وحمایت کی جائے۔

بہر حال! خلافت کمیٹی کے جلسے میں عدم تعاون کی قرارداد ۲۲؍نومبر ۱۹۱۹ء کو ہی منظور ہو چکی تھی۔ نیز پہلے مفتی کفایت اللہ نے ۱۹۱۹ء کے اواخر میں جشنِ صلح کا بائیکاٹ کرنے والا فتویٰ عُلما سے منظور کرا دیا تھا اور اس کے بعد شیخُ الھند نے بھی ۱۵؍اگست ۱۹۲۰ء کو بذریعہ فتویٰ تَرکِ موالات جائز قرار دے دیا تھا۔

(ص ۱۷۱ اور ۱۷۲۔ تحریکِ خلافت اور جدوجہدِ آزادی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت۔ لال کنواں۔ دہلی۔ ۲۰۰۷ء)

''تَرکِ موالات کے سلسلے میں مفتی کفایت اللہ کے ساتھ مفتی عزیز الرحمٰن نے بھی بیان دیا اور کہا کہ تَرکِ موالات اسلام کا قدیم حَربہ ہے۔

اور اپنی اس دلیل کو ثابت کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی بہت سی آیات اور احادیث پیش کی ہیں۔

ان آیات اور احادیث میں تَرکِ موالات کی اہمیت وافادیت ثابت کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو اس پر عمل کرنے کا مشورہ شیخُ الھند نے دیا تھا جسے مفتی عزیز الرحمٰن نے ''تذکرۂ شیخُ الھند'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بعض مؤرخین جن میں شیخ محمد اِکرام اور ڈاکٹر خالد بن سعید خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، اس بات کا تأثر دیتے ہیں کہ تحریکِ عدمِ تعاون کے بانی مہاتما گاندھی ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اصل بانی خصوصاً مفتی کفایتُ اللہ اور شیخُ الھند ہیں۔''

(ص ۱۷۲۔ تحریکِ خلافت اور جدوجہدِ آزادی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ مطبوعہ دہلی۔ ۲۰۰۷ء)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) تَرکِ موالات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''''حضراتِ لیاڈِر نے مسئلۂ موالات میں سب سے بڑھ کر اُدھم مچائی۔ اوروں میں اِفراط یا تفریط ایک ہی پہلو پر گئے، اس میں دونوں کی رنگت رچائی۔

اِفراط وہ کہ نصاریٰ سے نِری معاملَت بھی حرامِ قطعی اور تفریط یہ کہ ہندوؤں سے اتحاد بلکہ ان کی غلامی فرضِ شرعی۔'' (ص: ۵۳۱، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴، مطبوعہ لاہور)

''ہجرت کا غُل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سَرکا۔ جو اُبھارنے میں آگئے اُن مصیبت زَدوں پر جو گذری سو گذری، یہ سب اپنے جورُو بچوں میں چَین سے رہے۔ ہَرّ الگا نہ پھٹکری۔ اور تَرکِ تعاون بھی کیا۔

کس لیڈر یا مبلّغ کے پاس زمینداری اور کسی قسم کی تجارت نہیں؟ نہ ان کا کوئی، انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے؟ پھر انہیں کیوں نہیں چھوڑتے؟ (ص: ۵۳۳، فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۴۔ مطبوعہ لاہور)

''اور بفرضِ غلط و بفرضِ باطل اگر سب مسلمان زَمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلُّقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جِگری خیر خواہ جُملہ ہنود بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری ہی طرح ننگے بھوکے رہ جائیں گے؟

حاشا ہرگز نہیں، زِنہار نہیں۔ اور جو دعویٰ کرے اُس سے بڑھ کر کاذِب نہیں، مَکّار نہیں۔

اِتحاد ووداد کے جھوٹے بھَرّ وں پر بھولے ہو، منافقانہ میل پر پھولے ہو۔ سچے ہو تو موازَنہ دِکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے تَرک کی ہو تو اُدھر پچاس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑ دی۔ کہ یہاں مالی نسبت یہی یا اس سے بھی کم ہے۔، اگر نہیں دکھا سکتے تو کھُل گیا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اَموال، کُل دولتیں، دنیاوی جمیع اِعزاز، جملہ وجاہتیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں گی اور مسلمان دانے دانے کو محتاج، بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ ہندو اَب انہیں پکائے جاتے ہیں جب بے خوف وخطر کچّا ہی چبائیں۔

یہ ہے لیڈر صاحبوں کی خیر خواہی۔ یہ ہے حمایتِ اسلام میں جاں کاہی۔ ولَاحَولَ ولاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ العَظِيم۔'' (ص ۵۳۵، فتاویٰ رضویہ، ج ۱۴۔ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''قرآنِ عظیم گواہ ہے اور اس سے بہتر کون گواہ؟ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلاً۔ اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی؟

مُشرکین ہماری خیرخواہی نہ کریں گے۔ خیرخواہی درکنار بدخواہی میں گئی (کمی) نہ کریں گے۔ پھر انہیں یار و انصار بنانا، ان سے وداد و اتحاد منانا، ان کے میل سے نفع کی امید رکھنا، صراحۃً قرآنِ عظیم کی تکذیب ہے یا نہیں؟ ہے اور ضرور ہے۔ ولٰکِنْ لاتُبْصِرُوْن ۔ (مگر تمہیں نگاہ نہیں)

آؤ! اب ہم تمہیں قرآنِ عظیم کی تصدیق دکھائیں اور ان کی طرف سے اس میل اور میل کا راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن کے لئے تین باتیں چاہتا ہے:

اوّل:۔ اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

دوم:۔ اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔

سوم:۔ یہ بھی نہ ہوسکے۔ تو اخیر درجہ اس کی بے پَری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے ان پر تینوں درجے طے کردیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیرخواہی سمجھتے ہیں۔

اوّلاً: جہاد کے اشارے ہوئے۔ اُس کا کُھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

ثانیاً: جب یہ نہ بنی، ہجرت کا بھَرّا دیا کہ کسی طرح یہ دَفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائے۔ یہ اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں۔ یا یوں ہی چھوڑ جائیں، بہرحال! ہمارے ہاتھ آئیں۔

ثالثاً: جب یہ بھی نہ نبھی تو ''ترکِ موالات'' کا جھوٹا حیلہ کرکے ''ترکِ معاملت'' پر اُبھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو۔ کسی کونسل، کمیٹی میں داخل نہ ہو۔ مال گزاری، ٹیکس نہ دو۔ خطابات واپس کردو۔

امرِ اخیر تو صرف اس لئے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اِعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہے۔ اور پہلے دو اِس لئے کہ ہر صیغہ، ہر محکمہ میں صرف ہنود رہ جائیں۔

جہاں ہنود کا غلبہ ہوتا ہے، حقوقِ اسلام پر جو گذرتی ہے، ظاہر ہے۔'' (المحجۃ المؤتمنہ، مطبوعہ بریلی۔ وص:۵۳۶، فتاویٰ رضویہ، ج۱۴، مطبوعہ لاہور)

صدرُالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے موالات کے موضوع پر ایک وقیع رسالہ قلمبند کیا ہے جو مطبوع ہوچکا ہے۔ یہ رسالہ ''فتاوٰی صدرالافاضل'' میں بھی شامل ہے۔ جسے ''تنظیم افکارِ صدرُالافاضل بمبئی'' نے اس مجموعۂ فتاوٰی مطبوعہ ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء میں شائع کردیا ہے۔

اس رسالہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''موالات اور ولاء اور تولّی سب کا مادہ ولی ہے۔ جولُغت میں قرب و اِتصال کے معنی میں آتا ہے۔ چوں کہ یار، مددگار، دوست مَحرمِ اَسرار، اور رفیق مختارِ کار کو بھی قرب واِتصال حاصل ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی ولی کہتے ہیں۔

اور کسی کو ایسا دوست بنانا موالات کہلاتا ہے کہ اسے ناصِر، مددگار یا مُصاحِب وواقفِ اَسرار یا اپنے اُمور میں متصرّف ومختار بنایا جائے۔

قرآنِ پاک میں یہ لفظ ان معانی میں وارِد ہے۔ موالات کا مفہوم بتانے کے لئے دوستی ایک اچھا اور جامع لفظ ہے۔

کفّار کے ساتھ دوستی وموالات کی چند صورتیں ہیں۔ کافر میں دو حیثیتیں ہیں: (۱) مذہبی (۲) شخصی۔ مذہبی حیثیت سے کفّار کے ساتھ محبت وو داد، ربط واتحاد، دوستی و یک دِلی تو مومن سے ممکن ہی نہیں۔

بِالفرض کسی شخص کو کافر کے ساتھ اس کے دین کی وجہ سے محبت یا ادنیٰ میل وَرغبت ہو۔ یعنی اس درجہ کہ یہ اس کے دین کو محبوب رکھتا ہے یا پسند کرتا ہے تو وہ مومن نہیں۔''

(ص ۲۵۷۔ فتاوٰی صدرُالافاضِل۔ مطبوعہ تنظیم افکار صدرُالافاضِل بمبئی۔ طبعِ اول ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)

چند آیات اور ان کی تفاسیر نقل کرنے کے بعد صدرُالافاضِل ان کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ:

کسی کافر سے اس کے دین کی وجہ سے دوستی کرنا یا اس کے دین کو پسند کرنا یا اس کے ساتھ راضی ہونا کفر ہے۔ اور کسی مومن سے بحالتِ ایمان ممکن نہیں کہ ایسی دوستی کرسکے۔ اور اگر بِالفرض

کسی نے ایسا کیا تو وہ مومن نہ رہا۔

حیثیت شخصی وذاتی ہے۔ یعنی کافر کے ساتھ اس کے دین ومِلّت کی وجہ سے تو دوستی نہیں ہے۔ مگر اس کی ذات کے ساتھ اُنس ومحبت ہے۔

یہ محبت بھی اگر اس درجہ پہنچ جائے کہ:

کافر دوست کے دین اور شعارِ دین کی نفرت قلب سے نکل جائے یا کم ہو جائے۔

یا وہ دینِ اسلام کی مخالفت کرے اور اس کے ساتھ اِستہزا کرے اور یہ اپنی محبت کی وجہ سے اس پر راضی رہے۔ یا صبر کرے۔

تو یہ محبت بھی مُنافیِ ایمان ہے۔ اور آیتِ مذکورہ بالا کے عُموم میں داخل ہے۔'' (ص ۲۶۰۔ فتاویٰ صدرُالافاضِل۔ مطبوعہ بمبئی)

مزید آیات وتفاسیر پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اور اگر محبت اس درجہ پر نہیں پہنچی تو اس کے دو حال ہیں:

وہ محبت طبعی ہوگی جیسے اولاد کو والدین کے ساتھ۔ یا ماں باپ کو اولاد کے ساتھ۔ یا بھائی کو بھائی کے ساتھ طبعًا بے اختیار ہوتی ہے۔

تو یہ محبت جس پر اختیار نہیں، زیرِ حکم نہیں۔ اور اَمر ونَہی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کیوں کہ مدارِ تکلیف، وُسعت واختیار ہے۔ جو چیز اختیار سے باہر ہے، بندہ اس پر مکلّف ہی نہیں۔ **لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا**۔'' (ص ۲۶۳۔ فتاویٰ صدرُالافاضل۔ مطبوعہ بمبئی)

چند تفاسیرِ قدیمہ درج کرنے کے بعد صدرُالافاضِل فرماتے ہیں:

''اور جو محبت طبعی وجبلّی نہیں۔ اور اس درجہ بھی نہیں کہ:

کفر وشعارِ کفر کی نفرت قلب سے کم کردے۔ یا دین میں مُدَاھِن بنے۔ یعنی اُمورِ خلاف شرع پر اِنکار واِعراض اور کراھت ونفرت برقرار رکھے اور اس سے اسلام یا مسلمانوں کو بھی ضرر ہو، جب بھی شانِ مومن کے خلاف اور ممنوع ہے۔

اور مطلقاً مودّتِ کفار کی ممانعت میں اس قدر آیات وارِد ہیں کہ مختصر میں ان کا جمع کرنا دشوار ہے۔''

(ص ۲۶۴۔ فتاویٰ صدرالافاضل۔ مطبوعہ بمبئی)

مزید آیات اور تفاسیرِ قدیمہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اور اگر اس درجہ محبت نہیں کہ:

اپنے دین کی پَروا نہ کرے۔ یا کافر کے دین کی نفرت دل سے کم ہو۔ بلکہ باوجود اس کے، دل میں کفر وشعارِ کفر ومَراسمِ کفر کی پوری نفرت ہو۔ اور اپنے دین کی اِہانت ومخالفت گوارہ نہ کر سکے تو بھی کافر کی طرف قلب کا میلان، اس کے ساتھ محبت کرنا (شرط یہ ہے کہ یہ محبت جبلّی وطبعی نہ ہو) معصیت وکبیرہ اور ممنوع وناجائز ہے اور مومن کی شان کے خلاف ہے۔''

(ص ۲۷۱۔ فتاویٰ صدرُالافاضل مطبوعہ بمبئی)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ:

مخالطت ومعاملت مطلقاً داخلِ موالات اور ممنوع نہیں۔

کیوں کہ موالات اور دوستی کا اِطلاق جیسا کہ محبت ورَبطِ قلب پر ہوتا ہے۔ ایسا ہی رفیقانہ اِختلاط اور دوستانہ میل جول پر بھی ہوتا ہے۔ کفار کے ساتھ ایسی مجالست ومصاحبت، مُواکلت ومشاربت، تناصر وتعاون بھی ممنوع ہے۔ انھیں راز دار بنانا، اپنے اُمور اُن کے ہاتھ میں دینا بھی ناجائز ہے۔

اس کی قدرے تفصیل گذارش کروں کہ:

کفّار کے ساتھ ایسا طرزِ عمل، ایسا میل جول، ایسا معاملہ جو دوستی اور محبت کی صورت رکھتا ہو۔ اور علاماتِ موالات ہو سکے، گو محبت ومَوَدَّت کے ساتھ نہ ہو، وہ بھی داخلِ موالات اور ناجائز ہے۔'' (ص ۲۷۲۔ فتاویٰ صدرُالافاضل۔ مطبوعہ بمبئی)

''کفّار کو دوست بنانا، یا ان کو راز دار ٹھہرانا، ان کو مددگار سمجھنا، ان کو اپنے اُمور کا والی اور دخیلِ کار قرار دینا، انھیں قوت پہنچانا، ان سے بے ضرورت دوستانہ میل جول، اِختلاط وارتباط کی رَسمیں برتنا، مسلمانوں کے مقابلے میں اِمداد کرنا۔ یہ سب باتیں ممنوع اور داخلِ موالات ہیں۔ اور قرآنِ پاک میں ان کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔

لیکن شریعتِ مطہّرہ کے جُملہ اَحکام سراسر حکمت ہیں۔ اور مسلمانوں کی مصلحتیں ان میں ملحوظ رکھنا جہاں کفار کا غلبہ ہو، یا وہ حاکم ووالی ہوں۔ اور مجانبتِ کلّیہ واِنقطاعِ تام سے مسلمانوں کے ضرر کا اندیشہ ہو، وہاں ان کے ساتھ ایسے امور میں شرکت جو ممنوع نہیں ہیں اور جس سے اسلام

اور اہلِ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا ہے، جائز ہے۔ قلب کفر و کفار کی محبت سے خالی ہونا چاہیے۔''
(ص۲۷۳۔۲۷۴و۲۷۵۔فتاوٰی صدرُ الافاضل۔مطبوعہ بمبئی)

''اس قسم کے معاملات میں مسلمانوں کو کفّار کے ساتھ محل وموقع پر حسبِ حاجت مکارمِ اَخلاق کا برتاؤ بھی جائز ہے تاکہ وہ بھی اہلِ اسلام کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں۔''
(ص۲۷۷۔فتاوٰی صدرُ الا فاضل۔مطبوعہ بمبئی)

''کفّار خواہ کوئی بھی ہوں۔ مجوس یا ہنود، نصاریٰ یا یہود، موالات سب سے ممنوع اور مَنْھی عَنہٗ ہے۔
اس باب میں مُحارِب اور غیر مُحارِب میں کوئی فرق نہیں۔
بات یہ ہے کہ کفّار سب ہی اسلام واہلِ اسلام کے دشمن ہیں۔ اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ۔
اپنے موقع پر کوئی بھی مسلمانوں سے درگذر کرنے والا نہیں ہے۔ جس کو موقع ملا، اس نے جنگ کی۔ جس کو موقع نہیں ملا وہ ہر دم اس موقع کی تلاش میں ہے۔ اور اس کے سینے میں بھی عداوت بھرا دِل ہے۔ وہی جوش وغضب ہے جو مُحارِب کے دل میں ہے۔ یہ اس سے کسی طرح کم نہیں۔
لڑائی بھی قِسم قِسم کی ہے۔ کوئی تلوار لے کر مقابلے میں آتا ہے۔ کوئی دوست بن کر خُفیہ تدبیر سے کام کر جاتا ہے۔ اور صَیّاد کی طرح گرفتارِ مصیبت کرنے کے لئے دانہ سامنے رکھتا ہے اور جال خاک میں چھپاتا ہے۔ اور اپنی عَیّاری ومَکّاری سے ضررِ عظیم پہنچاتا ہے۔ مسلمانوں کا دوست ان میں ایک بھی نہیں۔'' (ص ۲۷۸و۲۷۹۔فتاویٰ صدرُ الا فاضل۔ مطبوعہ بمبئی)

اس رسالہ کے آخری حصے میں صدرُ الا فاضِل رقم طراز ہیں:
''اب ظاہر وباہر ہوگیا کہ:
ہنود سے بھی تَرکِ موالات فرض ہے۔ اور آیت لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ الخ سے کفّار، غیر مُحارِبین کے ساتھ جوازِ موالات ثابت کرنا محض باطل ہے۔
ہنود نہ تو غیر مُحارِب ہیں اور نہ ذِمّی۔ بلکہ وہ اہلِ کتاب سے بھی بدر جہا بدتر ہیں۔
ان سے موالات در کنا ''بر واحسان'' بھی جائز نہیں۔
کیوں کہ آیتِ ممتحنہ سے اگر ''بر واحسان'' کا جواز ثابت ہوتا ہے تو ذِمّی کے ساتھ، نہ کہ حربی

کے لئے۔ تفسیر احمدی میں ہے:
اَلْاُوْلٰی فِی جَوَازِ الْاِحْسَانِ۔اَی الذِّمِّی۔وَالثَّانِیَةُ فِی عَدَمِہٖ۔اَی الْحَرْبِی۔
پہلی آیت ذِمّی کے ساتھ جوازِ احسان کے بیان میں ہے۔ اور دوسری عدمِ جواز میں حَربی کے ساتھ۔ اور موالات تو کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں۔ حربی ہو یا غیر حربی۔
اس مدَّعا پر آیاتِ کثیرہ پیش ہو چکی ہیں۔ آیتِ ممتحنہ میں جوازِ موالات پر کوئی دلالت نہیں۔ تفاسیر کی عبارتیں گذر چکی ہیں۔
موالات تو کجا، کفّار سے خواہ وہ غیر مُحارِب ہوں، بلکہ ذِمّی سے بے ضرورت سلام تک جائز نہیں رکھا۔'' (ص ۲۹۵و۲۹۶۔فتاویٰ صدرُ الا فاضل۔مطبوعہ تنظیم افکارِ صدر الا فاضل۔بمبئی)

انگریزی اِقتدار وحکومت کے دور میں ''تَرکِ تعاون'' کا ایک انداز صدرُ الشریعہ حضرت مولانا محمد امجد علی اعظمی رضوی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی زندگی میں اس طرح ملتا ہے کہ آپ کے صاحب زادے مولانا قاری رضاءالمصطفیٰ اعظمی خطیب وامام نیو میمن مسجد، کراچی مُدَّظِلُّہٗ العَالِی بیان کرتے ہیں:
''میری پیدائش ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۴ میں کافی باشعور ہو گیا تھا۔ میں نے ان دس سالوں میں والدِ گرامی حضرت صدرُ الشریعہ علّامہ امجد علی اعظمی رَضِیَ اللّٰہُ عنہٗ کو صبح ومَسا انتہائی قریب سے دیکھا۔ بریلی میں بھی دیکھا۔
..........میں نے ۱۹۳۴ء سے پورے ہوش وحواس سے حضرت صدر الشریعہ کو دیکھا۔ میں نے ان کا وہ دَور بھی دیکھا جب وہ اجمیر شریف میں تھے۔ وہاں نواب حیدر آباد دَکن نے جو مدرسہ (دارالعلوم معینیہ عثمانیہ، اجمیر شریف) قائم کیا تھا اس کے وہ صدرُ المدرسین بھی تھے۔
..........علی گڑھ میں محمد علی جناح آتے تھے تو ان کے ساتھ بھی ان (صدرُ الشریعہ) کی مِیٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ ابّا جی (صدر الشریعہ) ۱۹۴۴ء ۱۹۴۵ء کی اس اہم مِیٹنگ میں بھی علی گڑھ میں شریک تھے جس میں لیگ والوں نے انگریزوں سے پورے طور پر ملک کے آزاد کرانے کا مطالبہ کیا۔

اس وقت مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی علی گڑھی (مترجم الثّورۃُ الهندیۃ ازعلاّمہ فضلِ حق خیرآبادی بنام ''باغی ہندوستان'' مطبوعہ بجنور ولاہور ومبارک پور) ہمارے یہاں (مدرسہ حافظیہ سعیدیہ، ریاستِ دادوں۔علی گڑھ) کے نائب صدرُالمدرسین تھے اور کانگریسی تھے۔ اتنے بڑے کانگریسی کہ گھڑی کا پٹّہ بھی کھدّر کا بنوایا تھا۔ چپل کی پٹّیاں بھی کھدّر کی بنوائی تھیں۔

اس وقت جب یہ بات آئی تو ابّا جی (صدرالشریعہ جو مدرسہ حافظیہ سعیدیہ۔ ریاستِ دادوں، علی گڑھ کے اس زمانے میں صدرُالمدرسین تھے) نے کہا کہ:

''انگریزوں کا بائیکاٹ ہی کرنا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ کھدّر ہی پہنا جائے جو گاندھی آشرم کا بنا ہو؟ ہندوستان کے بنے ہوئے دوسرے کپڑے بھی پہن سکتے ہیں۔ آخر مسلمان بھی تو کپڑے تیار کر رہے ہیں؟ دھاگے کات رہے ہیں؟

جب ہمارا مقصد انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنا ہے تو آخر ہم مسلمانوں میں یہ جذبہ کیوں نہیں پیدا کرتے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنیں۔ صرف گاندھی آشرم کے تیار کیے ہوئے کھدّر پہننے پر زور دینے میں تو ایک طرح کا نقصان ہی ہے۔

اس کے بعد ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے تمام دوسرے کپڑے پہننے چھوڑ دیے اور گھر میں بتادیا کہ ہمارا کپڑا ہماری ٹوپی بھی گاڑھے کی ہوگی۔ اس کے بعد پھر بٹن پر غور کیا تو کہنے لگے کہ:

یہ بھی تو انگریزوں کا ہی بنایا ہوا ہے؟ لہٰذا انھوں نے بٹن لگانا بھی چھوڑ دیا اور گھنڈی لگانا شروع کر دیا۔'' الخ (انٹرویو بعنوان ''شہزادۂ صدرُالشریعہ قاری رضاءالمصطفیٰ سے خصوصی ملاقات''۔ مطبوعہ ص ۱۴۱۔ ماہنامہ جامِ نور۔ دہلی۔ شمارہ محرم ۱۴۲۸ھ/جنوری ۲۰۰۷ء)

تحریکِ ترکِ موالات کے دوران (۲۱۔۱۹۲۰ء) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور، مدرسہ عالیہ کلکتہ وغیرہ پر موالاتی لیڈروں نے تعلیمی بائیکاٹ کے لئے دھاوا بولا مگر ہندوؤں کی کوئی تعلیم گاہ اِن موالاتیوں کی زد میں نہیں آئی۔ بلکہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں طلبہ واساتذہ کو خطاب کرنے اور تعلیمی بائیکاٹ کے لئے گاندھی کو پنڈت مدن موہن مالویہ نے گھسنے بھی نہیں دیا۔ یہ بھی اس تحریکِ ترکِ موالات کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) تحریکِ ترکِ موالات کے نمایاں لیڈر تھے۔ ان کے عزائم بلند تھے۔ انھوں نے ''اِمامُ الهند'' بننے کے لئے ''مسئلۂ اِمامت'' بھی چھیڑا مگر عُلما نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور کسی معروف عالم نے ان کی تائید نہ کی۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر ان کے حریف اور ان کی راہ کے سنگِ گراں نہیں بلکہ کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ اس لئے کچھ دنوں بعد مولانا آزاد نے مسئلۂ اِمامت کو سَرد خانے میں ڈال دیا۔ (خلاصۂ مفہوم: ص: ۱۳۰۔ تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی)

تحریکِ ترکِ موالات کے اِختتام اور اس کے انجام کے بارے میں مشہور مؤرخ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''اچانک ۵/فروری ۱۹۲۲ء کو گورکھ پور جو یوپی کا ایک ضلع ہے، اس کے ایک گاؤں ''چَوراچَوری'' میں ایک جلوس والوں اور پولیس میں تصادم ہوگیا۔ کانسٹبلوں نے گولی چلانا شروع کیا اور جب ان کا کارتوس ختم ہوگیا تو وہ پولس کے دفتر (تھانہ) واپس چلے گئے۔ مجمع نے عمارت کو آگ لگا دی اور بائیس (۲۲) کانسٹبل زندہ جل گئے۔

گاندھی جی کے لئے یہ واقعہ اِس انتہائی حد تک تکلیف دِہ تھا کہ:

''انہوں نے اس تحریک کو واپس لینے کا فیصلہ کرلیا۔ ۱۱/فروری (۱۹۲۲ء) کو کانگریس کمیٹی سے مشورہ کے بعد۔ لیکن خلافت کمیٹی کی رائے بغیر لیے ہوئے۔ عملی سِوِل نافرمانی کا پروگرام منسوخ کر دیا گیا۔

گاندھی نے پانچ دن کا فاقہ کیا اور ''ینگ انڈیا'' مؤرخہ ۱۲/فروری (۱۹۲۲ء) میں درد ناک الفاظ میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا۔'' الخ (ص: ۶۰۹، تاریخِ تحریکِ آزادی، جلدِ سوم، از تاراچند، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔ طبعِ دوم ۲۰۰۱ء)

اسی طرح کے حالات کا تجزیہ اور اس پر حکیمانہ تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید سلیمان اشرف (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:

''اے سَرمستانِ بادۂ لیڈری! ذرا ہوش میں آکر ہمیں بتاؤ کہ:

تم ''سوراج'' کے لئے اٹھائے گئے تھے یا ''خلافت'' کے لئے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا؟

تم اسلام کی نشر تبلیغ کا علم لے کر بڑھے تھے یا کفر وشرک کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی؟

اسلام کی حقانیت اور ارکانِ اسلام کا غیر مسلم کو گرویدہ بنانا تمھارا نصبُ العین تھا یا خود کفر وشرک کے جال میں پھنس کر آزادیِ ہند کا ترانہ سنانا مقصود ومطلوب تھا؟۔''

(ص ۴۶۔اَلنُّور۔مؤلّفہ سید سلیمان اشرف۔مطبوعہ علی گڑھ ولاہور وبمبئی)

''یہ سارے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہورہے ہیں، ان سے ہندوؤں کے مطالب ومقاصدِ مذھبی وملکی کا تکملہ ہورہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی خدمت انجام پارہی ہے؟''

چوبیس کروڑ ہندوؤں کا قدم خلافتِ اسلامی کی طرف بڑھا یا کہ سات کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مَراسمِ کفر وشرک کو لبَّیک کہا؟''

مسلمان ہندوؤں کے ہوگئے یا ہندو مسلمانوں کے ہورہے ہیں؟''

مسلمانوں کے قلوب آہنی تھے یا مقناطیسی؟ مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیسی قوت سے انھیں اپنے میں جذب کرلیا؟

اس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ کہ خطیبانہ عبارت آرائی سے۔''

(۴۸۔النُّور۔مؤلّفہ سید سلیمان اشرف)

''علم بَرداران'' نان کوآپریشن وسوراج''! قیامت ایک دن ضرور قایم ہوگی۔ جہاں اولین وآخرین کا مجمع ہوگا۔ اور پھر لِمَنِ المُلکُ الیوم۔لِلّٰہ الوَاحِدِالقَھَّارِ کی دِل کپکپا دینے والی آواز کے ساتھ تختِ رب العالمین سامنے ہوگا۔............اُس دن تمہارے سَرائرُ ومَخفیات کھل جائیں گے ....اُس دن تمھیں اُس جلیل وَجَبّار قادِر وقَھّار کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا............

تمہاری کیا حالت ہوگی اور تمھارے اِن اعمال کا ترازوے عمل پر کیا وزن ہوگا؟

خلافت اور دین کا نام لے کر سوراج اور تلقیناتِ گاندھی میں فنا ہوجانا کیا نتیجہ لائے گا؟........

یقین کرلو کہ اُس روز تمہاری تلبیس کی چادر پارہ پارہ ہوگی اور تدلیس کا جال ریزہ ریزہ۔ یہی لیڈری اُس دن تمھیں وبال ہوگی اور یہ ہر دل عزیزی تمھیں رُسوا وخوار بنائے گی.........

(ص۴۹و۵۰۔اَلنُّور)

" لاالٰہ الّا اللّٰہ۔گاندھی نے کس حُسنِ تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذھب کا غلام بنالیا۔ایک برس بھی نہ گذرنے پایا کہ حمایتِ خلافت سے نہ صرف ہندو دست کش ہوگئے بلکہ اس عیّارانہ چال سے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مسئلۂ خلافت کو دھکّے دے کر پسِ پشت ڈال دیا گیا۔خلیفۃُ المُسلمین اور امیرُ المؤمنین کی جگہ گاندھی کو دی گئی۔

اب یہ مُدّعیانِ اسلام اسی کی کوشش کررہے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے، گاندھی کی محبت وعظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔''(ص۴۷۔اَلنُّور)

ڈاکٹر تاراچند کی تحریر کردہ تاریخ کے یہ حصہ قارئینِ کرام بغور مطالعہ فرمائیں:

''عدمِ تعاون کی گاندھیائی تحریک، قومیت، سیاست، مذہب، تصوُّف، اور تشدُّد دانہ تعصُّب کا ایک عجیب ملغوبہ بن گئی تھی۔لیکن جیسا کہ جواہر لال نہرو نے تمثیلاً بتایا جیسے ایک پس ماندہ اور پس ہمت قوم نے یک بیک اپنی پیٹھ سیدھی کی ہو اور اپنا سَر اٹھایا ہو، اور ایک ہمہ گیر پیمانے پر ملک کے طول وعرض میں نظم اور ضبط سے بھرپور مشترکہ کارروائی کی ہو۔

ہم نے محسوس کیا کہ اس کارروائی سے قوم کو ایک ایسی قوت ملے گی جس کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔اس لئے ہم لوگوں نے اس کارروائی کے پسِ پردہ غور وفکر کی ضرورت کو نظر انداز کردیا۔

ہم لوگ اس حقیقت کو بھول گئے کہ:

ایک بیدار نَصبُ العین کے بغیر عوام کا جوش اور اس کی خارجی قوت اور طاقت دورِ آتشیں کی طرح ختم ہوجاتی ہے۔''الخ (ص:۱۱۷۔تاریخ تحریکِ آزادی، جلدِ سوم۔از ڈاکٹر تاراچند۔مطبوعہ نئی دہلی۔)

لالہ لاجپت رائے جو گاندھی کی طرف بنظرِ استحسان دیکھا کرتے تھے اور جنہوں نے ۱۹۲۰ء میں ناگ پور میں عدمِ تعاون کی تحریک کی تجویز کی حمایت کی تھی، وہ ۱۹۲۴ء میں لکھتے ہیں:

''یہ بات خوش کن نہ ہوگی کہ گذشتہ دہائی کے دوران ہم سب ایک ایسی فضاوجود میں لائے ہیں جو قومیت اور رَواداری کی خوشیوں کی جگہ رَجعت پسندی اور مذہبی جنون کو زیادہ

پیدا کرتی ہے۔

تحریکِ عدمِ تعاون خود مادّی طور پر اس فضا کی تخلیق میں مددگار رہوئی ہے۔ یہ بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ ہندوستان میں خلافت تحریک جسے سیاسی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے تھا، مذہبی بنیاد کا سہارا لیا گیا۔ اس کی حمایت میں سیاسی محرّکات بھی تھے۔ اور یہ بات اور بھی بدقسمتی کی تھی کہ:

مہاتما گاندھی اور دوسرے زُعمائے خلافت نے مذہب کو ایک نمایاں آزادی دے دی۔ یہ تحریک حقیقۃً اور اصولی طور سے مذہبی ہونے کے بجائے سیاسی زیادہ تھی۔

ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مذہبی احکامات کے حوالے، دوسرے ہمالیائی غلطی کے مترادف تھے۔" الخ (ص: ۳۰۷، تاریخ تحریکِ آزادی، جلدِ سوم۔ مؤلّفہ ڈاکٹر تاراچند، مطبوعہ نئی دہلی۔)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اور عُلما و قائدین و حامیانِ تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے درمیان بنیادی فرق یہی تھا کہ:

عُلما و قائدینِ تحریکِ خلافت و موالات، آیات و احادیث میں بسا اوقات تحریفِ معنوی کرتے ہوئے اپنی سیاست کے لئے ان کا استعمال کرتے تھے۔ جب کہ امام احمد رضا ان آیات واحادیث کے مقصود و مراد میں کسی قسم کی تحریف کو قطعاً گوارہ نہیں کرتے تھے، اور سیاست کو بے جا طور پر شرعی حُدود میں داخل کر کے شریعت کو اپنی سیاست کا تابع بنانے کی مدۃُ العمر مزاحمت ومخالفت کرتے رہے۔ اور حق کا بَرملا اظہار کرنے میں کبھی کسی تکلف اور پس و پیش کو قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔

یہ صراحت وصاف گوئی اور جراَت واستقامت بہت سے لوگوں کے لئے سببِ ناگواری تھی۔ بداندیشی وبدگمانی سے بھی کچھ لوگ باز نہیں آتے تھے اور اس کے لئے اُنھیں آثار وقرآئن واحوال ووقائع وحقائق کو دیکھنے سمجھنے کی کبھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اپنے اس عملِ مذموم کے لئے کسی ثِقہ روایت اور ثبوت وشہادت کی طرف کوئی توجہ دینا بھی اپنا اخلاقی فریضہ نہیں سمجھتے تھے۔

ایک معاصر عالم وشیخ اور تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے سرگرم کارُکن مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:

"تحریکِ تَرکِ موالات جب تک زوروں پر رہی، مجھے (مولانا احمد رضا) فاضلِ

بریلوی رَحمۃُ اللّٰہِ عَلیہ سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

تَرکِ موالاتیوں نے ان کے متعلق مشہور کر رکھا تھا کہ:

"نَعُوذُ بِاللّٰہ: وہ سرکارِ برطانیہ کے وظیفہ یاب ایجنٹ ہیں۔ اور تحریکِ تَرکِ موالات کی مخالفت پر مامور ہیں۔"

دراصل ہر دور میں کسی کو بدنام کرنے کے لئے کوئی چلتا ہوا اِصطلاحی لفظ اختیار کرلیا جاتا ہے۔ جن کے تماشے، میں اپنی زندگی میں بہت دیکھ چکا ہوں۔

اِس قسم کی خبریں خواہ ایک فیصدی بھی اپنے اندر صداقت نہ رکھتی ہوں، لیکن عام لوگ کسی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بلکہ کوئی ثبوت طلب کیے بغیر ایمان لے آتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع کے لئے یہ محاورہ بنا ہے: "کوّا کان لے اُڑا"

تحریکِ تَرکِ موالات کے دوران جوش میں کسی کو تحقیق کا ہوش نہ تھا۔ اس لئے ایسی اَفواہوں کو غلط سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن جیسے جیسے شعور آتا گیا، مذھبی تعصّب اور تنگ دلی کا رَنگ ہلکے سے ہلکا ہوتا گیا۔"

(ص ۱۲۵۔ تأثرات بقلم مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری۔ جہانِ رضا۔ مؤلّفہ محمد مُرید احمد چشتی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء)

تاریخی حقائق کی بات کی جائے تو اِس طرح کے اِلزامات عائد کیے جانے والوں کے پاس عِناد ومُکابرہ اور بدگمانی وکردارکشی کے سِوا کچھ نہ تھا اور اب بھی کچھ نہیں ہے اور دوسری طرف اِن اِلزامات کی اب تک تشہیر کرنے والے حضرات کے اکابر کے اِقبالیہ بیانات اور ان کے گھر کی روایات وشہادات سے کچھ اس طرح کے حقائق ومناظر سامنے آتے ہیں کہ ان پر نقد وجرح، پردہ پوشی اور اِنکار کی کہیں سے کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔

سرسید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) اپنی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" مطبوعہ ۱۸۵۸ء۔ مشمولہ حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

"بیس تیس برس پیشتر ایک بہت بڑے نامی مولوی محمد اسمٰعیل نے ہندوستان میں جہاد کا اعلان کیا۔ اور آدمیوں کو جہاد کی ترغیب دی۔ اس وقت انھوں نے صاف بیان کیا کہ:

"ہندوستان کے رہنے والے جوسرکار انگریزی کے امن میں رہتے ہیں، ہندوستان

میں جہاد نہیں کرسکتے۔"

اس لئے ہزاروں آدمی جہادی ہرضلع ہندوستان میں جمع ہوئے اور سرکاری عمل داری میں کسی طرح کا فساد نہیں کیا۔اورغربی سرحدِ پنجاب پر جا کرلڑائی کی۔"

(ص ۸۱۰۔حیاتِ جاوید۔مؤلّفہ خواجہ الطاف حسین حالؔی۔مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔نئی دہلی۔طبعِ پنجم ۲۰۰۰ء)

اِلزام تراشی اور پروپگینڈہ کا کمال ہے کہ آج بھی "قبیلے کا قبیلہ" جس جُرم میں ماخوذ ہےاس کے افراد دوسروں پر بار بار انگشت نُمائی کرتے رہتے ہیں۔حالاں کہ انھیں اپنی یہ تاریخ اچھی طرح معلوم ہے کہ:

جمادیٰ الآخرہ ۱۲۴۱ھ/جنوری ۱۸۲۶ء میں سید احمد رائے بریلوی صاحب وشاہ محمد اسمٰعیل دہلوی صاحب کی "جماعتِ مجاہدین" رائے بریلی" ("موجودہ یوپی) سے روانہ ہوکرفتح پور، گوالیار، ٹونک، سندھ، بلوچستان ہوتے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچی اوراس خطے میں مذھبی تبلیغ اورعسکری سرگرمی کے ذریعہ اپنی ایک حکومت کے قیام کی جان توڑ کوشش میں لگ گئی جس کا نقطۂ عروج معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء ہے اوراسی معرکہ میں مذکورہ دونوں حضرات بھی جاں بحق ہوگئے۔

کسی بھی مؤرّخ نے اپنی کسی تحریر اوراپنی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جنوری ۱۸۲۶ء سے مئی ۱۸۳۱ء تک رائے بریلی سے پشاورتک کسی بھی مرحلے میں انگریزوں سے اس "جماعتِ مجاہدین" کی کوئی ادنیٰ بھی مزاحمت ہوئی ہو۔

ایک نہایت قابلِ غورنکتہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی گذشتہ ساری چھوٹی بڑی جنگوں کا رُخ انگریزوں کے خلاف تھا جب کہ اس تحریکِ بالاکوٹ کا رُخ پہلے مرحلے میں صرف سِکھوں کے خلاف وعظ وتبلیغ وحکمِ جہاد اور دوسرے مرحلے میں پنجابی وسرحدی پٹھانوں کے خلاف ہوگیا اور یہ کسے معلوم نہیں کہ پٹھان اورسکھ دومضبوط وقوی ہندوستانی بازوانگریزوں سےنبردآزما ہونے کی بھرپور صلاحیت اورشجاعت وطاقت کے حامل تھے۔

حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ سکھوں سے جہاد کے نام پر کوچ کرنے والے فوجی دَستہ کا "پہلا جہاد" سکھوں سے نہیں بلکہ پٹھانوں سے ہوا۔جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی

۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) بیان کرتے ہیں کہ: سید صاحب نے پہلا جہاد یارمحمد خاں حاکمِ یاغستان سے کیا۔" (تذکرۃُ الرشید، حصہ دوم (طبعِ اول ۱۹۰۸ء مطبوعہ میرٹھ) مطبوعہ میرٹھ)

ہندوستان بھر کے انگریز حکمرانوں، ان سے وابستہ مسلم امیروں اورحکومت کے ذِمّہ داروں نے "تیاریِ جہاد" اور "سفرِ جہاد" کی نہ صرف کھلی چھوٹ دے رکھی تھی بلکہ میزبانی ومہربانی کے بھی مشتاق ومتمنی رہا کرتے تھے۔

سید طفیل احمد منگلوری علیگ نے "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے نام سے ایک وقیع تاریخی کتاب لکھی ہے جس کی پہلی طباعت واشاعت ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی اوراب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔اس کتاب کے اندرسید طفیل احمد منگلوری علگ لکھتے ہیں:

"سید (احمد رائے بریلوی) صاحب کے سوانح میں ہے:

جب آپ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کوتشریف لیے جاتے تھے، کسی شخص نے پوچھا کہ:

آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اِس ملک پر حاکم ہیں اوردینِ اسلام سے مُنکر ہیں، گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملکِ ہندوستان لے لیں۔یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہوجائیں گے۔

جواب دیا کہ:

کسی کا ملک چھین کرہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے، نہ انگریزوں نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے۔بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پرظلم کرتے اوراذان وغیرہ فرائضِ مذھبی ادا کرنے میں مُزاحم ہوتے ہیں۔اگرسکھ اب یاہمارے غلبہ کے بعدان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کوان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

اورسرکار انگریزی گو مُنکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم وتعدّی نہیں کرتی اورنہ ان کو فرضِ مذھبی وعبادتِ لازمی سے روکتی ہے۔

پھرہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں؟ اورخلافِ اصولِ مذہب، طرفین کا خون بلاسبب گراویں؟ (ص ۷۰۔سوانحِ احمدی، مولّفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری)

جہاد پر جانے سے قبل سید (احمد رائے بریلوی) صاحب نے شیخ غلام علی رئیسِ الہ آباد کی معرفت نواب لفٹنٹ گورنر کو ارادۂ جہاد کی اطلاع دی۔

جواب ملا کہ:

جب تک انگریزی عمل داری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔'' (ص ۷۰۔ سوانحِ احمدی مؤلّفہ محمد جعفر تھانیسری)

اس بارے میں سرسید احمد خاں مرحوم نے بھی حسبِ ذیل تحریر فرمایا تھا:

''اس زمانہ میں علی العموم مسلمان عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ھدایت کرتے تھے۔ ہزاروں مسلّح مسلمان اور بے شمار سامانِ جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے گورنمنٹ کو اِطلاع دی۔ گورنمنٹ نے صاف لکھا کہ:

''تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیے۔''

دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو ولیم فریزر کمشنرِ دہلی نے ڈگری دی۔ جو وصول ہو کر سرحد بھیجی گئی۔'' (مضمونِ سرسید بجواب ڈاکٹر ہنٹر۔ مندرجہ انسٹی گزٹ علی گڑھ۔ ۸؍دسمبر ۱۸۷۱ء)

سوانحِ احمدی میں اس روپیہ کے بارے میں تحریر ہے کہ:

''سید صاحب یاغستان میں مصروف بہ جہاد تھے تو سات ہزار روپیہ کی ایک ہُنڈی پنجاب میں موصول نہ ہونے پر دیوانی میں دعویٰ کیا گیا جس کی ڈگری دیوانی اور ہائی کورٹ سے ملی۔ (ص ۷۰۔ سوانحِ احمدی مؤلّفہ محمد جعفر تھانیسری)

اب سوال یہ ہے کہ:

گورنمنٹ انگریزی نے اس وقت یہ کیوں گوارہ کیا کہ:

تمام ہندوستان میں جہاد کے لئے سامانِ جنگ اور روپیہ فراہم ہوتا رہے اور گورنمنٹ کی طرف سے نہ صرف اس کی اجازت ہو بلکہ مجاہدین کو ہر قسم کی اِمداد دی جائے اور ان کا روپیہ وصول کر کے انھیں دیا جائے؟

اس کا جواب حسبِ ذیل اِقتباس میں ملے گا:

''اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار اس وقت سید صاحب رَحمۃُ اللّٰہِ عَلیہ کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی۔

مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔'' (ص ۱۳۹۔ سوانحِ احمدی مؤلّفہ محمد جعفر تھانیسری)

ختم شد تحریرِ سید طفیل احمد منگلوری علیگ۔

(ص ۱۳۲ تا ۱۳۴۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (طبع اول ۱۹۳۷ء)۔ مؤلّفہ سید طفیل احمد منگلوری۔ طبع جدید ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء۔ مکتبہ الحق، جوگیشوری، بمبئی)

منشی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) کی کتاب ''سوانحِ احمدی'' و ''تواریخِ عجیبہ'' اور مرزا حیرت دہلوی کی کتاب ''حیاتِ طیبہ'' جناب سید احمد رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل دہلوی اور تحریکِ بالاکوٹ کے قدیم مآخذ میں جن کے مشمولات کا جدید کتب و رسائل سے موازنہ کیا جائے تو حیرت انگیز بلکہ مضحکہ خیز تضادات سامنے آئیں گے۔

تحریکِ جہاد شروع ہونے سے بہت پہلے سید احمد رائے بریلوی صاحب بانی و نواب ریاستِ ٹونک (راج پوتانہ) امیر خاں کے فوجی ملازم تھے۔ یہ ۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۸ء کی بات ہے۔ یہاں کا ایک تاریخی کارنامہ (در ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۱ء) بیان کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی اپنی کتاب ''حیاتِ طیبہ (طبع اول ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء۔ دہلی) میں لکھتے ہیں:

''۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ:

انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ جو شہر بعدازاں دیے گئے اور ان پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔

لارڈ ہیسٹنگ، سید صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھے۔

دونوں لشکروں کے بیچ ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تینوں آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب۔

سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا۔ آپ نے اسے یقین دلایا تھا کہ:

انگریزوں سے مقابلہ کرنا اورلڑنا بھڑنا اگرتمھارے لئے برانہیں توتمھاری اولاد کے لئے سَمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔انگریزوں کی قوت دن بہ دن ترقی پذیر ہےاورتمام قومیں دن بہ دن تنزّلی کرتی جارہی ہیں۔تمھارے بعدفوج کوکون سنبھالے گئے؟اورعظیم الشان لشکرِ انگلشیہ کے مقابل میں کون میدانِ جنگ میں لاکے جمائے گا؟

یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آگئی تھیں۔اوروہ اب اس بات پررضا مند تھا کہ گذارہ کے لئے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تومیں بآرام بیٹھوں۔

امیرخاں نے ریاستوں اوران کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دَم کررکھا تھا۔

آخرایک بڑے مشورہ کے بعدسید احمد صاحب کی کارگذاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کرلیا۔جیسے جے پور سے ٹونک دِلوایا اوربھوپال سے سرونج۔

اس طرح متفرق پرگنے،ریاستوں سے بڑی قیل وقال کے بعد انگریزوں نے دِلوا کر بپھرے ہوئے اس شیر کوحکمت سے ایک پنجرے میں بند کردیا۔''(ص ۴۲۱۔حیاتِ طیبہ ازمرزاحیرت دہلوی۔مطبوعہ لاہور)

آغازِ سفرِ جہاد واَثنائے سفرِ جہاد سے متعلق مزید چند بیانات وحقائق وواقعات ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں جن سے عام قارئین بھی ازخود بہت سے نتائج اَخذ کرسکتے ہیں۔

مولوی عبدالرحیم صادق پوری کا بیان ہے:

''سیدصاحب کی برابر یہ رَوِش رہی کہ:

ایک طرف لوگوں کوسکھوں کے مقابل آمادۂ جہاد کرتے اوردوسری جانب حکومتِ برطانیہ کی امن پسندی جتاکرلوگوں کواس کے مقابلے سے روکتے۔''(ص ۲۵۲۔الدُّرُّ المنثور۔ازمولوی عبدالرحیم صادق پوری۔مطبوعہ ھادی المطابع۔کلکتہ)

مرزاحیرت دہلوی ومنشی محمدجعفرتھانیسری کا مشترکہ بیان ہے کہ:

''کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا اورسکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی توایک شخص نے دریافت کیا:

آپ انگریزوں پرجہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟

آپ نے جواب دیا:

ان پر جہاد واجب نہیں ہے۔ایک توان کی رعیت ہیں۔دوسرے ہمارے مذھبی ارکان اداکرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے۔ہمیں ان کی حکومت میں ہرطرح آزادی ہے۔

بلکہ اگران پرکوئی حملہ آورہوتومسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں۔اوراپنی گورنمنٹ پرآنچ نہ آنے دیں۔''(ص ۴۲۴۔حیاتِ طیبہ مؤلّفہ مرزاحیرت دہلوی۔مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء(طبعِ اول دہلی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) وص ۷۳۔تواریخِ عجیبہ۔مؤلّفہ محمدجعفر تھانیسری۔مطبع فاروقی،دہلی)

کچھ اَحوال وواقعات کا ذکرکرتے ہوئے مرزاحیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''یہ تمام بیّن ثبوت صاف صاف اس اَمرپردلالت کرتے ہیں کہ:

یہ جہادصرف سکھوں کے لئے مخصوص تھا۔سرکارانگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخالفت نہ تھی۔''

(ص ۳۰۲۔حیاتِ طیبہ(طبعِ اول ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء۔دہلی)مؤلّفہ مرزاحیرت دہلوی۔مطبوعہ لاہور)

محمدجعفرتھانیسری(متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''آپ کی سوانحِ عمری اورمکاتیب میں بیس (۲۰) سے زیادہ ایسے مقامات ہیں جہاں کھلے کھلے اوراعلانیہ طورپرسید صاحب نے بدلائلِ شرعی اپنے پِیرولوگوں کوسرکار انگریزی کی مخالفت سے منع کیا ہے۔''(ص ۲۲۶۔سوانحِ احمدی مؤلّفہ محمدجعفرتھانیسری۔مطبوعہ اسٹیم پریس۔لاہور)

''اس سوانح اورمکتوباتِ منسلکہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ:

سیدصاحب کا سرکارانگریزی سے جہاد کرنے کا ارادہ ہرگزنہ تھا۔وہ اس عمل داری کواپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے۔اوراس میں شک نہیں کہ:

اگرسرکارانگریزی اس وقت سیدصاحب کے خلاف ہوتی توہندوستان سے سید صاحب کوکچھ مدد نہ پہنچتی۔مگرسرکارانگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زورکم

ہو۔'' (ص ۱۸۲۔ تواریخ عجیبہ۔ مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری)

نواب صدیق حسن بھوپالی (متوفی جمادی الآخرہ ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) لکھتے ہیں:

''نہ انھوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا اور نہ ہندوستان میں جہاد کا فتویٰ لکھا۔

.........گورنمنٹ اگر ساری کتابوں کو جمع فرما کر ملاحظہ کرے گی تو کسی کتاب میں ان کتب سے مسئلۂ جہاد یا بغاوت کا سرکارِ انگلشیہ سے یا فساد سکھانے والی کوئی بات نہیں پاوے گی۔'' (ص ۵۲۔ ترجمانِ وھابیہ۔ مؤلفہ نواب صدیق حسن بھوپالی۔ مطبوعہ امرتسر۔ پنجاب)

مولانا فضلِ حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

''آپ (شاہ محمد اسمٰعیل) اپنے شیخ طریقت سید احمد صاحب کو امام تسلیم کر کے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ جہاد کے لئے پنجاب پہنچے۔ گورنمنٹ انگلشیہ نے بھی آپ کے اس ارادے میں کسی طرح کی مزاحمت یا پیچیدگی پیدا نہیں کی۔'' (۱۳۴۔ الحیاۃ بعد المماۃ۔ مؤلفہ فضل حسین بہاری۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل، مُرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس۔ نئی دہلی ۲۵)

مشہور غیر مقلِّد عالم وصحافی مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

''سید صاحب، مولوی اسمٰعیل صاحب نے انگریزوں سے جہاد کا ارادہ نہیں کیا۔ اور مولوی اسمٰعیل صاحب نے کلکتہ میں اپنی مجلسِ وعظ میں برملا کہہ دیا کہ:

''ہم کو انگریزوں سے جہاد کرنا جائز نہیں۔'' (ص ۵۔ ضمیمہ ۶۔ جلد ۲۔ اشاعۃ السُّنّۃ لاہور۔ از محمد حسین بٹالوی)

سِکھ مخالف مُہم کو انگریز مخالف مُہم کی شکل دینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے صدر جمعیۃ العلماء ہند مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ''جہاد کا مقصد'' کے ذیلی عنوان کے تحت بحوالہ ماہنامہ برہان دہلی جلد ۲۱۔ اگست ۱۹۴۸ء یوں فرماتے ہیں:

''سید صاحب کا اصل مقصد چوں کہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط واِقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے، اس بِنا پر آپ نے اپنے

ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اس میں صاف صاف انھیں بتا دیا کہ:

آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اِقتدار ختم کر دینا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی اِس سے آپ کو غرض نہیں۔

جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو یا مسلمان یا دونوں، وہ حکومت کریں گے۔''

(ص ۱۹۔ حصہ دوم۔ نقشِ حیات۔ مؤلفہ مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند ضلع سہارن پور۔ ۱۹۹۹ء)

ریاستِ ٹونک (راج پوتانہ) کی خدمت کے دوران ایک کام کا ذکر کرتے ہوئے اور امیر خاں کی انگریزوں سے ایک جنگ کی حیرت انگیز منظر کشی کرتے ہوئے محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''ایک روز کا ذکر ہے کہ:

لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم، انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اس وقت سید صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر مثل ہَوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مُصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اس سپہ سالار کو لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اپنے خیمے تک چلے آئے۔

یہاں آ کر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالارِ مذکور نے عہد کر لیا کہ:

میں اسی دم اپنے لشکر کو بمقابلۂ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اپنی سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوگی۔ بلکہ صلح کی بات چیت اور رسل ورسائل شروع ہو گئے۔ اور

لارڈ ہسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کر لی گئی۔'' (ص ۷۱۔ حیاتِ طیبہ (حیات سید احمد شہید) مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ کراچی۔ ۱۹۶۸ء)

صلح کی اس بات چیت کے بعد ۱۸۱۶ء میں سید صاحب دہلی کے لئے روانہ ہوتے وقت جو پیش گوئی کر گئے اُس کے بارے میں نواب امیر خاں کے فرزند وزیرُ الدولہ (متوفی

۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء) اپنے ''وصایائے وزیری'' میں اِس طرح لکھتے ہیں:

''سید صاحب نے مولوی نذیر محمد صاحب سے کہ وہ بھی اس لشکر میں موجود تھے، اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ:

''اب جلد صلح ہوجائے گی اور فلاں فلاں شہر، فلاں فلاں علاقہ، سرکار انگریزی، نواب صاحب کو دے دے گی۔''

اس پیشین گوئی کا ذکر کرنے کے بعد نواب وزیرُ الدولہ فرزندِ امیر خاں بانی ونواب ریاستِ ٹونک لکھتے ہیں:

''موافق اس پیشین گوئی کے جو جو شہر اور مَمالک آپ نے بتائے تھے، ٹھیک وہی سرکار انگریزی نے ہم کو دیے اور صلح ہوگئی۔'' (ص ۱۷و۲۷۔ حیاتِ طیبہ (حیات سید احمد شہید) مؤلفہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ کراچی)

مرزا حیرت دہلوی نے اس صلح وکارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ایک ناموری کا کام آپ (سید احمد رائے بریلوی) نے یہ کیا کہ:

انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی۔ اور آپ ہی کے ذریعہ جو شہر بعد اَزاں دیے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔

لارڈ ہسٹنگ سید صاحب کی بے نظیر کارگذاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا۔ اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔

امیر خاں، لارڈ ہسٹنگ، اور سید احمد۔'' الخ

(ص ۴۲۱۔ حیاتِ طیبہ۔ مولّفہ مرزا حیرت دہلوی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء۔ طبعِ اول دہلی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء)

نواب وزیرُ الدولہ فرزندِ نواب امیر خاں کے بارے میں ایک تازہ دریافت یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو ریاستِ ٹونک کی جانب سے ایک حکم نامہ جاری کیا تھا جس کے مطابق انگریزوں سے جہاد کرنا ناجائز ہے۔ نواب وزیرالدولہ کی تحریر کا ذِکر یوں ہے:

''نواب نے .... (یہاں تحریر پڑھی نہیں گئی) .... کہا کہ: جہاد انگریزوں سے درست نہیں ہے۔

بعد اس کے سب فوج سے کہا کہ:

میں نمک خوار انگریزوں کا ہوں، میں نمک حرام نہیں ہوتا۔ اور تم میرے نمک خوار ہو، تم کو اختیار ہے کہ چاہو، نمک حرام ہوجاؤ۔

اس کے بعد پانچ سو آدمیوں نے نوکری چھوڑ دی۔

اس تحریر کے درمیان میں دیگر کچھ باتوں کے بعد لکھا ہے:

''مولوی فضلِ حق شریکِ جلسہ (مِٹنگ) ہوتے ہیں۔ اور مشتمل بر بَخت خاں کے محمد شفیع رسالدار، مولوی سرفراز علی خاں، اور مولوی امداد علی ساکن بلب گڑھ رسالدار ہیں۔

اور جو کچھ بخت خاں کرتا ہے، اِبتدا میں ان (مولوی فضلِ حق) کے مشورے سے ہوتا ہے۔ اور مولوی کی اِطاعت ظلِّ شاہ دربار خاص میں ضروری سمجھی جاتی ہے۔ میوٹینی پیپرز، کلکشن ۶۱، نمبر: ۱۱۲، ۷ستمبر ۱۸۵۷ء۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا۔ نئی دہلی۔

(ص ۵۲و۵۳۔ علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی! چند عنوانات۔ بقلم خوشتر نورانی۔ مطبوعہ ادارہ فکرِ اسلامی۔ دہلی۔ طبعِ اول۔ ستمبر ۲۰۱۱ء)

نواب امیر خاں بانی ریاستِ ٹونک کے حالات پر مشتمل ایک کتاب (''سنبھل سے ٹونک تک''۔ مؤلّفہ محمد عبدالمعید خاں) پر تبصرہ کرتے ہوئے صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (متوفی ۱۹۵۰ء) کے پوتے جناب ریاض الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی لکھتے ہیں کہ:

''مُرتّب کتاب کا کہنا ہے کہ:

:جب اس موقع (۱۸۵۷ء) پر تانتیا ٹوپے، علی بہادر اور...... فیروز بخت ابنِ ناظم بخت نواسۂ فرخ سیر نے راج پوتانہ کا رُخ کیا اور ٹونک تک پہنچے۔

...... انگریزوں کے ساتھ سیاسی معاہدہ کی وجہ سے نواب وزیرُ الدولہ نے فیروز شاہ وغیرہ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر ریاستی فوج نے ان کا ساتھ دیا۔''

یہ بھی اکثر ہوا ہے۔ اَربابِ اقتدار کی جو بھی مجبوری رہی ہو مگر عوامُ النّاس بِالعموم جذبۂ حُریت سے سرشار ہی رہے ہیں اور وقت آنے پر انھوں نے اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

البتّہ نواب صاحب کی توپوں کی سلامی میں بھی اضافہ ہوا اور انھیں حُسنِ کارکردگی کی

سند بھی ملی۔

انگریز ایسے ہی کھلونے دے کر بَہلا تا رہتا تھا۔

میرے دادا صاحب مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی فرماتے تھے کہ:

مغل سلاطین جب کسی سے خوش ہوتے تھے تو اسے جاگیر اور خلعت عطا کرتے تھے۔
انگریز چندہ لیتے ہیں اور خطاب دیتے ہیں۔

نواب محمد وزیر خاں کا انتقال ۱۸۶۴ء میں ہوا۔ اور اُن کے بعد اُن کے فرزندِ دل بند محمد علی خاں، ٹونک کے تیسرے فرماں رَوا مقرّر ہوئے۔'' الخ

(ص ۲۹۔ ماہنامہ ''کانفرنس گزٹ'' سلطان جہاں منزل، شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ، جلد ۱۱۔ شمارہ ۸/ اگست ۲۰۱۲ء)

بہر حال! سفرِ بالاکوٹ (۱۸۲۶ء) اور سِکھوں و پٹھانوں سے جہاد کا انجام (۱۸۳۱ء) کچھ اس طرح ہوا کہ سرسید احمد خاں (متوفی ۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں:

''چنانچہ ۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے پہاڑیوں پر جا کر قیام کیا اور انھوں نے اِس بات کا قصد کیا کہ سکھوں پر ہم لوگ جہاد کریں اور شہید ہوں۔ لیکن چوں کہ پہاڑی قومیں ان کے عقائد کی مخالف تھیں اس لئے وہ وہابی ان پہاڑیوں کو ہرگز اس بات پر راضی نہ کر سکے کہ وہ ان کے مسائل کو بھی اچھا سمجھتے مگر چوں کہ وہ سکھوں کے جَور وستم سے نہایت تنگ تھے اِس سبب سے وہابیوں کے اِس منصوبے میں بھی شریک ہوگئے کہ سکھوں پر حملہ کیا جاوے اور آخر کار وہابیوں اور پہاڑیوں نے متفق ہو کر سکھوں پر حملہ بھی کیا لیکن:

یہ قوم چوں کہ مذھبی مخالفت میں نہایت سخت ہے اس سبب سے اس قوم نے آخر میں وہابیوں سے دَغا کر کے سکھوں سے اتفاق کر لیا اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اور سید احمد صاحب کو شہید کر دیا۔''

(ص ۱۳۹ و ۱۴۰۔ مقالاتِ سرسید حصہ نہم۔ مطبوعہ لاہور)

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ:

''سید احمد صاحب کو اُتمان زَئی قبیلہ نے قتل کر ڈالا تھا۔'' (ص ۳۴ حاشیہ۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ مؤلفہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل، مُرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس۔

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۰۰۲ء)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (متولد ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء۔ متوفی ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں سکھوں کے ساتھ آپ نے متعدّد جہاد کیے۔ مگر بعض لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے آپ اپنے پیر سید احمد شہید کے ہمراہ لڑتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (علاقۂ سرحد) زخمِ تفنگ سے شہید ہوئے۔'' (ص ۴۲۲۔ تاریخِ اہلِ حدیث۔ مؤلّفہ محمد ابراھیم میر سیالکوٹی۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جب کہ سید احمد رائے بریلوی صاحب کے بیان کردہ اِلھامات اور فتح و نصرت کی بشارتوں کا عالَم یہ تھا کہ بار بار غیبی اشارے ہو رہے تھے اور انھیں کا ذِکر و اعلان کر کے اپنی جماعت کے لوگوں میں جذبۂ جہاد پیدا کیا جا رہا تھا اور اپنی کامیابی کا یقین دلایا جا رہا تھا۔

چنانچہ روانگیِ رائے بریلی بارادۂ جہادِ پنجاب (۱۸۲۶ء) کا یہ اِلہام بیان کیا جاتا ہے:

سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ

بروقتِ روانگیِ خراسان آپ اپنی ہمشیر یعنی والدۂ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ:

''اے میری بہن! میں نے تمھیں خدا کے سپرد کیا۔ اور یہ بات یاد رکھنا کہ:

''جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رِفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق، میرے ہاتھوں سے مَحو ہو کر ہر مُردہ سنّت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ ربُّ العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔

اگر قبل اَز ظہورِ اِن واقعات کے کوئی شخص:

میری موت کی تم کو خبر دے اور تصدیق پر حَلف بھی اُٹھائے تو تم اس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا۔ کیوں کہ میرے رب نے مجھ سے وعدۂ واثق کیا ہے کہ:

ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔''

آپ (سید احمد صاحب) کے سفرِ جہاد سے پہلے آپ کو یہ اِلہام ربانی ہوا تھا کہ:

ملکِ پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہوکر پشاور سے دریائے سَتلج تک مثل ملک ہندوستان کے رَشک افزائے چمن ہوجائے گا۔

چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مُرید واقف تھا۔''

(ص۱۷۱ اور ۱۷۲۔حیاتِ سیداحمد شہید۔مؤلّفہ محمد جعفر تھانیسری۔مطبوعہ کراچی)

سیداحمد رائے بریلوی صاحب کو ہونے والے اِلہامات اور وعدہ ہائے فتح کا جو انجام ہوا وہ قارئین اور ساری دنیا کے سامنے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے خلیفۂ اعظم حضرت شاہ محمد عاشق پھُلتی نے اَحوال وآثارِ شاہ ولی اللہ پر مشتمل ایک ضخیم کتاب بنام ''اَلْقَوْلُ الْجَلِی فِی ذِکرِ آثارِ الْوَلِی'' تالیف فرمائی ہے جس کا اردو ترجمہ بقلم مولانا شاہ تقی انور علوی کاکوروی منظر عام پر آچکا ہے۔اس کتاب پر نقشبندی مجدّدی عالم وشیخ طریقت مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی دہلوی (خانقاہِ شاہ ابوالخیر،چتلی قبر،دہلی۔۶) نے طویل ووقیع مقدمہ بعنوان ''حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اور کتاب اَلقَولُ الْجَلِی'' تحریر فرمایا ہے جس میں آپ نے اَلْقَوْلُ الْجَلِی سے حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے کچھ اہم ملفوظات ومکشوفات نقل کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے۔

چنانچہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی دہلوی اپنے اس مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ:

نمبر۱۲۔(از قسمِ دوم)

فرمودند:از درویشے اگر مَیلِ سلطنت ورَغبتِ حکومت سربزَند وایں رَغبت بہ اِلہامِ حق ظاہر نماید کہ برائے اِعلائے کلمۃ اللہ بودہ است،قبول نہ باید کرد وسخنِ اُورا معتبر نہ باید داشت کہ مفتونِ تَسویلِ نفس وشیطان شدہ است۔زیرا کہ وجودِ سلطنت دراولیاے ایں اُمّت بالہامِ حق وانتظامِ امرِ ملّت صورت نہ یافتہ مگر درحضرت امام مَہدی کہ درآخرِ زماں پیدا می شوند کہ قیِّمِ ایں ہردو امر بالھامِ الٰہی خواہند شد۔

وغیرِ ایشاں ہر کہ مدعی ایں معنی شود،حکم ببطلانِ او باید کرد کہ مَیلِ اُو از نفسانیت است کہ ہیچ اصل نہ دارد (ص۳۴۲)

یعنی آپ (شاہ ولی اللہ) نے فرمایا:

اگر کسی درویش سے سلطنت کی خواہش اور حکومت کی رَغبت ظاہر ہو اور وہ اس رغبت کو اِلہامِ حق کہہ کر بیان کرے کہ اللہ کے کلمہ کی سر بلندی کے واسطے ہے،قبول نہ کیا جائے۔کیوں کہ یہ ہَرَا باغ نفس وشیطان کا بنایا ہوا ہے۔

اس اُمّت میں اللہ کے اِلہام سے مِلّت کے انتظام کے لئے اولیا اللہ میں سے سِوا حضرت امام مہدی کے جو کہ آخر زمانہ میں پیدا ہوں گے،کسی اور کے لئے انتخاب اور قیام کی گنجائش نہیں ہے۔حضرت امام مہدی ان دونوں کاموں کو کریں گے۔(یعنی اِعلاے کلمۃ اللہ اور انتظامِ امرِ مِلّت)

ان کے علاوہ جو بھی اس کا دعویٰ کرے اس کی غلط کاری کا حکم کیا جائے گا۔کیوں کہ اس کا یہ فعل از راہِ نفسانیت ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

تشریح:۔حضرت شاہ ولی اللہ کا یہ کشف اور بیان بڑا اہم اور غور طلب ہے۔آپ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اولیاے حق اور اللہ کے برگزیدہ افراد میں سے اگر کوئی دعویٰ کرکے کہ مجھ کو اِلہام ہوا کہ:

''مسلمانوں کا امیر بنوں اور اسلام کی خدمت کروں۔''

تو سمجھ لو کہ اس کو اپنے کشف اور اِلہام کے سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔

یہ کام آخر دور میں حضرت امام مہدی کریں گے۔

اس مُکاشفہ میں شاہ ولی اللہ کے دو الفاظ مدارِ بحث وتدقیق ہیں:

ایک لفظ درویش ہے۔دوسرا لفظ اِلہام ہے۔

درویش،خدارسیدہ کو کہتے ہیں۔یعنی وہ نیک بندہ جس کی لَو خدا سے لگ گئی ہو۔

اور اِلہام،دل میں اچھے خیال کے آنے کو کہتے ہیں۔

اب مکتوباتِ سید احمد شہید کے مکتوب ۲۶ میں اس عبارت کو ملاحظہ کریں جو صفحہ ۱۴۸ میں ہے:

''مصلحتِ وقت چُناں اقتضا کرد کہ اِقامت ایں رُکنِ رکین اسلام بدون نَصبِ امام بہ وجہِ مشروع صورت نہ می بندد۔بناءً علیہ بہ تاریخ دوازدھم جمادی الثانیہ ۱۲۴۲ ھجری مقدس بہ اتفاق مشاہیر ساداتِ کرام وعُلماے اسلام ومشائخِ عِظام وصاحب زادگان ذَوِی الاحترام

وخوانینِ ذوی الاحتشام وجماہیر خواص وعوام از اہلِ ایمان واسلام بہ بیعتِ امامت بردستِ ایں جانب واقع گردید وبروزِ جمعہ خُطبہ بنامِ ایں جانب خواندہ شدہ۔

ہر چند ایں خاکسار ذرّہٗ بے مقدار بہ حصولِ ایں مرتبۂ مُنیف اوّلاً بہ اشاراتِ غیبی والھاماتِ لاریبی مُبشّر بود۔'' الخ

اوراس کا ترجمہ ۱۵۲ میں لکھا ہے جو یہ ہے:

''مصلحت، وقت کے مدِّ نظر یہ تھی کہ:

اس رکنِ اعظم، جہاد کا قائم رہنا، شریعت کی رو سے بغیر امام کے تقرّر کے ممکن نہ تھا۔ اس لئے ۱۲؍جمادی الثانی ۱۲۴۲ ھجری مقدس کو مشاہیرِ کرام، مشائخ عظام اور قابلِ احترام شہزادوں اور صاحبِ حشمت خوانین اور تمام خاص وعام مسلمانوں کے اتفاق رائے سے امامت کی بیعت اس عاجز کے ہاتھ پر تکمیل پائی اور جمعہ کے روز میرا نام خُطبہ میں پڑھا گیا۔

اس خاکسار ذَرّہٗ بے مقدار کو اس بلند مرتبہ کے حاصل ہونے کی بشارت، غیبی اشارے اور اِلہام کے ذریعہ جن میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، پہلے ہی دے دی گئی تھی۔''

ایسے اِلہامات واشارات کو جومَر ہونِ سلطانِ خیال ہوں، حضرت امامِ رَبَّانی مجدّدِ الفِ ثانی قُدِّسَ سِرُّہٗ (مکتوب نمبر ۲۹۱، از دَفتر اول) معلول قرار دیتے ہیں۔

کاش ''درویش'' جناب سید اوران کے رُفقاے کار حضرت شاہ ولی اللہ کے اس ارشادِ سراسر رَشاد کو پہلے ہی ملاحظہ فرمالیتے۔

شاہ ولی اللہ کی وفات کے چھیاسٹھ (۶۶) سال بعد آپ کا کشف ثابت ہوا۔'' الخ

(مقدّمہ بقلم مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجدّدی دہلوی بعنوان ''حضرت شاہ ولی اللہ اور کتاب ''اَلقولُ الجَلِی'' ص ۴۰ تا ۴۳۔ **القولُ الجَلِی ذِکرِ آثار الوَلِی**۔ تالیف شاہ محمد عاشق پھُلتی۔ ترجمہ اردو بقلم مولانا شاہ حافظ تقی انور علوی کا کوروی۔ طبع اول ۱۹۸۸ء۔ خانقاہِ کاظمیہ، کاکوری ضلع لکھنؤ۔ یوپی)

لفظ ''وھابی'' کی جگہ حکومتِ انگلشیہ سے ۱۸۸۸ء میں ''اہلِ حدیث'' نام رجسٹرڈ کرانے والے معروف غیرمقلّد عالم وصحافی مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء) شاگردِ میاں جی نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

''مفسدۂ ۱۸۵۷ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکمِ قرآن وہ مُفسِد وباغی وبدکردار تھے۔ اکثر ان میں **عَوَام کَالْاَنْعَام** تھے۔ بعض جو خواص وعُلما کہلاتے تھے وہ بھی اصل علومِ دین سے بے بہرہ یا نافہم وبے سمجھ۔ باخبر سمجھ دار عُلما اس میں ہرگز شریک نہ ہوئے اور نہ ہی اس فتویٰ پر جو اِس غدر (۱۸۵۷ء) کو جہاد بنانے کے لئے مُفسِد لیے پھرتے تھے، انھوں نے خوشی سے دستخط کیے۔

یہی وجہ تھی کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی جو حدیث وقرآن سے باخبر اوراس کے پابند تھے، اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن وعہد میں رہتے تھے) نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے۔

اس ملک سے باہر ہوکر قوم سکھ (جو مسلمانوں کے مذہب میں دست اندازی کرتے تھے۔ کسی کو اونچی اذان نہیں کہنے دیتے تھے) سے لڑے۔'' (ص ۵۰۔ **اَلْاِقتِصاد فی مَسائلِ الجِہاد**۔ مؤلّفہ محمد حسین بٹالوی۔ مطبوعہ وکٹوریہ پریس۔ لاہور)

دوسرے غیرمقلّد عالم مولانا فضلِ حسین بہاری (متوفی ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء) شاگردِ مولانا نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) لکھتے ہیں:

''حج کو جاتے وقت جو چٹھی کمشنر دہلی وغیرہ نے میاں صاحب (نذیر حسین دہلوی) کو دی تھی۔ اس کی نقل سفرِ حج کے بیان میں ھدیۂ ناظرین کی جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ:

''میاں صاحب بھی گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔''

زمانۂ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔

وہ خود فرماتے تھے کہ:

میاں! وہ ہلّڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا؟

حَشَراتُ الارض خانہ بَراندازوں نے تمام دہلی کو خراب وویران، تباہ وبرباد کردیا۔ شرائطِ اِمارت وجہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس پر دستخط نہیں کیا۔ مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے؟ مفتی صدرُالدین خاں چکر میں آگئے۔

بہادر شاہ کو بھی بہت سمجھایا کہ:
انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے۔ مگر وہ باغیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی ہو رہے تھے۔
کرتے تو کیا کرتے؟ (ص۱۹۳۔ **الحیاۃ بعد الممات** ۔ مؤلّفہ مولانا فضلِ حسین بہاری۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل۔ بٹلہ ہاؤس۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

اسی طبقہ کے منشی محمد جعفر تھانیسری (متوفی ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۵ء) لکھتے ہیں:

''چنانچہ مولوی نذیر حسین دہلوی جو ایک نامی خیر خواہ دولتِ انگلشیہ کے ہیں'' (ص ۱۹۔ تواریخ عجیب/کالا پانی۔ مؤلّفہ محمد جعفر تھانیسری۔ مطبوعہ دینی تعلیمی بورڈ۔ گلی قاسم جان۔ دہلی۔ ۱۹۶۹ء)

مولانا محمد حسین بٹالوی (متوفی ۱۹۲۰ء) شاگردِ میاں جی نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۹۰۲ء) اپنی کتاب ''**اَلْاِقتِصاد فی مَسائلِ الجہاد**'' میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں سے دنیا بھر میں کہیں بھی جہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ انھیں کے قلم سے یہ تحریری بیان ملاحظہ کیجیے جس سے از لاہور تا پٹنہ بے شمار عُلماے فرقۂ اہلِ حدیث متفق تھے۔

''۱۸۷۲ء میں ایڈیٹر اِشاعۃُ السُّنّۃ لاہور، رسالۂ **اَلْاِقتِصاد فی مَسائلِ الجہاد** تالیف کر چکا ہے۔ جس میں قرآن وحدیث وفقہی دلائل سے ثابت و مدلّل کیا ہے کہ:
اِس گورنمنٹ سے مسلمانوں کا، ہند کے ہوں خواہ روم یا عرب کے، مذھبی جہاد جائز نہیں۔
اور اسی سال پنجاب کے عام اہلِ حدیث نے بذریعہ ایک عرض داشت اپنی عقیدت واطاعتِ گورنمنٹ کا اظہار کیا جس پر گورنمنٹ کی طرف سے اس کی تائید وتصدیق میں ایک سرکلر جاری ہوا تھا۔ جو اِشاعۃ السُّنّۃ لاہور۔ نمبر ۹۔ جلد ۸ میں منقول ہو چکا ہے۔'' (ص ۲۶ جلد ۹۔ شمارہ ۱۔ رسالہ اِشاعۃُ السُّنّۃ لاہور۔ مدیر محمد حسین بٹالوی

عربی زبان کے معروف ہندوستانی ادیب اور غیر مقلّد عالم مولانا مسعود عالم ندوی (یکے از اَحبابِ مولانا ابوالحسن علی ندوی) لکھتے ہیں:

''مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ (**اَلْاِقتِصاد فی مَسائلِ الجہاد**) فارسی زبان میں تصنیف فرمایا تھا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کرائے تھے۔

معتبر اور ثِقہ راویوں کا بیان ہے کہ:
اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔''
(حاشیہ ص ۲۰۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مؤلّفہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، ابوالفضل اِنکلیو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

''کتابیات'' کے حصے میں مزید تفصیل اس طرح ہے:

''۷۔ **اَلْاِقتِصاد فی مَسائلِ الجہاد** ۔ مصنّفہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ)
اس رسالہ میں جہاد کو منسوخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء۔
اردو، انگریزی، عربی میں اس کے ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اور انگریزی اور اردو ترجمے سر چارج ایچیکسن اور سر جیمس لائل گورنرانِ پنجاب کے نام مُعَنْوَن کیے گئے۔
اس کی تالیف ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ عُلماے عصر سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اِشاعۃُ السُّنّۃ (لاہور) میں شائع کیا گیا۔ (جلد۲۔ الضمیمہ)
پھر مزید مشورہ وتحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں اس کی اِشاعت ہوئی۔ اللہ، مرحوم کی مغفرت کرے۔ اس کتاب پر انعام سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔
جماعتِ اہلِ حدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔ اور یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقہ میں وفاداری کی خُو بُو پیدا کی۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے معاصر عُلما کو سرکار کی مخالفت کے طعنے بھی دیے۔'' (ص ۱۵۴ و ۱۵۵۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ مؤلّفہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ابوالفضل اِنکلیو۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۹ء)

حامیِ تحریکِ بالاکوٹ پروفیسر محمد ایوب قادری (متوفی ۱۹۸۳ء۔ کراچی) مولانا محمد حسین بٹالوی کے رسالہ اشاعۃُ السُّنّۃ لاہور۔ جلد ۸۔ شمارہ ۹ کے ص ۲۶۲ کی یہ جماعتی تحریر نقل کرتے ہیں

''اس گروہِ اہلِ حدیث کے، خیر خواہ ووفادار رعایائے برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ:
''یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ حمایت رہنے کو، اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے

بہتر سمجھتے ہیں۔"

اوراس امر کو اپنے قومی وکیل اِشاعۃ السُّنّۃ لاہور کے ذریعہ سے جس کے نمبر۱۰ جلد۶ میں اس اَمر کا بیان ہوا ہے(اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر کر چکے ہیں۔

جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایائے گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا۔اور نہ آئندہ کسی سے ظاہر ہونے کی امید ہوسکتی ہے۔" (ص ۲۷۔مقدمۂ حیاتِ سید احمد شہید۔مطبوعہ کراچی)

چند سُطور کے بعد یہی پروفیسر محمد ایوب قادری اپنی تحقیق اِس طرح پیش کرتے ہیں:

"مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمسُ العلما شیخُ الکل میاں نذیر حسین دہلوی مُمِد ومُعاوِن بلکہ سرپرست ودَخیل رہے۔اور صادق پور(پٹنہ) کے بجائے مرکزِ قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہوگیا۔

پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ(بہار) "آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس" وجود میں آئی جس کے سب سے فعّال کارُکن مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔

"اہلِ حدیث کانفرنس" کی پالیسی بھی کم وبیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔"

(ص ۲۸۔مقدمۂ حیاتِ سید احمد شہید۔مطبوعہ کراچی)

"سلسلۂ اسمٰعیلیہ" (منسوب بہ شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی) کے ایک طبقہ (غیر مقلدینِ ہند) کا اصل سیاسی کردار خود ان کی قدیم تاریخ کے مطابق روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو چکا ہے۔کچھ ایسا ہی حال اس "سلسلۂ اسمٰعیلیہ" کے دوسرے طبقہ (علماے دیوبند) کا بھی ہے۔یہ طبقہ معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کرتا رہتا ہے جس کی اصل حقیقت اسی طبقہ کی قدیم تاریخ (تذکرۃُ الرشید مؤلّفہ مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی وسوانحِ قاسمی مؤلّفہ مولانا مناظر اَحسن گیلانی) کے مطابق عُلماے سہارن پور کا معرکۂ شاملی ۱۸۵۷ء سے دور کا بھی کوئی واسطہ اور کوئی تعلق نہیں۔

اور حافظ ضامن کی شہادت اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے زخمی ہونے کا واقعہ اس ٹولی کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں رُونما ہوا جو نہ انگریزی حکومت کی موافق تھی نہ مخالف۔بلکہ حالات کی اَبتری کا فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کرنے والے کچھ لُٹیروں کی یہ ٹولی تھی۔جیسا کہ شیخ

محمد اِکرام اور ابوسلمان شاہ جہاں پوری جو دیوبندی طبقہ کے معروف مؤرخ ہیں،انھوں نے صراحت ووضاحت کے ساتھ اس تاریخی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔مزید تفصیل وتحقیق کے لئے راقمِ سُطور کی مندرجہ ذیل کتب ورسائل کی متعلقہ تحریں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ۱۸۵۷ء پس منظر وپیش منظر (۲) ممتاز عُلما انقلاب ۱۸۵۷ء۔طبعِ دوم (۳) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی نمبر۔ماہنامہ اشرفیہ،مبارک پور۔ضلع اعظم گڑھ۔یوپی۔۲۰۱۲ء۔

مدرسہ دیوبند کے سلسلے میں بے بنیاد اور بالکل غلط طور پر یہ پروپگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اسے بڑی منصوبہ بندی اور زبردست پلاننگ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔انگریزی حکومت کے خلاف تربیتی کیمپ اور بہت بڑے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے اس کی بنیاد رکھی گئی۔وغیرہ وغیرہ۔تقسیمِ ہند(۱۹۴۷ء) کے بعد بڑے زوروشور سے اس فرضی تاریخ کی تشہیر کی گئی۔جس کا سلسلہ روزافزوں ہے۔

حالاں کہ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ جس طرح کسی بھی گاؤں قصبہ میں کوئی مکتب ومدرسہ وہاں کے بڑے بوڑھے قائم کرتے ہیں،اسی طرح مدرسہ دیوبند بھی حاجی عابد حسین قادری چشتی (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء) نے اپنے بعض رُفقا کے تعاون سے ۱۸۶۶ء میں بالکل مقامی سطح کے ایک مدرسہ کی شکل میں قائم کیا اور برسہا برس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی اس سے باضابطہ وابستہ ہوئے اور اپنی محنت وتوجہ سے اسے کافی ترقی دی۔

مدرسہ عربی وفارسی دیوبند(قائم شدہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) معروف بہ دارُالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) ولد مولانا مملوک علی نانوتوی (متوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اور مدرسہ دیوبند کے مدرسین کی اکثریت حسبِ روایتِ مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ضلع سہارن پور:

"ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنمنٹ کے قدیم ملازم اور حال پینشنر تھے۔جن کے بارے میں گورنمنٹ کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔"

(ص ۲۴۷۔حاشیۂ سوانحِ قاسمی جلدِ دوم۔مؤلّفہ مولانا مناظر اَحسن گیلانی۔مطبوعہ دارُالعلوم دیوبند)

مدرسہ دیوبند کے مُجوّز ومُحرّک وبانی حاجی سید عابد حسین قادری چشتی (متوفی ۱۳۳۱ھ/

۱۹۱۳ء) کو اپنے قائم کردہ مدرسہ عربی و فارسی دیوبند (جو بعد میں دارُالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا) سے بے دخل کیے جانے کے اَسباب وعَوامل کی نشان دِہی کرتے ہوئے حاجی عابد صاحب کے خانوادہ کے ایک فرد مولانا نذیر احمد دیوبندی لکھتے ہیں:

''چوں کہ لوگوں کے دلوں میں خلوص نہیں رہا اس لئے اختلاف رُونما ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت وہ آیا کہ آپ (حاجی عابد حسین) مدرسہ کے کاروبار سے الگ ہوگئے اور فرمایا کہ:

''اب للّٰہیت نہ رہی بلکہ نفسانیت آ گئی۔ فقیر کو اِن سب باتوں سے کیا غرض؟

(ص ۷۶۔ تذکرۃُ العابدین۔ از مولانا نذیر احمد دیوبندی)

اور اسی خانوادۂ عابدی کے دوسرے فرد سید افتخار حسین لکھتے ہیں کہ:

''وہ نفسانیت اس کے سِوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ:

وہ (سید عابد حسین) اس مدرسے کے ذریعہ اسلام کی حقّانیت وصداقت کی نَشر واِشاعت کا جو اَہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے، اس ادارہ کے دوسرے اراکین اس سے متفق نہیں تھے۔ ان حضرات کا نقطۂ نظر بالکل جُدا گانہ تھا۔

''وہ اس مدرسہ کو انگریزی حکومت کی رضا و منشا کے مطابق چلانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ مدرسہ کے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب حکومتِ وقت کے زبردست بہی خواہ تھے۔''

مدرسہ کی صدر مدرسی قبول کرنے سے قبل وہ کئی شہروں میں انگریز گورنمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کے فرائض انجام دے کر اپنے حُسنِ کارکردگی سے انگریزوں کی نظر میں محبوب بن چکے تھے۔

اپنے اس کامیاب تجربہ کی روشنی میں اس مدرسہ کو اس رَوِش پر لے جانا چاہتے تھے جو انگریز حکومت کے عین منشا کے مطابق تھا۔ اس لئے ان کے خیالات کا حاجی محمد عابد حسین کے خیالات سے متصادِم ہونا ناگزیر تھا۔''

(ص ۶۱۔ دارُالعلوم دیوبند کا بانی کون؟ از سید افتخار حسین۔ دیوبند)

سید افتخار حسین کے خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ:

لفٹِیننٹ گورنر ممالکِ متحدہ اَوَدھ وآگرہ کے نمائندہ مسٹر پامر نے ۳۱؍جنوری ۱۸۷۵ء کے اپنے دورَۂ مدرسہ دیوبند کی رپورٹ میں لکھا:

''جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صَرفہ سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں

میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپے ماہانہ پر کر رہا ہے۔

یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ مُمِد ومُعاونِ سرکار ہے۔''

(ص ۲۱۷۔ سوانحِ مولانا محمد احسن نانوتوی مؤلّفہ پروفیسر محمد ایوب قادری۔ مطبوعہ کراچی)

دورے اور معاینۂ مدرسہ کی ستائش اور اس پر فخر اس طرح ذمّہ داران مدرسہ کرتے رہے ہیں:

''تمام اندرونی وبیرونی صدمات وحوادث کے بعد جو نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی کامیابی وشہرت مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ سرجان لاٹوش لفٹیننٹ گورنر ممالکِ متحدہ اَوَدھ وآگرہ کا بغرضِ خاص معاینہ مدرسہ دیوبند آنا تھا۔''

(ص ۷۔ رودادِ مدرسہ دیوبند ۱۳۲۲ھ)

قاری محمد طیب مہتممِ دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کے والد حافظ محمد احمد مہتممِ دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء) فرزندِ مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کی انگریز نوازی سے مؤرخین بخوبی واقف ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) کی وجہِ اِخراج بھی سیاسی چپقلش تھی۔ چنانچہ:

.........بعض مسائلِ دینیہ مختلفہ فیھا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل وتکفیر پر آمادہ کیا گیا۔ اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی کو دارُالعلوم سے الگ کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ آپ نے مولانا سندھی سے معافی مانگی۔

بہر حال! اصلی سبب وہ اَمر ہے جس کی بنا پر مسٹر مسٹین گورنر۔ یوپی، دیوبند اور دارُالعلوم گیا تھا۔ اور مہتمم صاحب (حافظ محمد احمد) کو ''شمسُ العُلماء'' کا خطاب ملا تھا۔''

(حاشیہ ص ۲۹۹۔ نقشِ حیات، حصہ دوم۔ مؤلّفہ مولانا حسین احمد مدنی۔ مطبوعہ مکتبہ دینیہ دیوبند۔ ۱۹۹۹ء)

یکم محرمُ الحرام ۱۳۶۵ھ/دسمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا شَبیر احمد عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) سابق صدر مہتمم دارُالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ العلماء اسلام کے مکان (بیتُ الفضل، دیوبند) پر کچھ سَر برآوردہ اور سَرگرم عُلماے دیوبند کی ایک اہم میٹنگ ہوئی جس کا ایجنڈہ تھا:

''عُلماے دیوبند کے درمیان پیداشدہ سیاسی اختلافِ رائے کا حل۔''

اس مِٹنگ میں مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ شریک تھے۔ مولانا طاہر احمد قاسمی برادرِ مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مِٹنگ کی ضروری تفصیلات ۱۹۴۶ء میں ہی ''مکالمۃ الصَّدْرَین'' کے نام سے شائع کردی تھی۔ دہلی، دیوبند، لاہور سے اس کی متعدّد اشاعتیں ہوچکی ہیں۔ اس مِٹنگ میں ہونے والی گفتگو کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''دیکھیے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلّم بزرگ وپیشوا تھے۔ ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ:

''ان کو چھ سو روپے ماہوار حکومت کی جانب سے دیے جاتے تھے۔''

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شُبہ بھی نہیں گذرتا تھا۔'' (ص ۱۶۔ مکالمۃ الصَّدْرَین۔ مرتّبہ طاہر احمد قاسمی۔ مطبوعہ لاہور)

مندرجہ ذیل اِقتباس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی قائم کردہ جمعیۃ العلماء اسلام کا ذکر ہے۔ جمعیۃ العُلماء ہند کی کانگریس نوازی کے خلاف ۱۹۴۵ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیۃ العلماء اسلام قائم کی تھی۔ اِقتباس یہ ہے:

''کلکتہ میں جمعیۃ العلماء اسلام، حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی۔

مولانا آزاد سبحانی جمعیۃ العلماء اسلام کے سلسلے میں دہلی آئے اور حکیم دِلبر حسن کے یہاں قیام کیا۔ جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ: وہ سرکاری آدمی ہیں۔

مولانا آزاد سبحانی اسی قیام کے دوران پولیٹکل ڈِپارٹمنٹ، گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدہ دار سے ملے جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتایا گیا۔

مولانا آزاد سبحانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ: ہم جمعیۃ العلماء ہند کے اِقتدار کو توڑنے کے لئے عُلما کی ایک جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی اِمداد اِس مقصد کے لئے دے گی۔

چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لئے منظور کرلی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالے بھی کردی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع ہوا۔'' (ص ۱۲۔ مکالمۃ الصَّدْرَین۔ مؤلّفہ طاہر احمد قاسمی۔ مطبوعہ لاہور)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب (متوفی ۱۹۴۳ء) کے بارے میں مکالمۃ الصَّدْرَین کا حوالہ گذر چکا کہ بقولِ بعض انھیں چھ سو روپے بذریعہ حاجی رشید احمد ملتے تھے۔

مولانا تھانوی کے کچھ خیالات وحالات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

''چوں کہ قدیم سے مذہب اور قانون جملہ مسیحی لوگوں کا یہ ہے کہ:

کسی مِلّت ومذہب سے پرخاش اور مخالفت نہیں کرتے اور نہ کسی کی مذہبی آزادی میں دست اندازی کرتے ہیں۔ اور اپنی رعایا کو ہر طرح سے امن وامان میں رکھتے ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں جو مملوکہ ومقبوضہ اہلِ مسیح ہے، رہنا اور ان کا رعیت بننا درست ہے۔'' (ص ۳۲۴۔ اوراقِ گم گشتہ۔ مؤلّفہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ مطبوعہ لاہور۔ ۱۹۶۸ء)

مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ۱۹۴۳ء) کے ایک بھائی مظہر علی تھانوی (متوفی ۱۹۵۰ء) کے پیشۂ مُخبری وجاسوسی کا ذکر عُلماے دیوبند کی تحریروں میں اِس طرح آتا ہے:

''یعنی (۱) مسٹر سین (۲) مسٹر تصدُّق حسین ہاپوڑی (۳) مظہر علی تھانوی۔ یہ تینوں افسر یوپی میں کام کرتے تھے۔

حضرت شیخُ الھند اور ان کے مشن آزادی کے متعلق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام لیا۔

مسٹر سین انگریز تھا۔ یوپی سی آئی ڈی کا افسرِ اعلیٰ تھا مگر مہذب، قانون کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی۔ لیکن تصدُّق حسین اور مظہر علی نہایت ظالم وجابر تھے۔ ان میں انسانیت اور تہذیب نام کو نہیں تھی۔''

(حاشیہ ص ۲۸۸۔ نقشِ حیات، حصہ دوم۔ مؤلّفہ مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ دیوبند۔ ۱۹۹۹ء)

مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

''مولانا (تھانوی) مرحوم کے بھائی محکمۂ سی آئی ڈی میں بڑے عہدہ دار تھے۔ ان کا نام مظہر علی ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہو، مُستبعد نہیں۔'' (دیکھیے مع تفصیل۔ از ص ۲۹۷ تا ص

۲۹۹۔مکتوباتِ شیخ الاسلام۔جلددوم)

مشہوردیوبندی عالم وسربراہِ جمعیۃ العُلماءِ اسلام صوبہ سندھ مولانا محمد شاہ امروٹی فرزندِ مولانا تاج محمود امروٹی اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب کہ ستمبر ۱۹۸۷ء میں کامران کلینک میں زیر علاج تھے۔ان سے کئی صحافی انٹرویو لے رہے تھے جن میں انجم لاشاری بھی تھے۔

انٹرویو کے وقت جمعیۃ العلماء اسلام سندھ کے سکریٹری جنرل قاری شیر افضل ،مرکزی آرگنائزیشن سکریٹری مولانا عبدالرَّزّاق عزیز،مولانا جاوید نعمانی وغیرہ اورکئی صحافی موجود تھے۔

اس اہم انٹرویو میں مولانا محمد شاہ اَمروٹی (سندھ) کا حیرت انگیز انکشاف بقلم انجم لاشاری اس طرح ہے:

''ابتدا میں مولانا محمد شاہ اَمروٹی نے ''ریشمی رومال'' کا راز اِفشا کرنے والے لوگوں کے نام بتانے سے گریز کیا۔اورصرف اتنا کہا کہ:وہ ہمارے بزرگ ہی تھے۔''

مگر صحافیوں کے اِصرار پرآخرانھوں نے یہ راز اِفشا کرہی دیا اوران بزرگوں کے نام بھی بتادیے۔''

''اپنے انٹرویو میں مولانا محمد شاہ امروٹی نے دل گرفتہ ہوکر بتایا کہ:

''انگریزوں کو''ریشمی رومال'' کے اس سفرکی اطلاعات لمحہ بہ لمحہ مل رہی تھی۔اور یہ لنکا گھر کے ایک بھیدی ہی نے ڈھائی تھی۔اور یہ تھے:مولانا اشرف علی تھانوی۔

مولانا محمد شاہ اَمروٹی کے بقول مولانا تھانوی کہتے تھے کہ:

''انگریزوں کے خلاف کچھ نہ کیا جائے۔بلکہ ان کی سرپرستی میں رَہ کر مسلمانوں کے لئے فوائد حاصل کیے جائیں۔''

وہ چوں کہ دارُالعلوم (دیوبند) کے اکابرین میں سے تھے اس لئے انھیں ''تحریکِ خلافت'' اور''جُنُودِ رَبّانیہ'' کے تمام پروگراموں سے آگاہی رہتی تھی۔

انھوں نے''ریشمی رومال'' کی حقیقت اورانقلابی کارروائیوں کے لئے طے کردہ تاریخ سے اپنے گھر والوں کوآگاہ کردیا اوران کے بھائی نے جو اِنٹلی جنس کے ایک اعلیٰ افسر تھے،پورے قصے سے(انگریز)انتظامیہ کوخبردار کردیا۔

مولانا محمد شاہ اَمروٹی کوپیری اورضعف کے سبب مولانا اشرف علی تھانوی کے اس بھائی کا

نام یادنہیں رہا تھا اس لئے ہم نے مولانا اِرشادالحق تھانوی سے ٹیلی فون پررابطہ کیا اورمولانا اشرف علی تھانوی کے برادران کے بارے میں معلومات چاہیں۔جس پرانھوں نے بتایا کہ:

مولانا تھانوی کے صرف ایک بھائی تھے جن کا نام مظہرعلی تھا اور وہ ہند میں برطانوی سرکار کے ایک اعلیٰ عہدہ پرفائز تھے۔یعنی سی آئی ڈی کے افسرِ اعلیٰ تھے۔

مظہرعلی تھانوی نے تقسیمِ ہند سے پہلے ہی رِٹائرمنٹ لے لی تھی اورحج پر چلے گئے تھے۔ جہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں انتقال کرگئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی اورمظہرعلی کی مائیں الگ الگ تھیں۔مظہرعلی کی والدہ کے بطن سے ایک بیٹی تھی جن کی شادی مولانا ظہورُالحق تھانوی سے ہوئی۔اوران کے بطن سے مولانا ارشادُ الحق تھانوی اورمولانا احتشامُ الحق تھانوی پیدا ہوئے۔''(ماہنامہ ''شوٹائم'' کراچی۔شمارہ ۸/اپریل ۱۹۸۸ء)

پروفیسر محمد سرورجامعی لکھتے ہیں:

''مولانا (عُبید اللہ) سندھی،مولانا اشرف علی تھانوی کے علم وفضل اور اِرشادوسلوک میں جواُنھیں بلند مقام حاصل ہے،اس کے تو قائل تھے۔لیکن تحریکِ آزادیِ ہند کے بارے میں ان کی جومُعاندانہ اورانگریزی حکومت کے حق میں جومُؤیِّدانہ مستقل رَوِش رہی،اس سے وہ سخت خفا تھے۔''

(ص ۳۸۲۔اِفادات وملفوظاتِ مولانا سِندھی۔مؤلّفہ پروفیسر محمد سرورجامعی۔سندھ ساگر اکیڈمی،لاہور)

بہرحال! آمدم برسرِ مطلب:۔مولانا محمد علی جوہر اورمولانا شوکت علی نے بریلی پہنچ کر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی(وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے ملاقات کرکے تحریکِ خلافت اوربِالخصوص تحریکِ تَرکِ موالات کے سلسلے میں گفتگو کی تھی۔

ڈاکٹر ایچ ،بی،خان کہتے ہیں کہ علی برادران نے مولانا احمد رضا بریلوی سے ملاقات کرکے تَرکِ موالات کی تائید میں ان سے فتویٰ حاصل کرنا چاہا تھا۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شوکت علی اورمولانا محمد علی بذاتِ خود مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے پاس اس فتویٰ پردستخط کرانے کے لئے گئے تو مولوی احمد رضا خاں نے کہا کہ:

''ہماری سیاست مختلف ہے ۔وہ یہ ہے کہ آپ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے حامی اور مؤیّد ہیں، جب کہ میں اس کے خلاف ہوں ۔مگر آزادی کے خلاف نہیں ہوں ۔''

اسی زمانے میں مولانا عبدالباری کے کچھ بیانات پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے شرعی اعتراضات کیے اور کہا کہ مولانا عبدالباری کے یہ بیانات اور یہ اعمال گناہ ہیں۔

مولانا عبدالباری نے مولوی احمد رضا خاں بریلوی کی ہدایت اور اعتراضات کی بنا پر ایک توبہ نامہ شائع کیا جسے اخبار ''علی گڑھ گزٹ'' نے حسبِ تفصیلِ بالا ۲۴؍جون ۱۹۲۱ء کو شائع کیا تھا۔'' علی گڑھ گزٹ ۔۲۴؍جولائی ۱۹۲۱ء۔

(ص ۱۰۲۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا کردار۔ از ڈاکٹر ایچ ،بی ، خان۔قومی اِدارہ برائے تحقیقِ تاریخ وثقافت۔اسلام آباد، پاکستان۔۱۹۸۵ء)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی و مولانا امین اَحسن اصلاحی کے شاگرد مولانا کوثر نیازی، (ولادت ۱۹۳۴ء وفات ۱۹۹۴ء) سابق وزیر مذہبی امور حکومتِ پاکستان اس وقت کی تحریکات ونظریات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تحریکِ خلافت ، تحریکِ تَرکِ موالات ، تحریکِ ہجرت اور ایک بحث کہ ہندوستان دارُالاسلام ہے یا دارُالحرب؟

ان سارے موضوعات پر امام احمد رضا کا جو نقطۂ نظر تھا، ہر چند کہ اس پر گرد اُڑائی جاتی ہے لیکن علمی سیاست کے تقاضوں سے جس قدر ہم آہنگ اور دینی اَقدار کی ترجمانی سے جس قدر نزدیک اور حقیقت پر مبنی ان کا مَوقف ہے ، کسی اور کا نہیں۔'' (ص:۳۷،سال نامہ معارفِ رضا، کراچی ۔۱۹۹۰ء)

❑❑❑

تحریکِ ہجرت اور انجامِ ہجرت

ہندوستان میں رہ کر اسلام اور مسلمانوں کو جن خطرات سے مقابلہ کرنا تھا وہ سب اور ان کا سِلسلہ تو جاری ہی تھا کہ اسی دوران خلافتی وموالاتی لیڈروں نے نہ جانے کیا سوچ کر ہجرت کا بھی نعرہ بلند کر دیا تھا جو یقیناً ایک غیر عالمانہ وغیر عاقلانہ اِقدام یا بعض مسلم مخالف عناصر کی ایک شاطرانہ سیاسی سازش ہی تھی جس کے شکار ہندوستانی مسلم لیڈر ہوئے اور ان کی بے اصولی وعاقبت نااندیشی کے ہزاروں لاکھوں مسلمان بھی شکار ہوگئے۔

بانیِ مرکزی تحریک خلافت حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی جنوری ۱۹۲۶ء) نے خلافت وامامت کے سلسلے میں ۲۶؍شوال ۱۳۳۹ھ کو جلیلُ القدر عالمِ دین وشیخ طریقت حضرت سید مہر علی چشتی گولڑوی (وصال ۲۹؍صفر ۱۳۵۶ھ/۱۱؍مئی ۱۹۳۷ء) تلمیذِ مولانا لطفُ اللہ علی گڑھی ومولانا احمد علی محدّث سہارن پوری وخلیفۂ خواجہ شمس الدین سیالوی سے ایک اِستفتا کیا تھا۔ جس کے جواب میں آپ نے لکھا کہ:

............''خلاصہ یہ کہ موجودہ زمانے میں عُلما کی کارروائی نہ خلافت ہے نہ اِمامت۔'' الخ (ص:۴۵۱۔ مہرِ منیر۔ مؤلّفہ مولانا فیض احمد، مطبوعہ پاک وہند)

حضرت سید مہر علی شاہ گولڑوی کے بارے میں مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری لکھتے ہیں:

''جب تحریکِ خلافت اُٹھی تو آپ نے کسی کی پروا کیے بغیر شرعی نقطۂ نظر کو وضاحت سے پیش کیا۔

تُرکوں کو خلافت اسلامیہ کا درجہ نہیں دیتے تھے تاہم آپ کی تمام ہمدردی تُرکوں کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ طرابلس و بلقان کی جنگ (۱۲۔۱۹۱۱ء) کے موقع پر گھر کے زیورات اور اصطبل کے گھوڑے تک فروخت کر کے قیمت چندہ میں دے دی تھی۔

تحریکِ ھجرت کے بارے میں فرمایا کہ:

''اس غیر شرعی ھجرت کا نتیجہ خراب نکلے گا۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''

(ص ۵۴۱۔ تذکرۂ اکابر اہلِ سُنّت پاکستان۔ مؤلّفہ محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔ طبع دوم ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء)

سندھ میں مجدّدی سلسلے کے عظیم شیخ طریقت حضرت سید خواجہ محمد حسن جان فاروقی مجدّدی (وصال ۲رجب ۱۳۶۵ھ/۲جون ۱۹۴۶ء) جنھوں نے تحریکِ خلافت کا نہایت گراں قدر مالی تعاون کیا تھا کہ بقول آپ کے صاحبزادۂ محترم حضرت سید ھاشم جان فاروقی مجدّدی (وصال ۲۲رمضان ۱۳۹۵ھ/۲۸ستمبر ۱۹۷۵ء) تلمیذ مولانا معین الدین اجمیری و حکیم سید برکات احمد ٹونکی و مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی و مولانا سید امیر علوی اجمیری:

''جب تحریکِ خلافت شروع ہوئی تو اُس وقت مولانا محمد علی جوہر کی ھدایت پر سندھ میں اہلِ ثروت سے چندہ جمع کرنے کے لئے حاجی عبداللہ ھارون کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے افراد، حاجی صاحب خود، حکیم فتح محمد، اور مولانا محمد صادق صاحب وغیرہ میرے والد ماجد محمد حسن جان سرہندی کی خدمت میں پہنچے اور اپنا مقصد بیان کیا۔

والدِ محترم نے فرمایا کہ:

''خلافتِ اسلامیہ کے اِحیا اور انگریز حکومت سے مسلمان ممالک کی آزادی کے لئے ضرورت جس بات کی ہے وہ جسمانی جہاد کی ہے۔ مالی جہاد جسمانی جہاد سے فروتر ہے۔''

اس کے بعد فرمایا کہ:

''میں گھر جا کر دیکھتا ہوں۔ گھر میں جو رقم ہوگی وہ لا کر پیش کردوں گا۔''

اس وقت کاغذ کے نوٹ نہیں تھے۔ اشرفیوں کی صورت میں روپیہ جمع رہتا تھا۔ چنانچہ والدِ محترم بھری ہوئی تھیلیاں اُٹھوا کر لائے۔ کمیٹی کے ممبروں کے حوالے کردیں اور فرمایا:

''گھر میں دس ہزار روپے سے کچھ زائد تھے۔ وہ سب آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔''

انھوں نے ایک آنہ بھی گھر میں نہیں چھوڑا تھا۔ اور پورے برِصغیر میں یہ مالی قربانی کی اس طرح کی پہلی مثال تھی جو والدِ محترم نے پیش کی ہے۔'' (ہفت روزہ ادا کار، لاہور۔ مارچ ۱۹۷۵ء)

خواجہ محمد حسن جان مجدّدی نے جنگِ طرابلس و بلقان (۱۲۔۱۹۱۱ء) کے موقع پر بھی اپنے مُریدین و مُعتقدین و مخلصین اور سندھ کے مسلمانوں سے مالی تعاون حاصل کر کے اور خطیر رقم جمع کر کے مجاھدین کے لئے بھجوائی تھی۔

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کی بے اصولی و بے اعتدالی دیکھ سن کر حضرت خواجہ محمد حسن جان مجدّدی کو بے حد افسوس ہوا یہاں تک کہ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر آپ نے ان تحریکات میں کسی بھی طرح کا تعاون کرنے سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ چنانچہ آپ کے تذکرہ میں مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری تحریر فرماتے ہیں:

''تحریکِ خلافت میں گم کردۂ راہ لیڈروں کی کج رَوِی پر بہت افسوس کیا کرتے تھے۔ آپ نے کھل کر بعض مسائل میں شرعی نقطۂ نظر سے (تحریک کی بے اعتدالی سے) اختلاف کیا اور طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر اپنے موقف کو واضح طور پر پیش کیا۔

آپ گاندھی کی قیادت کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ:

''ان لوگوں پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف مُشرکین ہنود سے اتحاد اور وداد کے حامی ہیں۔ جو انگریزوں سے بھی زیادہ دشمنِ اسلام ہیں۔

اسی طرح جب لیڈروں نے ہندوؤں کے فریب میں آکر سادہ لوح مسلمانوں کو انگریز کے مقبوضہ علاقوں سے ھجرت کر کے افغانستان چلے جانے کا مشورہ دیا اور لوگ جوق در جوق تَرکِ وطن کرنے لگے تو اس موقع پر بھی آپ نے قوم کی صحیح رہنمائی کی اور تَرکِ وطن سے ممانعت کی۔ اور فرمایا:

''وہاں اتنی گنجائش کہاں ہے کہ سب لوگ سَما سکیں؟

خواہ مخواہ خود بھی پریشان ہوں گے اور مسلمانوں کے بادشاہ کو بھی تکلیف دیں گے۔
اس سے مسلمانوں کے دشمنوں کو خوشی ہوگی۔"

تاریخ شاہد ہے کہ ترکِ وطن کر کے جانے والوں کا جو حال ہوا وہ کسی طرح بھی قابل اطمینان نہ تھا۔"

(ص ۴۴۷ و ۴۴۸۔ تذکرۂ اکابر اہلِ سُنّت پاکستان۔ مؤلّفہ محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ مکتبہ قادریہ، جامعہ نظامیہ رضویہ۔ لاہور۔ طبع دوم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کی "اپنی امامت" اور "مسلمانوں کی ہجرت" کے پسِ پردہ کار فرما ایک نہایت حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے تحریکِ خلافت کے سرگرم کارکن قاضی محمد عدیل عباسی تحریر کرتے ہیں کہ:

............ہجرت کا ایک فتویٰ مولانا (ابوالکلام آزاد) نے اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ضرور نشر کر دیا جس میں مسلمانانِ ہند کو یہاں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ادنیٰ تعمّق سے معلوم ہوگا کہ ہجرت اور ترکِ موالات میں قُطْبَین کا فاصلہ ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے اس ملک کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلے جانا۔ اور ترکِ موالات تو وہ کرے گا جس کا عزمِ راسخ یہاں رہنے کا ہو۔

لیکن مولانا آزاد کا جو فتویٰ مجلّہ "اہلِ حدیث" امرتسر کی ۲۰ر جولائی **۱۹۲۰** کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اس میں مولانا نے ان دونوں میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔ (یہ فتویٰ جنوری ۱۹۲۰ء سے جولائی ۱۹۲۰ء کے مابین کا ہے)

اس سے پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ مولانا نے کلکتہ کانفرنس کے بعد فروری ۱۹۲۰ء میں اپنے آپ کو "**اِمامُ الهند**" بنانے اور اس طرح مذہب کے راستہ سے مسلمانوں کو سیاست میں داخل کرنے کا پروگرام بنایا تھا جو انھوں نے کوششِ بلیغ اور رقمِ کثیر صَرف کرنے کے بعد ستمبر **۱۹۲۰ء** میں ختم کر دیا۔ تو اس زمانہ میں تحریکِ ہجرت کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

بہر حال! اب مولانا کے فتویٰ اور ترکِ موالات سے اس کی تطبیق پر نظر ڈالی جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"تمام دلائلِ شرعیہ، حالاتِ حاضرہ، مَصالحِ مُہمّہٗ اُمّت اور مُقتضیات ومَصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اِعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ:

مسلمانانِ ہند کے لئے بجز ہجرت کوئی چارۂ شرعی نہیں ہے۔ اُن تمام مسلمانوں کے لئے جو اِس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اِسلامی عمل انجام دینا چاہیں، ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔"

وجوبِ (ہجرت) کے بعد مولانا نے ایک اِستثنا کا ذکر کیا ہے:

"البتّہ جن لوگوں کی نسبت ظنِّ غالب ہو کہ جدوجہد اور کلمۂ حق کے اعلان و تذکیر کے لئے ان کا قیام ہندوستان میں بمقابلۂ ہجرت زیادہ ضروری ہے۔ یا جو لوگ دیگر عُذراتِ مقبولۂ شرع کی بنا پر ہجرت نہ کر سکیں۔ یا ایک اتنی بڑی وسیع آبادی کی نقل و حرکت میں قدرتی طور پر جو تاخیر ہونی چاہیے، اس کی وجہ سے تاخیر ہو تو بلاشبہ وہ لوگ ٹھہر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی تمام قوتیں اِتباعِ شرع کے لئے وقف کر دینی چاہیے۔"

"گزشتہ فروری کے جلسۂ دہلی سے لے کر ۱۱راپریل کے جلسۂ خلافت کمیٹی بمبئی تک "نان کوآپریشن" کو منظور و مقبول بنانے کی جس قدر کوششیں کیں حتیٰ کہ وہ منظور کر لیا گیا، اس کی بِنا یہی تھی۔"

یعنی "نہ تو ہندوستان سے تمام لوگ بیک وقت ہجرت کر سکتے ہیں اور نہ شرعاً مطلوب ہے۔" ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا اور ہندوستان میں اسلامی آبادی بھی باقی رہے گی۔

پس جو لوگ ہندوستان میں ہیں، شرعاً ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اسلام کے فریقِ مُحارِب سے کسی طرح کا علاقہ، محبت و الفت یا اِعانت و خدمت کا رَکھیں۔ جو شخص رکھے گا وہ حَسبِ نَصِ قرآنی اسلام کا دشمن منسوب ہوگا۔ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ۔

یہ تھی تطبیق کی شکل

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کا فیصلہ کیسے ہو کہ کون ہجرت کرے اور کون رہ جائے؟ تو اس کے لئے مولانا نے حسبِ ذیل شکل پیش کی:

"اس بات کا فیصلہ کرنا صاحبِ جماعت کا کام ہے کہ کس شخص کو فوراً ہجرت کرنا چاہیے

اورکس شخص کی اِستعداد ایسی ہے کہ اس کا قیام اندرونی خدمات کے لئے مطلوب ومفید ہے ؟ نیز ہجرت کی جائے تو کس مقام پر اور کن حالات میں کہ موجبِ ثمرات وبرکات ہو؟ ہر شخص بطورِ خود اِن اُمور کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔

اعمالِ ہجرت کا جو نمونہ اسوۂ نبوت نے ہمارے لئے چھوڑا ہے، وہ یہ ہے کہ:

''ہجرت سے مقدّم ہجرت کی بیعت ہے۔بغیر بیعت ہجرت نہیں کرنی چاہیے۔جو لوگ ہجرت کریں، پہلے، ہجرت پر بیعت کرلیں۔''

یہاں وہ بات سمجھ میں آسکتی ہے جو پہلے سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ تحریکِ امامت اور تحریکِ ہجرت دونوں کا تضاد کیسے دفع ہو؟

مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوگیا کہ تحریکِ ہجرت تحریکِ اِمامت کی کتاب کا ایک باب ہے۔

آخر میں مولانا ادّعا و تحکّم کی تمام اَہلیتیں سمیٹ کر فرماتے ہیں:

''یہ میری رائے ہے۔میری بصیرت ہے۔میرا یقین ہے۔میرا ایمان ہے۔نہ کہ کوئی قیاس ورائے اور ''پولیٹکل حکمتِ عملی۔''

تمام یورپ، اسلامی حکومت سے نکل چکا۔ بغداد وشام جاچکے۔لیکن ایمان باقی ہے۔ہم کو اب قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں کرنا ہے۔بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے۔اور مقصود بقائے ملک نہیں بلکہ صرف بقائے ایمان ہے۔.....................

میں نے آخری فیصلہ کرلیا ہے۔جس طالبِ حق کو مجھ پر اعتماد ہو، اللہ کی راہ میں میرا ساتھ دے۔.............

بالفعل طریقِ عمل یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو اللہ توفیقِ عمل دے وہ فوراً مجھے اپنے عزم سے مطلع کریں۔یا حسب ذیل اَصحاب سے مل کر تفصیلی ھدایات حاصل کریں:

(۱) مولوی عبدالقادر وکیل قصور (ضلع لاہور) (۲) مولوی محی الدین بی اے قصور (ضلع لاہور) (۳) مولانا محمد داؤد غزنوی (۴) مولوی عبدالرزّاق ملیح آبادی، ایڈیٹر، اَلْبَیَان۔لکھنؤ۔

اس طرح بیعتِ ہجرت بالواسطہ بیعتِ امامت تھی۔اور دونوں تحریکیں مولانا ایک

ساتھ چلا رہے تھے۔مولانا کو اپنی ذات کی اہلیت پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اہلُ الرائے سے مشورہ کی ضرورت نہیں سمجھی اور براہِ راست قوم سے بیعت لینا چاہتے تھے۔بلکہ امامت کے لئے بیعت لینے کی تو مُہم چلا رکھی تھی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری نے دیا تھا۔(لیکن) اس فتویٰ کی تمام تر ذِمّہ داری مولانا ابوالکلام آزاد پر ہے۔

غلام رسول مہر نے مجھ سے کہا کہ:

پنجاب، سندھ اور سَرحد پر مولانا کا اثر رانچی (بہار) کی نظر بندی سے پہلے اتنا گہرا تھا کہ جب وہ لاہور جاتے تھے تو ایک لاکھ آدمی دور ودراز سے جمع ہوتے تھے اور اتنی گرم جوشی سے نعرے بلند کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ جائے گا۔

سِندھ پر مولانا کا اثر ان کے خط مؤرخہ ۲۰ رستمبر ۱۹۲۰ء سے بھی ظاہر ہے، جو انھوں نے مولوی عبدالرزّاق ملیح آبادی کو بہ سلسلۂ امامت لکھا تھا اور جو اس سے پہلے نقل کیا جاچکا ہے۔

سِندھ کے مُلّاؤں نے غالباً اسی اثر کے تحت ہجرت پر زور دیا اور چل پڑے۔''

(ص ۱۳۲ تا ۱۳۴۔تحریکِ خلافت۔مؤلّفہ قاضی محمد عدیل عباسی۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، حکومتِ ہند۔آر، کے، پورم، نئی دہلی 110066۔طبع دوم ۱۹۹۷ء)

''انگریز کو افغانستان کی جغرافیائی پوزیشن، اس کی حالت، جگہ، اور سواری کی قِلّت، خوب معلوم تھی۔جس طرح اس نے انقلابِ فرانس میں حامیِ انقلاب زرِ کثیر خرچ کرکے پیدا کیے تھے وہ جو خوں ریزیاں کراتے تھے جس سے تمام یورپ دہل گیا تھا اور انقلاب کی رفتار رُک گئی تھی، اسی طرح اس نے اپنی عَیّاریوں کو کام میں لاکر اپنے گُرگے چھوڑ دیے جو لوگوں کو ہجرت کے اپنے فتوے دکھاتے اور شرعی وجوب کی جانب متوجہ کرکے ہجرت کی تلقین کرتے تھے۔

یہ بھی سبز باغ دکھاتے تھے کہ وہاں پہنچتے ہی تم کو ہر طرح کی راحت ملے گی اور تم مالدار ہوجاؤ گے۔چین کی زندگی گذاروگے۔''

ظفر حسن ایبک (متوفی جنوری ۱۹۸۹ء شاگرد ورفیقِ مولانا عُبید اللہ سندھی متوفی ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں:

''قافلے پر قافلے جلال آباد اور کابل پہنچنے لگے ۔شروع میں ان کو خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی ۔لیکن ان سب کے لئے قابلِ اطمینان انتظام ناممکن تھا۔

بے چاری پردہ پوش خواتین وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں ۔بعض بداخلاق کابُلیوں نے ان پر سخن اندازی بھی کی ۔بعض لوگوں نے تو روٹی اور کھانا خریدنے کے لئے اپنا اَثاثُ البیت بھی فروخت کرنا شروع کیا جن کو کابُلیوں نے آدھے دام پر بھی نہ لیا۔

ان لوگوں کا فارسی زبان سے بے بہرہ ہونا، ان کی بے مائگی ، پردیس اور اس پر وفادار دوستوں کا فُقدان ، یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو خود دیکھا ہو اور ان کا سامنا کیا ہو۔

آخر جب مہاجرین کی تعداد بڑھنے لگی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبوں مثلاً پنج شیر، قطغن ، بدخشاں ، اور ترکستان کو روانہ کر دیا گیا۔

صرف چند ایک نوجوان ترکستان پہنچے اور وہاں سے تاشقند چلے گئے ۔کچھ قطغن اور بدخشان میں آباد ہوئے ۔مگر وہ بھی مالی مشکلات کی وجہ سے پنپ نہ سکے ۔بقیہ کابل واپس آئے ۔'' ص ۲۱۵۔ آپ بیتی از ظفر حسن ایبک ،مطبوعہ لاہور۔

(ص ۱۳۵۔تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی ۔مطبوعہ قومی کونسل ،نئی دہلی ۱۹۹۷ء)

''یہ بات کہ ہجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری نے دیا تھا، اس درجہ عام ہوگئی ہے کہ ظفر حسن ایبک نے اپنی آپ بیتی میں بھی اسے بار بار لکھا ہے کہ ہجرت مولانا عبدالباری کے فتویٰ کی وجہ سے ہوئی ۔اور گویا کہ وہی اس کے آرگنائزر تھے۔لیکن یہ بے بنیاد بات ہے۔

غلط فہمی کی اصل وجہ شاید یہ ہے کہ:

مولانا عبدالباری اُس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلّمہ قائد تھے۔ اور عوام ہوں یا خواص، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا عُلما، سب میں یکساں مولانا کا ایسا وقار تھا کہ کسی بڑے پیمانے کی تحریک کا سوا اُن کی جانب سے ہونے کے اور کوئی خیال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا۔'' (ص ۱۳۶۔تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی ۔مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۔نئی دہلی ۔طبع دوم ۱۹۹۷ء)

تحریکِ تَرکِ موالات ہی نے تحریکِ ہجرت کی طرف پیش قدمی کی تھی ۔صوبۂ سندھ

میں تحریکِ ہجرت کا آغاز ۱۹۲۰ء میں ہُوا جس سے لاکھوں مسلمان متاثر ہوئے اور سندھ سے افغانستان ہجرت کرنے والے ہزاروں مسلمانوں کی زمین جائداد وہاں کے متموّل ہندوؤں نے خریدی۔

سندھ کے خلافتی وموالاتی لیڈروں کی تائید کرتے ہوئے دوسرے مرکزی خلافتی وموالاتی لیڈروں نے ۱۹۲۰ء ہی میں مسلمانانِ ہند کو ہندوستان سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے اور بدحال و پریشاں حال ہوکر ہندوستان واپس آئے تو مفلس وقلاش ہو چکے تھے۔

ایک اِستفتا بسلسلۂ ہجرت کا جواب دیتے ہوئے فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۔۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

''ہجرت دو قسم ہے، عامّہ وخاصّہ۔

عامّہ یہ کہ تمام اہلِ وطن تَرکِ وطن کر کے چلے جائیں۔ اور خاصّہ یہ کہ خاص اَشخاص۔

پہلی ہجرت دارُالحرب سے ہر مسلمان پر فرض ہے جس کا بیان آیۂ کریمہ **اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ** ۔الآیۃ (وہ لوگ کہ جن کی جان فرشتے نکالتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے) میں ہے ۔اس سے صرف عورتیں اور بچے اور عاجز مَرد جو نہیں نکل سکتے، مُستثنیٰ ہیں ۔جس کا ذِکر اس سے متصل دوسری آیۂ کریمہ **اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ** ۔الآیۃ میں ہے۔ باقی سب پر فرض ہے۔ جو باوصفِ قدرت دارُالحرب میں سکونت رکھے اور ہجرت نہ کرے، مستحقِ عذاب ہے۔

رہا دارُالاسلام، اس سے ہجرتِ عامّہ حرام ہے کہ اس میں مساجد کی ویرانی وبے حرمتی، قبورِ مسلمین کی بربادی، عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کی تباہی ہوگی۔

اور ہجرتِ خاصّہ میں تین صورتیں ہیں:

اگر کوئی شخص کسی وجہِ خاص سے کسی مقامِ خاص میں اپنے فرائضِ دینیہ بجا نہ لاسکے اور دوسری جگہ ممکن ہو، تو اگر یہ خاص اسی مکان میں ہے، اس پر فرض ہے کہ یہ مکان چھوڑ کر دوسرے مکان میں چلا جائے، اور اگر اس محلّہ میں معذور ہو تو دوسرے محلّہ میں اُٹھ جائے، اور اس شہر میں مجبور ہو تو دوسرے شہر میں ۔**وعلیٰ ھذا القیاس**۔

كمـا بيّـنـه فـي مَـدارِكِ التَّـنزيل و استَشْهَدَ بِحَديثٍ ۔(جیسا کہ مدارکُ التَّنزِیل میں اس کی تفصیل ہے اور اس پر ایک حدیث سے اِستِشہاد کیا ہے)

دوسری وہ کہ یہاں اپنے فرائضِ مذہبی بجالانے سے عاجز نہیں اور اس کے ضعیف ماں یا باپ یا بیوی یا بچے جن کا نفقہ اس پر فرض ہے، وہ نہ جاسکیں گے یا نہ جائیں گے اور اس کے چلے جانے سے بے وسیلہ رہ جائیں گے تو اس کو دارُالاسلام سے ہجرت کرنا حرام ہے۔ حدیث میں ہے: كَفىٰ بِالمَرْءِ اِثماً اَن يُضِيعَ مَن يَقُوت ۔کسی آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کردے جس کا نفقہ اس کے ذِمَّہ تھا۔

یا وہ عالم جس سے بڑھ کر اس شہر میں عالم نہ ہو اُسے بھی حرام ہے۔ وقد نصَّ في البزّازيه والدُّرِّ المُختارِ انَّهُ لايَجُوزُلَهُ السَّفَرُ الطَّويلُ مِنهَا فَضلاًعَنِ المهاجرة ۔(بزازیہ اور دُرِّمختار میں تصریح ہے کہ ایسے آدمی کے لئے طویل سفر جائز نہیں، چہ جائے کہ وہ وہاں سے ہجرت کرجائے)۔

تیسری وہ کہ نہ وہ فرائض سے عاجز ہے نہ یہاں اس کی حاجت، اسے اختیار ہے کہ رہے یا چلا جائے، جو اس کی مصلحت ہو۔ یہ تفصیل دارُالاسلام میں ہے۔

اب آپ اپنی حالت کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ آپ کو ہجرت جائز یا واجب یا حرام ہے۔ واللّٰہُ تَعالیٰ اعلم۔'' (ص۱۳۱و۱۳۲، فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴، رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

ظفر حسن ایبک (متوفی جنوری ۱۹۸۹ء) شاگرد ورفیقِ مولانا عُبید اللہ سندھی (متوفی ۱۹۴۴ء) لکھتے ہیں:

''نتیجہ یہ ہُوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے۔ افغانستان پر مالی بوجھ پڑا۔ ہندوستانی مسلمان اَفغانوں سے، اور افغان، ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ صرف انگریز تھے۔'' (آپ بیتی، حصہ اول از ظفر حسن ایبک۔ مطبوعہ لاہور)

اس موقع پر مسلمانوں کی زمین جائداد ہندوؤں نے خریدی اور ہزاروں مسلمان بے گھر بے دَر ہوئے۔ چنانچہ رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

''خریدنے والے زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ ہزاروں مسلمان افغانستان ہجرت کرگئے۔

وہاں جگہ نہ ملی، واپس کیے گئے۔ کچھ مَر کھپ گئے۔ جو واپس آئے تباہ حال، خستہ، دَرماندہ، مُفلِس، قلاش، تہی دست، بے نوا، بے یارومددگار۔

اگر اسے ہلاکت نہیں کہتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟'' (ص:۱۰۸۔ حیاتِ محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ تاج آفس ممبئی)

آریہ سماجی لیڈر سُوامی شردھانند (مقتول دسمبر ۱۹۲۶ء) جسے موالاتی لیڈروں نے دعوت دے کر جامع مسجد دہلی میں تقریر کرائی تھی، اس نے ۱۹۲۳ء میں علاقۂ آگرہ وراجپوتانہ میں شُدّھی تحریک کو متحرک کرکے ''ہندومسلم اتحاد'' کی قلعی کھول دی اور لاکھوں مسلمانوں کو مُرتد بنادیا۔ ادھر تُرکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۲ء میں سلطانِ تُرکی کی معزولی اور ۱۹۲۴ء میں تُرکی پارلیمنٹ میں خاتمۂ خلافت کا باضابطہ اعلان کرکے تحریکِ خلافت کو بے جان کردیا۔ ساتھ ہی ۱۹۲۴ء ہی میں بیلگام، کرناٹک میں گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک جو ۱۹۲۲ء میں ہی چَوری چَورا (گورکھ پور) حادثہ کے بعد تقریباً مُردہ ہوچکی تھی اس کے خاتمہ کا باضابطہ اعلان کردیا۔

اس طرح وہ تحریک جسے خلافتی وموالاتی لیڈر مذہبی بنیاد پر چلا رہے تھے وہ بالکل جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

حیرت انگیز اتفاق یہ ہے کہ بیلگام، کرناٹک میں ۲۴؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صدارت میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ ۲۶؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو اسی جگہ گاندھی کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اور:

''بیلگام میں کانگریس ہی کے پنڈال میں ۲۷؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ہندومَہاسَبھا کا اِجلاس ہوا جس کی صدارت پنڈت مدن موہن مالوِیہ نے کی۔ اس میں کانگریس کے لیڈروں نے بھی شرکت کی۔ مالوِیہ جی نے دعویٰ کیا کہ ''ہندومَہاسَبھا'' کوئی فرقہ وارانہ جماعت نہیں۔

بیلگام میں آخرکار گاندھی جی نے سِپر ڈال دی اور گاندھی، نہرو، سی آر داس مُعاہَدہ تیار ہوا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ کونسلوں کا داخلہ منظور کیا جائے اور چَرخَہ کاتنا ممبری کے لئے ضروری قرار دیا جائے۔ گاندھی جی نے تَرکِ موالات کو خیر باد کہا اور اپنے آشرم واپس چلے گئے۔'' (ص:۲۵۳۔ تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل، برائے فروغ

اردو، نئ دہلی)

''مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو ان کو ''باپو'' کہتے تھے اور کراچی کے مقدمہ میں سزا پانے کے بعد جب وہ راہ میں تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ تحریک کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ:

میں تو جیل میں ہوں البتّہ میں یہ جانتا ہوں کہ رسول کے بعد میرے اوپر مہاتما گاندھی کا حکم نافِذ ہے۔''

مولانا آزاد سُبحانی، گاندھی کے آشرم میں چلے گئے تھے اور ایک لباس پہن لیا تھا جو صرف گھٹنا اور کہنی بند تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد قولاً و عملاً گاندھی جی کے ہم نَوا تھے۔'' (ص:۸۰۔ تحریکِ خلافت از قاضی محمد عدیل عباسی، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئ دہلی)

خلافت فنڈ کا جو حَشر ہُوا اس کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) کے دستِ راست مولانا عبدالرَّزّاق ملیح آبادی ندوی (متوفی ۱۹۵۹ء) لکھتے ہیں:

''ایک قلیل رقم تُرکوں تک پہنچی، باقی روپے کو مُردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بے دردی سے قومی روپے اپنی ذات پر اُڑا رہے ہیں۔'' (ص:۳۸۸۔ ذکرِ آزاد۔ مطبوعہ دہلی)

خود مولانا محمد علی جوہر (متوفی ۱۹۳۱ء) نے ۲۵/دسمبر ۱۹۲۷ء کے پشاور اِجلاس میں جو اِنکشاف کیا وہ چشمِ عبرت سے پڑھنے لائق ہے:

''ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتا رہا۔ ہماری قید کے بعد بھی مہاتما گاندھی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمایہ سے لیے۔ حتیٰ کہ کانگریس کے لئے ایک کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے آپ کے دورانِ سفر کے مصارف بھی خلافت نے ادا کیے۔'' (ص:۱۰۵۔ حیاتِ محمد علی جناح از رئیس احمد جعفری ندوی۔ مطبوعہ ممبئ)

تحریکِ خلافت سے ہجرت تک کی مُسلم سیاسی قیادت، مسٹر گاندھی کے ہاتھوں کا کس طرح کھلونا بنی ہوئی تھی، اس کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک قاسمی فاضل اس طرح

رقم طراز ہیں:

''خلافت کا معاملہ اگرچہ صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا تھا، تاہم یہ معاملہ مہاتما گاندھی کی نگرانی اور سربراہی میں آ گیا اور تحریکِ خلافت کے حامی مسلمانوں نے بغیر کسی حیل وحُجت کے انھیں اپنا رہنما تسلیم کر لیا۔

مہاتما گاندھی نے خلافت کے معاملے پر ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جی توڑ کوشش کی، لیکن انھیں کوئی خاص کامیابی نہ مل سکی۔ اس وجہ سے مہاتما گاندھی کو انگریزوں کے خلاف اپنی جد وجہد میں پنجاب کا مسئلہ، عدمِ تعاون، اور گئوکشی کے معاملے بھی شامل کرنے پڑے۔

ادھر انگریزوں نے مسلمانوں پر مصائب کی اِنتہا کر دی اور ان کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر نے جو افضل اقبال کے الفاظ میں ''نپولین کا سادِل، برکلے کی سی خطابت، اور میکالے جیسے قلم کے مالک تھے'' خلافت کے سوال پر پیرس میں ۲۱/مارچ ۱۹۲۰ء کو ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ہم یہاں آپ سے صرف ایک چیز مانگنے آئے ہیں جو ہمیں ساری دنیا سے عزیز ہے، جو ہمارے نزدیک تمام دُنیوی دولت سے زیادہ بیش بہا ہے۔ اور وہ چیز ہمارے ''ضمیر کی آزادی'' ہے۔

خلافت صرف تُرکی کا ہی معاملہ نہیں ہے۔ یہ عام عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ یہ ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ الجزائر کا معاملہ ہے۔ اور تیونس کا معاملہ ہے۔''

مولانا محمد علی جوہر نے کہا:

''مہاتما گاندھی کی آمد سے پہلے ہندوستان کے سیاسی حالات ایسے ہی تھے جیسے حضرت عیسیٰ کے ظہور سے پہلے ''جوڈیا'' کے تھے۔''

مہاتما گاندھی کے تحریکِ خلافت کی قیادت سنبھالنے پر مولانا محمد علی جوہر خاصے مسحور نظر آتے تھے۔ اس وقت تک مہاتما گاندھی، تحریکِ خلافت کے ''آمرِ مُطلق'' بن چکے تھے۔

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں مہاتما گاندھی نے خلافت کی بحالی کے لئے بڑی جد وجہد کے ساتھ پُر امن عدمِ تعاون کا پروگرام مرتَّب کیا۔ اس سلسلے میں طے کیا گیا کہ:

مغربی اَشیا کا بائیکاٹ کیا جائے اور انتخابات میں شرکت نہ کریں۔ وکیل عدالتی کار روائی کا مقاطعہ کریں۔ تمام ہندوستان میں مزدور ہڑتالیں کریں اور طالبِ علم اپنی کلاسوں میں نہ جائیں۔

اس وقت مسلمان چوں کہ جوش سے لبریز تھے، اس لئے انھوں نے اس پروگرام کی حمایت کی۔ تحریکِ خلافت کی حمایت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سیکڑوں طلبہ نے اپنی تعلیم موقوف کر دی لیکن بنارس ہندو یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

مہاتما گاندھی کے اس اعلان سے متأثر ہو کر۔ جس کا مظاہرہ وہ بار بار اپنی تقاریر میں کر چکے تھے کہ:

''اگر خلافت بحال نہ کی گئی تو ہندوستان کے تمام مسلمان ہجرت کر جائیں گے۔''

تقریباً بیس ہزار مسلمان ہندوستان سے افغانستان ہجرت کر گئے۔''

(ص ۴۲ و ۴۳۔ تحریکِ خلافت اور جدو جہدِ آزادی۔ مؤلفہ ڈاکٹر منور حسن کمال قاسمی۔ مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ کوچہ پنڈت۔ لال کنواں۔ دہلی ۶۔ مطبوعہ ۲۰۰۷ء)

حضرت خواجہ محمد حسن جان فاروقی مجدِّدی (متولد شوال ۱۲۸۷ھ/اپریل ۱۸۶۲ء قندھار، افغانستان۔ متوفی رجب ۱۳۶۵ھ/جون ۱۹۴۶ء۔ سندھ) کے تذکرہ میں مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری لاہوری (متولد ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء۔ متوفی ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء) تحریر فرماتے ہیں:

''تحریکِ خلافت میں گم کردہ راہ لیڈروں کی کج رَوِی پر بہت افسوس کیا کرتے تھے۔ آپ نے کھل کر بعض مسائل میں شرعی نقطۂ نظر سے ان کے ساتھ اختلاف کیا۔ اور طعن و تشنیع کی پروا کیے بغیر اپنے موقف کو واضح طور پر پیش کیا۔

آپ گاندھی کی قیادت کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

ان لوگوں پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں سے لاتعلقی کرتے ہیں اور دوسری طرف مُشرکینِ ہند سے اتحاد و وداد کے حامی ہیں۔

اسی طرح جب لیڈروں نے ہندوؤں کے فریب میں آ کر سادہ لوح مسلمانوں کو انگریز کے مقبوضہ علاقوں سے ہجرت کر کے افغانستان چلے جانے کا مشورہ دیا اور لوگ جوق

در جوق تَرکِ وطن کرنے لگے تو اس موقع پر بھی آپ نے قوم کی صحیح رہنمائی کی، تَرکِ وطن سے ممانعت کی اور فرمایا:

وہاں اتنی گنجائش کہاں ہے کہ سب لوگ سَما سکیں؟ خواہ مخواہ خود بھی پریشان ہوں گے اور مسلمانوں کے بادشاہ کو بھی تکلیف دیں گے۔ اس سے مسلمانوں کے دشمنوں کو خوشی ہو گی۔''

(ص ۴۴۸۔ تذکرۂ اکابر اہلِ سُنَّت پاکستان۔ مؤلفہ مولانا محمد عبد الحکیم شرف قادری۔ مکتبہ قادریہ لاہور۔ طبع دوم ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر ایچ، بی، خان لکھتے ہیں:

.........مولانا محمد علی جوہر نے وائسرائے ہند کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ:

جو سرزمین اسلام کے پَیروؤں کے لئے محفوظ نہ رہے، وہاں کے مسلمانوں کے لئے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں: اوَّلاً:۔ جہاد۔ ثانیاً:۔ ہجرت یا تَرکِ وطن۔

لِہٰذا اَب مسلمانانِ ہند، ہندوستان کو دارُ الحرب خیال کرتے ہیں اور ان کے لئے اب ہجرت ناگزیر ہے۔''

بعدۂ تَرکِ موالات کے سلسلے میں ایک جلسہ ۱۸/جولائی ۱۹۲۰ء کو منعقد ہوا اَور اسی نشست میں تحریکِ ہجرت کی تجویز بھی پیش کی گئی اور اس پر غور کیا گیا۔

اس کے بعد نومبر ۱۹۲۰ء میں ایک جلسہ الٰہ آباد میں منعقد ہُوا جس میں مسئلۂ ہجرت دوبارہ پیش ہوا۔

مولانا محمد علی جوہر نے ہجرت کرنے کی تائید میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ عُلمائے کرام سے اس سلسلے میں فتویٰ حاصل کیا گیا اور عُلما نے موجودہ حالت کے پیشِ نظر ہندوستان کو ''دارُ الحرب'' قرار دے دیا۔

پروفیسر عزیز احمد کے بیان کے مطابق اس فتویٰ کے ''مفتیِ اعلیٰ'' مولانا آزاد تھے۔

مولانا عبد الباری نے بھی مُبہم الفاظ میں ہجرت کی حمایت کی۔

علی گڑھ گزٹ نے اپنے اداریے میں بیان کیا ہے کہ:

سنٹرل خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی ہدایت کے بموجب مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر زور دیا۔ سادہ لوح مسلمانوں نے اسے ایک دینی فریضہ اور مقدس کام سمجھ کر افغانستان کو ہجرت

کی۔اس ہجرت میں صوبۂ سندھ اور شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں نے خاص طور پر حصہ لیا۔

ان بے چارے مہاجرین نے اپنی جائدادیں، قیمتی ظُرُوف، زیورات اور مال واسباب کو اَونے پَونے داموں پر فروخت کیا اور اسلام اور خلافت سے عقیدت کی خاطر اپنا گھر بار اور سب کچھ ختم کرنے کے بعد اگست ۱۹۲۰ء میں افغانستان کو روانہ ہوگئے۔''

(چند سطروں کے بعد) حکومتِ افغانستان نے اس جَمِّ غفیر کو دیکھ کر اپنی سرحدیں بند کردیں اور مہاجرین کو سرحد سے ہی واپس کرنا شروع کردیا۔ لہٰذا چند دنوں کے بعد مسئلۂ ہجرت منسوخ ہوگیا۔

اس غیر دانش مندانہ اِقدام نے مسلمانانِ ہند کو نہ صرف اقتصادی اور سماجی بدحالی سے دوچار کیا بلکہ مہاجرین میں سے بہت سے افراد موت کا شکار ہوگئے''۔ علی گڑھ گزٹ۔ شمارہ ۱۶؍مئی ۱۹۲۱ء۔

تحریکِ ہجرت کے مُحرِّکین میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی پیش پیش تھے۔ مگر اِن حضرات میں سے خود کسی نے بھی ہجرت نہیں کی، جس کا سبب معلوم نہیں ہوسکا۔

ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ جو ہجرت کا ارادہ رکھتے تھے، انھوں نے حکومتِ افغانستان کے رویّے کے باعث اپنا ارادہ تَرک کردیا ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ جن زُعَما نے ہجرت کی تائید کی۔ انھوں نے مسئلے کو خالص جذباتی انداز میں دیکھا اور سیاسی بصیرت کا ثبوت نہیں دیا۔''

(ص ۱۶۴ و ۱۶۵۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا کردار۔ از ڈاکٹر ایچ، بی، خان۔ قومی ادارہ تحقیقِ تاریخ وثقافت، اسلام آباد، پاکستان۔ ۱۹۸۵ء)

اس دور کی ہنگامی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۹۷۷ء) لکھتے ہیں:

''۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور رہا ہے۔ تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کا طوفان زُوروں پر تھا۔ ملک کا سَوادِ اعظم شیخُ الھند (مولانا محمود حسن دیوبندی)، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ۔ ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے تھے۔

ندوہ اور علی گڑھ دونوں زَد پر۔ اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکے کا مورچہ علی گڑھ تھا۔ شِروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے ساتھ دوسرے کیمپ میں۔ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سُننا اور کیا کچھ سَہنا پڑا۔ جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان وقلم پر قابو رَہا ہے؟ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے کل ''حَبیبُ الرَّحمٰن'' سے ''حَبیبُ الشَّیطان'' مشہور ہوئے۔'' (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ یوپی۔ شمارہ دسمبر ۱۹۵۰ء۔ بقلم عبدالماجد دریابادی)

نواب وزیر یار جنگ وزیر مالیات ریاستِ حیدرآباد دَکن کے صاحب زادے نواب مشتاق احمد حیدرآبادی اپنے مشاہدات وتجربات کا ذِکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان تین ہنگاموں کے بعد مسلمان عام طور پر محسوس کرنے لگے کہ:

انھوں نے جذبات کی رَو میں بَہ کر اپنا ہی نقصان کیا۔ علی گڑھ میں تعلیم کی بربادی ہوئی۔ نظم وضبط متأثر ہوا۔ اور اس سارے دور میں بنارس ہندو یونیورسٹی پر کوئی آنچ نہیں آئی۔

علی گڑھ کو قربانی کا بکرا بنایا۔'' الخ (ص ۸۸۔ کاروانِ حیات۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء۔ بقلم نواب مشتاق احمد حیدرآبادی)

اسی زمانے میں دبی زبان سے جہاد کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک اِستفتا (از خلیفہ شہابُ الدین۔ موچی دروازہ، لاہور۔ مُحرَّرہ ۲۱ محرم ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء) کا جواب دیتے ہوئے مفتیِ اعظم مولانا الشّاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی نوری بریلوی (وصال محرم ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱) خَلفِ اصغر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) تحریر فرماتے ہیں:

(چند مقدمات کے بعد) فَاَقُوْلُ وعَلَی اللّٰہِ اَعُوْلُ۔

اِن مقدمات سے ظاہر ہوا کہ:

جو حکم، انسانی قوت وطاقتِ بشری سے باہر ہو، وہ ہرگز حکمِ شریعت نہیں۔ جس حکم میں کوئی فائدہ نہ ہو، عَبث ولَغو ہو، وہ ہماری پاک شرع کا حکم نہیں۔ جس حکم میں بے فائدہ اِتلافِ جان واِہلاکِ نفس ہو، وہ اس شرعِ مُبین کا حکم نہیں۔

یوں ہی جس حکم سے سوتے فتنے جاگیں، فساد برپا ہوں، وہ کبھی مقدس اسلام کا حکم نہیں ہوسکتا۔ اب خود دیکھ لو کہ یہاں اس وقت حکمِ جہاد میں تکلیف مَالَا یُطاق ہے یا نہیں؟ اس

میں کوئی فائدہ ہے یاسَراسَر مَضَرَّت؟ جانوں کی بے وجہ ہلاکت ہے یاحفاظت؟ فتنہ وفسا کی اِثارَت ہے یا اِماتَت؟ اس میں مسلمانوں کی عزت ہے یاذِلّت؟ یہ حکم قبل اَز وقت ہے یاخاص وقت پر؟

اِن اُمور پرغور کرلینے کے بعد یہ مسئلہ صاف ہوجائے گا۔ اصلاً خفانہ رہے گا۔

کیانِہتّوں کواُن سے جوتمام اسلحوں سے لیس ہوں،لڑنے کاحکم دیناسختی نہیں؟ اور تکلیف فوق الوُسعت نہیں؟ کیاایسوں کوجوہتھیار چلانا بڑی بات ہے،اُٹھانانہیں جانتے، جن کے وَھم میں بھی کبھی نہیں گذرا کہ بندوق کس طرح اُٹھاتے،تلوار کیوں کرتھامتے،طمنچہ کیسے چلاتے ہیں؟ جنھوں نے کبھی جنگ کے ہنگامے،لڑائی کے معرکے،خواب میں بھی نہ دیکھے،انھیں توپوں کے سامنے کردینا،کچھ زیادتی نہیں؟

کیاایسوں سے میدان کرانااوران کی جانیں مُفت گنوانا،عَبث نہیں؟

کیایہ فتنہ وفسادنہیں کہ مسلمانوں کی عزیزاور قیمتی جانیں مُفت ضائع ہوں؟

اس سے بڑھ کراورفتنہ اوراس سے زائد **فساد فِی الارض** کیاہوگا؟

ایک مسلمان،ایک کعبہ نہیں ہزارہوں،اُن سے زیادہ افضل وبہتر ہے۔

دِل بدست آوَرکہ حجِ اکبرست
ازہزاراں کعبہ، یک دِل بہترست

غُنیۃُ المُستَملِی میں ہے۔علاّمہ ابراھیم حلبی فرماتے ہیں:

حُرمۃُ المُسلمِ الواحدِ اَرجحُ مِن حُرمَۃِ الکعبۃ۔

توایک جانِ مسلم کااِتلاف کعبہ ڈھانے سے بدتر ہے۔ بلکہ ساری دنیا کازَوال،اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کے ناحق قتل سے کہیں ہلکا ہے۔

نبی کریم صلَّی اللّٰہُ علیہِ وسَلَّم فرماتے ہیں:

لَزَوالُ الدُّنیا اَھوَنُ علی اللّٰہِ مِن قَتلِ رَجُلٍ مُسلمٍ۔

رَواہ التِرمذِی والنَّسائی عن ابن عَمرو بن العاص رَضِیَ اللّٰہُ تعالیٰ عنھُما۔

ایسی حالت میں جہاد جہاد کی رَٹ لگانا،غیرقوموں کواپنے اوپر ہنسانا اوران سے یہ طَعن اٹھانا ہے:

اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور جب کہ وہ ان شنائع وقبائح پر مشتمل ہے۔حرام حرام حرام ہے۔ وہ ہرگز حکمِ شرع نہیں۔شریعت پر اِفترااورزیادت ہے۔

جوآج اسے حکمِ الٰہی وامرِ حضرت رسالت پناہی ٹھہرارہے ہیں،مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ وہ اللہ ورسول پر اِفتراکرتے،بہتان باندھتے ہیں۔ **اللّٰہ عَزَّ وجَلَّ** فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَایُفْلِحُوْنَ ۔

اورفرماتا ہے رب تبارک وتعالیٰ:

اِنَّمَا یَفْتَرِی الْکَذِبَ الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰذِبُوْنَ ۔

اورارشادفرماتا ہے عَزَّ وعَلَا:

وَیْلَکُمْ لَاتَفْتَرُوْاعَلَی اللّٰہِ کَذِباً فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی ۔

اورفرماتا ہے جَلَّ جَلَالُہٗ وَعَمَّ نَوَالُہٗ:

لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ۔

یہاں کے نہتے بے سَردھڑ،جنگ سے ناواقف مسلمان،ان پرتوان پر،خود سلطانِ اسلام جس کے پاس سامانِ حَرب بھی ہواور باقاعدہ فوج بھی،وہ اگر یہ سمجھے کہ کفّار زائد ہیں۔ یہ فوج اورسامان ان کے لئے کافی نہ ہوگا۔ایسی حالت میں اسے اُن سے پہل ناجائز ہے۔

یہ مسئلہ مُصرَّحہ ہے۔مثلاً **رَدُّ المُحتار** میں فرمایا:

ھذااِذا غَلَبَ عَلٰی ظَنِّہٖ اَنَّہٗ یُکافِئُھُمْ وَاِلاَّ فَلا یُبَاحُ قِتالُھُمْ ۔

.........وہ (مولاناعبدالباری فرنگی محلی) اپنے رسالہ ''ھجرت'' میں کہتے ہیں:

''میں کُشت وخون کوخصوصاً مجتمع حملہ کی صورت میں جیساکہ لشکر کرتا ہے،غیر مفید سمجھتا ہوں۔کیوں کہ اس کے اَسباب مجتمع نہیں۔''

اسی رسالہ میں لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ اِھلاکِ نفس بلاضرورت جائز نہیں۔قانون جن اُمور

کوروکتاہے،ان کے نہ کرنے میں ہمیں عذر ہے۔''

جہاد تین قسم ہے ۔یہ حکمِ حُرمت اس وقت یہاں سنانی سے خاص ہے ۔جسے آج لیڈران فرض ٹھہرارہے ہیں۔

رَہے لسانی وجنانی،وہ بفضلہٖ تعالیٰ عُلمائےاہلِ سُنّت وتمام اہلِ سُنّت نے کیے ہیں،کررہے ہیں۔اوراِن شاءَ اللّٰہ کرتے رہیں گے۔

لیڈران اُلٹے چلے کہ جوحرام تھا اُسے فرض بتایا۔اورجوفرض تھا اُسے اپنے چہیتے ،اپنے پیارے،ہندوؤں کے ساتھ حرام کیا۔

اصل یہ ہے کہ وہ گاندھی کواپناامام وپیشوا،ھادِی ورہنما جانتے ہیں۔

..........لِھٰذا گاندھی کے اَقوال واَحکام پرسرمنڈاتے اوراحکامِ اسلام کوپسِ پُشت ڈالتے ہیں۔اس کے مخالفِ اسلام اَقوال کوقرآن وحدیث کاجامہ پہناتے ہیں۔

جوکچھ وہ کہتاہے یہ کہتے ہیں۔جووہ کرتاہے یہ کرتے ہیں۔

غرض اِتبّاعِ ھَوٰی پرمَرتے ہیں۔ورنہ کیا آج سے پہلے قرآنِ عظیم میں آیاتِ جہاد وتَرکِ موالات نہ تھیں؟(ص۲۹تاص۳۳۔طُرُقُ الھُدیٰ والْاِرشادالِیٰ حکمِ الْاِمَارَۃِ والجِھَاد (۱۳۴۱ھ)ازمفتیٔ اعظم مولاناالشاہ محمد مصطفیٰ رضابرکاتی نوری بریلوی۔مطبوعہ حَسَنی پریس بریلی۔۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء)

...........پہلے انگریزوں کے جاں نثار تھے اب گاندھی پرمَرتے ہیں۔

اِس وقت یہ حکمِ جہاد بھی اِسی دُشمنِ اسلام ومسلمین،گاندھی بَد دِین کاحکم ہے ۔جیسے پہلے ھجرت سے نقصان پہنچائے۔

مسلمانوں کے خانماں بربادکرائے۔ان کی بیش بَہا جائدادیں اوراَموال کوڑیوں میں بِکوائے ۔سب کوڑے کرائے ۔غریب مسلمانوں میں اتنا روپیہ کہاں تھا ؟ یوں اپنے ہندوبھائیوں کودِلوائے۔

یوں ہی یہ مسئلۂ جہادنکال کراس نے چاہا کہ:

مسلمانوں کو،جن کی روح بالکل فناہوچکی ہے۔کچھ یوں ہی سی رَمَق باقی ہے۔یہ بھی کیوں باقی رہ جائے؟بالکل تباہ کرائے۔

اگرچہ بظاہر گاندھی کی پالیسی یہ نہ ہو۔اوروہ اَخبار میں یہ شائع کرتا ہوکہ میرا مذھب کشت وخون کورَوانہیں رکھتا۔مگرادنیٰ تأمل سے یہ نکتہ حل ہوسکتاہے۔

غورفرمایئے!جولوگ بےحکمِ گاندھی نوالہ نہ توڑیں وہ بغیراس کے مشورہ کے ایسے اَمرِ عظیم کانام کیوں کرلیتے؟

معلوم ہوا کہ ضروراس نےان کویہ حکم دیا کہ:

تم جہاد جہاد پکارو۔اوراس سے انگریزوں کومَرعُوب کرلو۔اور میں دوسری پالیسی سے کام لوں گا۔''

عقل ہوتی تواس معمے کوسمجھتے۔مگرعقل توگاندھی نے لے لی۔سمجھے کون؟

(ص۴۱و۴۲۔طُرُقُ الھُدیٰ وَالْاِرْشَاد ۔مطبوعہ بریلی۱۹۲۲ء)

خلافتِ شرعیہ وموالاتِ وھجرت وجہادجیسے مسائل ومباحث پرمشتمل اس رسالہ **طُرُقُ الھدیٰ والْاِرشاد اِلٰی حُکمِ الْاِمارۃ والجِھاد** میں عُلمائےاہلِ سُنّت کے بیان کردہ وہی اَحکام تحریرکیے گئے ہیں جنھیں آپ مذکورہ صفحات میں جابجاپڑھتے چلے آرہے ہیں۔

اس طُرُقُ الھُدَیٰ پرمندرجہ ذیل اکابرعُلمائےاہلِ سُنّت کے تصدیقی دستخط ہیں:

(۱)مولاناسیدشاہ اولادِرسول محمدمیاں قادری برکاتی مارَہروی۔

(۲)مولاناعبدالسلام رضوی جبل پوری

(۳)مولانامحمدنعیم الدین مرادآبادی

(۴)مولانامحمدامجدعلی رضوی اعظمی

(۵)مفتی محمدعبدالباقی بُرھانُ الحق رضوی جبل پوری

(۶)مولاناحشمت علی رضوی لکھنوی ثم پیلی بھیتی

(۷)مولاناحسنین رضابریلوی

(۸)مفتی محمدعمرنعیمی مرادآبادی

(۹)مولاناعبدالرحمٰن رضوی

(۱۰)ابوسِراج مولاناعبدالحق رضوی

(۱۱)مولانامحمداسمٰعیل تلہری شاھجہاں پوری

(۱۱۲) مولانا محمد حشمت علی بریلوی

(۱۱۳) مولانا محمد طاہر رضوی شہسرامی

مذھبی علم اور سیاسی بصیرت سے عاری ہونے کا ایک نمونہ یہ بھی ہے جسے تحریکِ خلافت وترکِ موالات کے ایک سرگرم مبلّغ اور اردو صحافی مسٹر ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) ایڈیٹر روزنامہ زمیندار، لاہور نے اپنے خلاف دائر ایک مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے کورٹ کے سامنے ستمبر ۱۹۲۰ء میں کہا:

''میں نے ہندوستان کو دارُالحرب کہا ہے اور درست کہا ہے۔ ہماری مذھبی آزادی چھین لی گئی ہے۔ اسی لئے فرزندانِ توحید ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کر رہے ہیں۔''

(ص ۱۷۲۔ مولانا ظفر علی خاں! حیات وخدمات وآثار۔ مؤلّفہ پروفیسر غلام حسین ذوالفقار۔ سنگِ میل پبلی کیشنز۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور ۱۹۹۳ء)

روزانہ پیسہ اخبار، لاہور نے ایک اداریہ بعنوان ''معاملۂ ھجرت میں صَریح ناکامی'' تحریر کیا۔ جس کا یہ حصہ پڑھ کر قارئین کو عبرت حاصل کرنا چاہیے:

''خلافت کمیٹی کے عَلم بَرداروں نے سب سے پہلے ھجرت کا ڈَنکا بجایا۔ ہزاروں سادہ لوح، لیکن ایمان کے پکے مسلمانوں نے اپنی جائیدادیں فروخت کیں۔ عورتوں کو طلاق دی۔ چھوٹے چھوٹے بال بچوں کو روتا بلکتا چھوڑا۔

بہتوں کی جانیں پشاور اور کابُل کی سڑک پر تلف ہوگئیں۔ بعض منزلِ مقصود پر پہنچ کر جاں بحق ہوئے۔ بعض واپسی پر راہ میں تباہ ہوئے۔ اکثر کا روپیہ پیسہ لوٹا گیا۔

جو بچ کر واپس آئے۔ ان میں سے اکثر گداگری کرنے پر مجبور ہوئے۔

اس طرح خلافت کمیٹی نے ہزاروں کلمہ گو مسلمانوں کی شہادت اور بربادی کا ثواب وصول کیا۔

لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انھوں نے
کیا دینِ بَرحق کو بدنام انھوں نے

(روزنامہ ''پیسہ اخبار''۔ لاہور۔ شمارہ ۸/اپریل ۱۹۲۱ء)

☆☆☆☆

عُلما سے لیڈروں کی ملاقاتیں

مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی کا دورانِ تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ تنہا یا وفد کے ساتھ بعض مشاہیر عُلمائے ہند سے ملاقات کر کے انھیں اپنا ہم خیال وہم نوا بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک وفد کے ہمراہ ایک بار گاندھی نے مولانا محمد علی مونگیری (وفات ربیع الاول ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) سے ملاقات کی۔

گاندھی نے اپنے مطالعۂ سیرت کا حوالہ دے کر قرآنِ حکیم اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعریف وتوصیف کی——

''مولانا مونگیری، گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب گاندھی جی اپنی بات کہہ چکے تو مولانا نے پوچھا:

مجھے تو آپ اسلام کی وہ بات بتایئے جو آپ کو پسند نہیں آئی؟ اور آں حضرت ﷺ کے اُس پہلو سے آگاہ کیجیے جسے آپ نے اچھا نہیں سمجھا؟

گاندھی جی اِس سوال کے لئے تیار نہیں تھے۔ کچھ چونکے اور فوراً بولے:

ایسا تو کوئی پہلو میری نظر میں نہیں آیا۔

اس پر مولانا مونگیری نے سوال کیا: تو پھر آپ نے ابھی تک اسلام کیوں قبول نہیں کیا؟

گاندھی جی کے پاس جواب نہیں تھا۔
مولانا مونگیری خفا ہو گئے اور کہا کہ:

”آپ نے جو کچھ کہا، غلط ہے۔ آپ ہمیں صرف پھانسنا چاہتے ہیں۔ صیّاد بھی پرندوں کو پکڑنے کے لئے انھیں کی بولیاں بولتا ہے۔“ (مسٹر احسان بی اے کی آپ بیتی - بحوالہ ص: ۳۰-۲۷ مہرِ منیر، مؤلّفہ مولانا فیض احمد۔ مطبوعہ پاک و ہند)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے تلمیذ و خلیفہ اور سوانح نگار مولانا محمد ظفرالدین قادری رضوی عظیم آبادی (وصال ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) پرنسپل مدرسہ شمسُ الھدیٰ پٹنہ لکھتے ہیں:

”اس سلسلے میں مسٹر گاندھی مشاہیر عُلما و مشائخ سے جا کر ملتے اور سب کو ہموار کرنے کی کوشش کرتے - چنانچہ خانقاہِ مُجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ پہنچے اور جناب سجادہ نشین مولانا شاہ بدرُ الدین صاحب سے خلوت میں دیر تک گفتگو کی۔ اور اس کی شہرت تمام اخباروں میں دھوما دھامی طریقے پر ہوئی۔

”اسی زمانہ میں مسٹر گاندھی بریلی شریف پہنچے اور اعلیٰ حضرت (امام احمد رضا بریلوی) سے ملنے کے متمنّی ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے قبول نہ فرمایا اور انکار فرما دیا۔ یہاں تک کہ بعض حضراتِ اھلِ سُنَّت مخلصینِ اعلیٰ حضرت نے بھی سفارش کی اور اسی کو قرینِ مصلحت سمجھا کہ اعلیٰ حضرت ان کی اِستدعا کو رَد نہ فرمائیں اور ملاقات کا تھوڑا سا وقت مسٹر گاندھی کو دے دیں۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ:

وہ مجھ سے دینی امور میں گفتگو کریں گے یا دُنیوی بہبود کے متعلق؟ دینی امور میں گفتگو کر نہیں سکتے کہ وہ ہمارے دین سے واقف نہیں۔ رہا دُنیوی بہبود کے متعلق تو جب میں نے اپنی دُنیوی بہبود کی طرف توجہ نہ کی تو دوسروں کی دنیا سنوارنے کی فکر میں کس طرح اپنا وقت ضایع کر سکتا ہوں؟

آپ حضرات جانتے ہیں کہ خداوندِ عالَم کی دی ہوئی نعمت تَرکہ آبائی سے میری کافی معیشت ہے مگر میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ (بھائی) حَسَن میاں رحمۃُ اللّٰہ علیہ انتظام کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد (بھائی محمد رضا خاں) ننھے میاں سَلّمہٗ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔“

(ص: ۴۴-۴۳۴۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت (سالِ تصنیف ۱۹۳۸ء) مطبوعہ مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور۔ ۲۰۰۳ء)

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا یہ جواب غالباً اس لئے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ گاندھی کا مقصد یہ ہے کہ تحریکِ تَرکِ موالات کی مجھ سے تائید حاصل کریں۔ اور اس تحریک کی بے اصولی و بے اعتدالی کی وجہ سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے آپ نے ایسا جواب دیا کہ ملاقات کی ضرورت بلکہ گنجائش ہی ختم ہو جائے۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے ان تحریکات کے سلسلے میں روزِ اول جو بات کہی اور جس نتیجے تک پہنچ کر مسلمانانِ ہند کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، اس نتیجہ اور اس کے مُضِر اثرات کو مسلم لیڈروں نے بہت بعد میں محسوس کیا اور موقعہ موقعہ سے مختلف صورتوں میں ان کی ندامت و رُجوع کا ظہور ہوتا رہا۔

آئندہ سُطور کے ذِکر کردہ واقعہ اور امام احمد رضا کے جواب کی اہمیت و اِفادیت کو دو تین سال بعد ہی کے پیش آمدہ حالات و حادثات نے اچھی طرح واضح کر دیا۔ چنانچہ شُدّھی تحریک یعنی تحریکِ اِرتِدادِ مسلمین ۱۹۲۳ء جس کا مُحرِک سُوامی شردَھانَند (مقتول دسمبر ۱۹۲۶ء) تھا، اس تحریک کے اثرات و نتائج کے پیشِ نظر کلکتہ کے اِجلاسِ جمعیۃُ العُلماء منعقدہ ۱۴/ مارچ ۱۹۲۶ء زیرِ صدارت مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) یہ قرارداد پاس کرنی پڑی:

”چوں کہ برادرانِ وطن کے مخالفانہ طرزِ عمل سے منافرت کی خلیج وسیع ہو رہی ہے اس لئے مسلمان اپنی تنظیم کر کے اپنے بَل بوتے پر ملک کو آزاد کرائیں۔ البتّہ جو غیر مسلم حضرات اس بارے میں اِتحادِ عمل کرنا چاہیں، ان کے ساتھ اِتحادِ عمل کیا جائے گا۔“

(ص ۱۰۔ جمعیۃُ العُلما کی شرعی حیثیت از مولانا محمد میاں دیوبندی۔ مطبوعہ دہلی۔ و ص ۵۳۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری۔ و ص ۵۔ الجمعیۃ، دہلی۔ ۱۸/ مارچ ۱۹۲۶ء)

مولانا محمد علی جوہر و مولانا شوکت علی کی امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے ملاقات و گفتگو کا اہم واقعہ آپ کے علم آ چکا ہے کہ:

”تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی آپ کی خدمت میں بریلی حاضر ہوئے اور عرض کی کہ:

آپ ایک وسیع حلقے کے روحانی پیشوا ہیں۔ آپ تحریکِ آزادیِ ہند کے سلسلے میں کانگریس کا ساتھ دیں تو آپ کی شخصیت حالات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ:

مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے حامی ہیں اور میں مخالف ہوں۔

علی برادران جب باہر جا چکے تو مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ: مولانا احمد رضا خُشک ہیں۔''

آپ صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ فوراً کشف سے ان کے اَحوال پر مطلع ہوئے اور مولانا محمد علی جوہر کو بُلایا اور کہا کہ:

''مولانا! میں خشک نہیں ہوں۔ ملک آزاد کرانا ہے تو مسلمانوں کی اپنی علیحدہ تنظیم بنائیں اور ہندوؤں سے بالکل علیحدہ ہو جائیں۔''

مولانا جوہر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دست بوسی کی اور حضرت کے موقف سے آگاہ ہوئے۔'' (ص:۲۔ روز نامہ کوہستان لاہور وملتان۔ شمارہ، ۸ رمئی ۱۹۶۹ء)

حضرت مولانا نثار احمد کان پوری (وصال اپریل ۱۹۳۱ء) فرزند حضرت مولانا احمد حسن کان پوری (ولادت صفر ۱۲۹۶ھ ر ڈسکہ ضلع حِصار، پنجاب۔ موجودہ صوبہ ہریانہ۔ وصال صفر ۱۳۲۳ھ کان پور۔ یوپی) ایک بار ۱۹۲۰ء میں امام احمد رضا سے ملاقات وگفتگو کے لئے آپ کے پاس پہنچے۔ اور کچھ تبادلۂ خیال کے بعد جس نتیجہ تک بات پہنچی اس کا ذکر کرتے ہوئے خود امام احمد رضا ارشاد فرماتے ہیں:

''انہوں نے کہا کہ: ہم خالص اہلِ سُنّت کا جلسہ کریں گے۔

میں نے کہا: کیجیے، میں خالص اہلِ سُنّت کے ایک خدمت گار کی حیثیت سے اپنی تحریر بھیج دوں گا۔ جلسہ میں پڑھی جائے، کہ بوجہِ ضعف وعلالت، حاضری سے معذور ہوں۔''

(ص:۳۱، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم، مراد آباد۔ شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ)

تحریکِ خلافت وترکِ موالات کے ایک حامی کارکُن مولانا محمد فضلِ قدیر ندوی سے جناب مقبول جہانگیر مدیرِ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور کا ایک سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

مولانا! گاندھی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا عُلماے دین کا اسے یوں مسجدوں

اور دَرس گاہوں میں لیے پھرنا درست تھا؟

جواب:۔ آپ کا سوال اپنی جگہ اہم ہے۔ اس زمانے میں ہَوا ہی ایسی چلی تھی کہ سب گاندھی کے طلسم میں گرفتار تھے۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے مسلمان اکابر بھی اس کے ساتھ تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس معاملے میں ٹھوکر کھائی۔ تاہم بہت جلد گاندھی کا طلسم ٹوٹا۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پورب کے دیہات میں یہ اَفواہ پھیلی کہ گاندھی جی ''امامِ آخرُ الزَّماں'' اور امام مَہدی ہیں۔ نَعوذُ بِاللّٰہ۔

چنانچہ دیہاتی مجھ سے سوال کرتے تھے:

مُولبی صاحب! مہاتما گاندھی امام مَہدی ہے؟

میں جواب میں کہتا تھا کہ: ارے وہ تو کافر ہے۔ خبردار جو کسی نے اس کے بارے میں ایسا عقیدہ اختیار کیا۔

بعد اَزاں میں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے اس اَفواہ کا تذکرہ کیا۔

مولانا طیش میں آکر فرمانے لگے:

گاندھی محض سیاسی فقیر ہے جو مسلمانوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔

خیر! یہ تو عوام کا بھولا پن تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ:

خواص جو اندر سے باہر سے قطعی مجسّم کھدّر بن گئے، وہ بھی قومی تخصُّص سے تہی دامن ہو گئے۔''

مولانا فضلِ قدیر ندوی صاحب نے خود اپنی یہ سرگذشت سنائی کہ:

''میں اور مولوی خیرُ الانام اُسی دن گاندھی کی قیام گاہ پر گئے۔ انھیں اور علی برادران کو دارُ العلوم (ندوۃ العلما لکھنؤ) آنے کی دعوت دی۔ رات کو رفاہِ عام کلب (لکھنؤ) میں جلسہ تھا۔

جلسہ سے فراغت کے بعد گاندھی، علی برادران اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی، دارُ العلوم (ندوہ) پہنچے۔ میں نے بلند آواز سے پکارا:

مہاتما گاندھی کی جَے۔''

(سیّارہ ڈائجسٹ، لاہور۔ شمارہ نومبر ۱۹۷۷ء۔ مولانا فضلِ قدیر ندوی سے مقبول جہانگیر کا انٹرویو)

☆☆☆☆

ہندو مسلم اِتحاد

یہ ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ جس کے مُشرکانہ اَثرات نے مسلمانانِ ہند کے زُعَما اور ان کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد کو مذہبی ومِلّی غَیرت وحمیّت سے بے گانہ اور بے نیاز کردیا تھا، اس مُضِر اور بے لگام اِتحاد کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں اور اسی مُشرِک نواز ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ کی عُلماے اہلِ سنّت نے مخالفت کی اور بجا مخالفت کی۔

اس ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) ومولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) وغیرہ اور میثاقِ لکھنؤ ۱۹۱۶ء کے ذریعہ خالص سیاسی بنیادوں پر رکھی گئی تھی مگر اس کے اثرات سے مذہبی حُدود اور احکامِ شریعت وشعائرِ مِلّت بھی متاثر ہوئے۔

ڈاکٹر ایچ، بی، خان لکھتے ہیں:

’’مولانا شبلی نعمانی اور مولانا آزاد نے مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کے لئے ممکنہ سعی کی۔ مولانا آزاد نے ’الہلال‘ کے ذریعہ سیاسی طور پر مسلمانوں کو بیدار کیا اور برطانیہ کے خلاف رائے عامّہ کو منظّم کیا۔

اِن حضرات کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار ’’زمیندار‘‘ (لاہور) کے ذریعہ اور مولانا محمد علی نے ’’کامریڈ‘‘ (دہلی) کے ذریعہ برطانیہ کے خلاف بہت سے

مضامین لکھے۔

.........۲۹؍دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کا مشہور اِتحاد بنام ’’میثاقِ لکھنؤ‘‘ مرتّب ہوا۔ اس معاہدہ کے اصل معمار مسٹر جناح تھے۔

اس میثاق کے تحت ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ اہلِ ہند کے سیاسی مطالبات کو متفقہ طور پر پیش کرنے کے لئے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اس معاہدہ کی بدولت تمام ہندوستان کے باشندوں کی طرف سے ایک متفقہ اسکیم حکومت کو پیش کی گئی جو پانچ نِکات پر مبنی تھی۔‘‘ الخ

(ص ۱۳۲-۱۳۱۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا حصہ۔ از ڈاکٹر ایچ، بی، خان۔ قومی ادارہ تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، پاکستان۔ ۱۹۸۵ء)

قرآن وحدیث پڑھنے پڑھانے والے عُلماے خلافت وموالات وجمعیۃ العُلماء جس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے اُسے لالہ لاجپت رائے نے سمجھا اور صحیح سمجھا کہ ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ ایک خواب ہے اور ایسا خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

لالہ لاجپت رائے نے مسٹر سی، آر، داس کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

’’ایک اور چیز جو ایک عرصہ سے میرے لئے وجہِ اضطراب ہورہی ہے وہ ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور وخوض دوں۔

گذشتہ چھ ماہ میں، مَیں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صَرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ:

یہ چیز یعنی ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ ایک اَمرِ محال اور ناقابلِ عمل شئ ہے۔

وہ مسلمان رہنما جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کرلیا جائے پھر بھی میرے خیال میں ان کا مذہب اِس چیز یعنی ’’ہندو مسلم اتحادُ‘‘ کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔‘‘ (مکتوبِ لالہ لاجپت رائے بنام مسٹر سی، آر، داس۔ مطبوعہ اخبار مدینہ پریس بجنور۔ ۱۲؍فروری، ۱۹۲۰ء)

اگر صرف مُلکی مفادات کے تحفظ کے لئے اپنے تشخّص وشناخت کے ساتھ محتاط کوشش کی گئی ہوتی تو اس کی بات جُدا تھی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے حضرت مولانا

سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اپنے رسالہ **الرَّشاد** (مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء) میں رقم طراز ہیں:

''شریعتِ مطہّرہ ہر حال میں ہم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہے۔اور یہی وہ خصوصیتِ حیاتِ مسلم ہے جس میں کسی دوسری قوم کا حصہ نہیں۔اسی نکتہ کو سابقاً عرضِ خدمت کر چکا ہوں۔

مسلم کا اِضطرار بھی لِلّٰہ رَبِّ العلَمین کے محور سے نہیں ہٹتا۔اس کی بے چینی،اس کی بے قراری،سب اللہ ہی کے لئے ہے،اور اسی کی طرف ہے۔

برادرانِ اسلام! کیا اس موجودہ ہنگامۂ اِضطرار میں آپ اُوس مرکزِ خصوصی سے مُتجاوز نہیں ہو گئے؟ کیا اِس بے چینی میں آپ نے اہلِ ہنود کا اِس طرح دامن نہیں پکڑا جس سے آپ کا مذہب آپ سے فریادی ہو گیا؟

کیا اِس اتحاد و اتفاق میں وہ اصولِ حکیمانہ جس سے اِتحاد کی جَڑ فی الحقیقت مضبوط ہو جاتی،آپ سے نظر انداز نہیں ہو گیا؟

آپ کو اختیار ہے کہ اِن سوالوں کا جواب ایجاب میں دیں یا سَلب میں۔لیکن اصل جواب تو وہی ہے جس پر واقعات وحقائق شاہد ہوں۔ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے فقیر کی گزارش سنیے:

اِتحاد و اِتفاق یا عِناد و اِختلاف کی دو قسمیں ہیں: ایک عَرضی اور دوسرے ذاتی۔یعنی ایک شئ جب دوسری شئ کے مخالف ہو تو اس کی عِلَّت یا کوئی اَمرِ خارجی ہوگا یا ذاتی۔

اب جس جگہ دونوں کی حقیقت اور قوامِ ذات میں اتفاق ہو اور پھر دونوں میں اختلاف پایا جائے تو منشاے اختلاف کوئی ایسا امر ہوگا جو حقیقتِ ذات سے خارج ہے اور اسے عارض ہے۔اسی کو اختلافِ عَرضی کہتے ہیں۔ایسی دو مختلف موجود میں اتفاق کی صورت یہ ہے کہ وہ امرِ خارج جو اُوسے عارض ہے،زائل ہو جائے یا زائل کر دیا جائے۔جوں ہی امرِ خارج کا اِندفاع ہوگا،ذاتی اتفاق ایک کو دوسرے سے متحد بنا لے گا۔

لیکن اگر دو چیزوں میں اختلاف باعتبارِ ذات اور قوامِ حقیقت پایا جاتا ہے تو جب تک

ان دونوں کی ذات قائم ہے،اُوس اختلاف کا مٹنا ناممکن ہے۔دو متغائر فی الذات کبھی اپنی حقیقت اور لَوازِم میں متحد نہیں ہو سکتے۔تضاد وتغائرِ ذاتی کا یہی اِقتضا ہے۔

ہاں! ان دونوں کا اتحاد اگر ہوگا بھی تو منشا اس کی ذات نہ ہوگی بلکہ کوئی امر خارج از ذات ہوگا۔جب تک وہ امرِ خارج ان دونوں میں موجود ہے،دونوں متفق ومتحد ہیں۔اور جہاں وہ خارج زائل ہوا یا زائل کیا گیا،پھر ذات اپنی مقتضیات ولَوازِم کی طرف رجوع کر جائے گی۔

غرض اختلافِ عَرضی میں اس خارج کا اور عارض کا زوال اتفاق کا موجب ہے۔اور اختلافِ ذاتی میں اس امرِ خارج اور عارض کا بقا اِتفاق کا موجب ہے۔''الخ (ص:۵و۶، **الرَّشاد**،مؤلفہ مولانا سید سلیمان اشرف،مطبوعہ علی گڑھ۔۱۳۳۹ھ/۲۱۔۱۹۲۰ء)

مسٹر گاندھی کے اِیما پر شروع ہونے والی تحریکِ تَرکِ موالات کے قوم پرست ہندو مسلم زُعَما اور تحریکِ خلافت کے داعی عُلما وقائدین،مسلمانانِ ہند کے مذہبی جذبات مشتعل کرنے کی حکمتِ عملی میں کامیاب ہوئے اور مسلم قائدین نے اپنی بے بصیرتی سے گاندھی کو زمامِ قیادت سپرد کر دی،جسے ہندوستان کی مسلم تاریخ کا ایک المیہ ہی کہا جائے گا۔

بہر حال! جب سیاسی مقصد کی تکمیل کا وقت آیا تو مسئلۂ خلافت پسِ پشت چلا گیا۔ اور اس سے بے نیازی کے ساتھ سیاسی زُعَما اپنے اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو کر سرزمینِ ہند کے غاصِب وقابِض وحاکم انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور پھر زور وشور کے ساتھ تحریکِ آزادیِ ہند شروع ہو گئی کیوں کہ ان کے خیال وپروگرام کے مطابق دونوں تحریکوں (تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات) کی مشترکہ سیاسی اَساس ہی ''انگریز دشمنی'' تھی۔

دینی فکر وبصیرت رکھنے والے عُلماے کرام سمجھ رہے تھے کہ سیاسی وجوہ سے انگریزوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریکِ عدمِ اشتراکِ عمل وعدمِ تعاون میں جذباتی شرکت کا نتیجہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہلِ وطن کی اکثریت کے ساتھ یہ اتحاد خدانخواستہ ادغام وانضمام کی صورت اختیار کر لے اور اس کا بھی اِمکان ہے کہ اگر تحریک میں شامل عُلما ومسلم قائدین کی ہندو نوازی اور ان کی اِطاعت گذاری کا یہی جذبہ اور ماحول برقرار رہا تو انگریزوں سے اِنتقالِ اِقتدار کے وقت مسلمان مُنہ دیکھتے رہ جائیں گے اور ہندو لیڈر سب کچھ اُڑا لے جائیں گے۔

مذکورہ حقائق کے پیشِ نظر مسلم شناخت اور مسلم مفاد کا تحفظ ہر لمحہ ضروری تھا اور ضروری

ہے۔اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ مسلمان اول و آخر مسلمان اور صرف مسلمان ہے۔اس کے ساتھ یا اس کے بعد پھر کچھ اور ہے۔اور اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان بیک وقت مسلمان اور ہندی یا افغانی یا چینی یا ایرانی یا تُرکی یا عربی ہے۔

لیکن یہاں رنگ کچھ اور ہی تھا۔مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔مولانا حسرت موہانی مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، وغیرھُم سب اُسی دھارے میں بَہے جا رہے تھے جس کی طرف گاندھی کا اشارہ ہوتا تھا۔ اِفراط وتفریط کا عجب عالم تھا۔

تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے بیشتر عُلما اور تقریباً سبھی قائدین نے مسلمانانِ ہند کو جذباتی سیلاب میں بہایا اور شرعی حُدود کو تجاوز کیا۔اُس وقت اس طرح کے فتاویٰ جاری ہو رہے تھے کہ اُن کے حامی و ہم نَوا مسلمان ''ہندومسلم اتحاد'' کی رَو میں بہتے گئے اور لیڈرانِ قوم اُن کا اِستحصال کرتے چلے گئے۔

اس پوری تحریک کی قیادت گاندھی نے کی اور دو تین سال کے اندر ہی ۱۹۲۲ء میں چَورا چَوری (گورکھ پور) حادثہ کے بعد گاندھی کی حکمتِ عملی جب تبدیل ہوئی اور ۱۹۲۴ء میں انھوں نے نان کوآپریشن موومنٹ/تحریکِ عدمِ تعاون ختم کرنے کا باضابطہ اعلان کیا تو پھر عُلما و زُعَماے خلافت وتَرکِ موالات کے مذہبی فتاویٰ بھی سَرد خانے کی امانت بن گئے۔

اجتناب از نقضِ امن و اِتباعِ شریعت کی شرط کے ساتھ (شیخُ الھند) مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) نے ۳/ذوالقعدہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء میں یہ فتویٰ جاری کیا:

''اَعداے اسلام کے ساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً اور عملاً ترک کر دیں۔اس مسئلہ کی شرعی حیثیت نا قابلِ انکار ہے اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہ ہی اِقتضا ہونا چاہیے کہ وہ:

(۱) سرکاری اِعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے (۲) ملک کی جدید کونسلوں میں

شریک ہونے سے انکار کر دے (۳) صرف اپنی ملکی اَشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔'' (ص:۳۱۶۔حصہ دوم نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔مکتبہ دینیہ، دیو بند۔۱۹۹۹ء)

یہی فتویٰ جمعیۃ عُلماے ہند کے متفقہ فتویٰ کی صورت میں تقریباً پانچ سو (۵۰۰) عُلما کے دستخط سے شائع کیا گیا۔(ص:۳۱۷۔حصہ دوم۔نقشِ حیات)

مولانا حسین احمد مدنی سابق صدر جمعیۃُ العُلماء ہند وَ شیخُ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) لکھتے ہیں:

''ملک کے تمام اھلُ الرائے ہندو اور مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی رائے قبولیتِ عامّہ حاصل کر چکی تھی۔

حضرت شیخُ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے تَرکِ موالات کے متعلق طلباے یونیورسٹی (علی گڑھ) نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تَرکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلباے مسلم یونیورسٹی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

گورنمنٹ سے قطعِ تعلق کر لیں اور تمام کالج اور اسکول کی گورنمنٹی امداد چھوڑ دیں اور اگر کالجوں اور اسکولوں کے زُعَما ایڈ نہ چھوڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل جائیں۔نیز ملازمانِ حکومتِ انگریزی اُن ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں جن میں حکومت کی امداد خالص طور پر ہوتی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔(ص:۳۱۴۔حصہ دوم۔نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔مطبوعہ مکتبہ دینیہ، دیو بند۔۱۹۹۹ء)

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ عُلمائے ہند کے تاسیسی اجلاس منعقدہ دہلی کا خطبۂ صدارت مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی نومبر ۱۹۲۰ء) کی جانب سے انھیں کے حکم پر مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) نے لکھا اور چھپوایا جسے مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی (متوفیٰ ۱۳۶۹ھ/دسمبر ۱۹۴۹ء) نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔

عُلماے حق از مولانا سید محمد میاں (دیوبندی) ناظم جمعیۃ العُلماء کے حوالہ سے مولانا حسین احمد مدنی اسی خطبۂ صدارت از مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حضرت شیخُ الھند کا خطبۂ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا مگر عُلمائے مِلّت اور مِلّی سیاست کے تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے مکمل اور کافی تھا۔حضرت شیخُ الھند کے اس خطبۂ صدارت نے عُلمائے مِلّت کو مندرجہ ذیل اصول ونظریات کی ہدایت فرمائی:

(۱) اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے تَرکِ موالات فرض ہے۔

(۲) تحفظِ مِلّت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہم دردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکریہ ہیں۔

(۳) اِستخلاصِ وطن کے لئے برادرانِ وطن سے اِشتراکِ عمل جائز ہے مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رَخنہ واقع نہ ہو۔

(۴) اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال مدافعتِ اَعْدا کے لئے جائز ہوسکتا ہے باوجودیکہ قُرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی تأمل نہ ہوگا۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لئے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز نہیں ہیں، یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔'' (صفحہ ۱۶۔ خطبۂ صدارت۔ مطبوعہ مطبع قاسمی دیو بند)

حضرت شیخُ الھند کی اِختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔اس کے چند جملے بِلفظِہٖ درج ذیل ہیں:

'' کچھ شبہ نہیں کہ حَق تَعالیٰ جَلَّ شَانُہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیرُ التَّعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کے لئے مُؤیِّد بنادیا ہے۔

اور میں اِن دونوں قوموں کے اتحاد واتفاق کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عَمایدنے کی ہیں اور کررہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گی۔''

(ص:۳۲۲ حصہ دوم، نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی۔ مکتبہ دینیہ، دیو بند۔۱۹۹۹ء)

۱۱/ جمادی الآخرہ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کو بریلی کے ایک عظیم الشان اِجلاس میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا ایک نہایت اہم پیغام پڑھ کر ہزاروں مسلمانوں کو سنایا گیا جس کا یہ حصہ ایک رہنما اصول کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا:

''میں اعلان کے ساتھ کہہ چکا اور کہتا ہوں کہ:

سلطنتِ اسلام، نہ سلطنت بلکہ ہر جماعتِ اسلام، نہ جماعت بلکہ ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔کون سا مسلمان ہوگا کہ اَماکنِ مقدسہ کی حفاظت نہ چاہے گا؟ مگر دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔اور ان کا تَرک، عقل ونقل دونوں سے خُروج ہے۔

اول:۔یہ کہ ہر فرض ہمیشہ بقدرِ قدرت ومَشروط باستطاعت ہے۔قرآنِ عظیم جا بجا شاہِد ہے کہ اللہ تعالیٰ وُسعت سے زائد کسی کو حکم نہیں دیتا۔

ایسی تحریکیں جو قدرت سے باہر ہیں اور ان کا نتیجہ یہاں کے مسلمانوں کی تباہی ہے، اسلام ومسلمین کی خیر خواہی نہیں، صریح بدخواہی ہے۔

دوم:۔اسلام کی تائید کبھی اللہ وقرآن اور رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہِ وسَلَّم کو پیٹھ دے کر نہیں ہوسکتی۔

مُشرکین سے اتحاد، ان سے وداد، ان سے اِستعانت واِستمداد، ان سے موافقت واِنقیاد جس کی ہَوا چل رہی ہے، قطعی حرام ومخالفتِ اسلام ہے اور اس کے سبب دین پر سخت آفت آئے گی۔'' الخ۔

(ص۵۰۰۔حیاتِ اعلیٰ حضرت مکمل۔مؤلّفہ مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی۔مطبوعہ مکتبہ نبویہ، گنج بخش روڈ، لاہور)

تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادیِ ہند میں کس طرح تبدیلی ہوئی یا تبدیلی کردی گئی؟ اسے سمجھنے کے لئے مولانا آزاد کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیں:

''مسئلۂ خلافت کا اصل حَل ہندوستان کی آزادی پر موقوف تھا۔اس لئے تحریکِ خلافت نے خود بخود ملک کو تحریکِ آزادی تک پہنچادیا۔''

(ہفت روزہ پیغام۔جلد۱۔نمبر۱۔جمعہ ۲۰/محرمُ الحرام ۱۳۴۰ھ/۲۳/دسمبر ۱۹۲۱ء۔مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار پیغام۔مرتّبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری۔مطبوعہ پٹنہ ۱۹۸۹ء)

خلافت وموالات کے کاندھے پہ سوار ہوکر آزادیِ ہندوستان کی منزل کی طرف اتنی تیز گامی کے ساتھ گاندھی کی قیادت میں سفرِ آزادی شروع ہوا کہ شعائرِ اسلام واَحکام شریعت کے تحفظ کے جذبات سَرد ہوکر رہ گئے اور بےاصولی وبےاعتدالی کا نتیجہ یہ نکلا کہ **الامان والحفیظ** کی صدائیں قلبِ مومن سے بلند ہونے لگیں۔

اس دور میں جو ناکردنی ہوئی اس کی حضرت مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء) نے اپنے خطبۂ صدارت، اجلاسِ انصار الاسلام۔ بریلی منعقدہ شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں اِس طرح نشان دہی فرمائی ہے:

(۱) قَشقہ لگوانا (۲) مشرکین کی جَے پکارنا (۳) رام لچھمن پر پھول چڑھانا (۴) رامائن (پڑھنے) میں شریک ہونا (۵) کندھوں پر اَرتھی اٹھا کر مَرگھٹ تک جانا (۶) مسجد میں مُشرِکوں کے لئے دعاے مغفرت کرنا (۷) دَسہرے میں شریک ہونا (۸) سَنکھ بجانا (۹) قربانی کی گائے چھین کر گئوشالہ پہنچانا (۱۰) اللہ کو رام کہنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

(ملخّصاً، ص: ۲۹ و ۳۰، خطبۂ صدارت از سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی۔ مطبع صبحِ صادق۔ سیتاپور۔ ۱۹۲۱ء)

❑❑❑

فلسفۂ گاندھی اور ’’سَوَراج‘‘

ایک مَربوط لائحۂ عمل کے ذریعہ ۱۹۲۰ء اور اس کے بعد سالہا سال تک ہندوستان کو جس راہ پر لے جانے کی اسکیم تھی اور جس کے لئے آج بھی ایک منظّم طبقہ (ہندو مہا سبھا وآر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد وبجرنگ دل وغیرہ) شب وروز کوشاں ہے، اسے سمجھنے اور مسلم دشمن عناصر کے نظریات وعزائم کی تہ تک پہنچنے کے لئے کچھ تاریخی حقائق یہاں پیش کیے جارہے ہیں:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی قائم کردہ ’’جماعت رضاے مصطفیٰ‘‘ (تشکیل در ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے زیر انتظام ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا حشمت علی لکھنوی ثم پیلی بھیتی (وصال ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) نے کہا تھا کہ:

............اسلام و مسلمین کو مٹانے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے دعوے ہیں کہ:

ساڑھے سات کروڑ ملیچھ مسلمانوں کو جلد از جلد ہندو بنالو۔ اور اگر یہ ہندو نہ ہوں تو انہیں بھارت وَرش سے نکال دو۔

وہ کہتے ہیں کہ: ہم کعبہ کی چھت پر جا کر ’’اُوم‘‘ کا جھنڈا گاڑیں گے۔‘‘

(ص: ۳۰، ’’تقریرِ مُنیرِ قلب‘‘ (۱۳۴۲ھ/۱۹۲۲ء) مطبوعہ یونائیٹڈ پریس، لکھنو، ۱۹۲۲ء)

۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنا رشتہ پیارے اسلام سے جوڑو، مشرکین سے اپنا تعلق توڑو۔ کیا اب اُس وقت کا انتظار ہے جب اسلام کا لہلہاتا ہوا باغ۔ خدا نہ کردہ۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے اُجاڑ ڈالا جائے؟ اس کی بُلبلوں کو ذبح کرڈالا جائے؟ اس کے غنچوں کو مَسَل کر پھینک دیا جائے؟ اس کے پھول پتّیاں سب ایک دم کُملا جائیں؟

اُٹھو! اللہ پھر رسول جَلَّ وعَلَا وصَلّی اللّٰہُ تعالیٰ علیہِ وسَلّم پر بھروسہ کرکے دینِ الٰہی کی حمایت کے لئے کمرِ ہمت چُست باندھو۔

آج اَعدا اے دین تمہارے مذہبِ اسلام کو مٹانے کے لئے، سونے چاندی کو پانی کی طرح بَہا رہے ہیں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔'' (ص:۲۲و۲۳ ''تقریرِ مُنیر قلب،'' مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۲ء)

حضرت مفتی محمد عمر نعیمی مرادآبادی (وصال ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) تلمیذِ صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) سوراج کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سوراج'' کے معنی یہ ہیں کہ اِس ہندوستان سے ہر اُس شخص کو نکال دیا جائے جس کو ہندو اپنے خیال میں غیر ملکی سمجھتے ہیں۔ یا تہِ تیغ کر دیا جائے۔ دین وملّت سے مُرتد کر کے غلام بنا لیا جائے اور اَچھوت قوموں کی طرح کتّوں اور مُوذِی جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

یہ ''سوراج'' آریہ قوم کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔'' (ص:۹ ماہنامہ اَلسَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔ شمارہ ربیعُ الاول ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء)

''خدا نہ کرے ایسا منحوس ''سوراج'' کا وقت کبھی آئے، ورنہ مسلمانوں کی وہی حالت ہوگی جو ہندوؤں نے اپنے عہدِ حکومت میں ہندوستان کی قدیم قوم کی کر رکھی تھی۔ بلکہ تجویز تو یہ ہے کہ:

جس طرح بُودھ مَت کو ہندوؤں نے ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا اسی طرح مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیں۔

ہندوؤں کی یہ تمنا پوری نہیں ہو سکتی اگر مسلمانوں میں سے زَرخرید لوگ ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو گمراہ نہ کریں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔مسلمانانِ ہند کو ہوشیار ہونا چاہیے، خاموشی اور سُستی کا وقت نہیں ہے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایسی جماعتوں سے بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کریں کہ یہ

لوگ مسلمانوں کے نمائندے نہیں اور مسلمان ان کی آواز سے متفق نہیں ہیں۔'' (ص:۱۳۔ ماہنامہ اَلسَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔ شمارہ محرمُ الحرام ۱۳۵۰ھ)

شری آچاریہ کرپلانی (جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی) صراحت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ:

''یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کانگریس کی ہر اسکیم گاندھی جی کے فلسفہ کے ماتحت چلائی جائے گی۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ کسی اسکیم کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے اصول پر چلا سکیں۔

کانگریسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفۂ زندگی پر نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ فلسفۂ زندگی دنیا کے کسی اور فلسفۂ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جا سکتا۔۔۔۔۔۔

بہر حال! گاندھی جی کا فلسفۂ زندگی ایک ایسا فلسفہ ہے جس سے اِجتماعاً بھی قوم صحیح رہبری حاصل کر سکتی ہے اور فرداً فرداً اَشخاص بھی اس سے سیدھا راستہ پا سکتے ہیں۔'' (اخبار مدینہ، بجنور، شمارہ ۱۷راگست ۱۹۳۹ء)

''گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں۔ بلکہ سب سے ضروری یہ ہے کہ ہم تمام جدو جہد کی بنیاد کسی اپنے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔'' (اخبار مدینہ، بجنور، شمارہ ۱۷راگست ۱۹۳۹ء)

۲رجون ۱۹۲۰ء کے ایک جلسۂ خلافت کمیٹی الٰہ آباد کی رپورٹ کے مطابق مولانا شوکت علی برادرِ مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ:

الٰہ آباد میں ایک ایسا فیصلہ صادر کیا گیا ہے جو ایثار ورفاقت کی اِسپرٹ کو اِن شاءَ اللّٰہ ترقی دے گا۔

بلکہ ایک نئے مذہب کو، جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز موقوف کرتا ہے اور پریاگ وسنگم کو ایک مقدس علامت بناتا ہے۔'' (اخبار، ہمدم، لکھنؤ، شمارہ ۸رجون ۱۹۲۰ء)

لالہ ہر دیال (ایم اے) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

''ہنود کا اسلام سے ہرگز اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تمام مسلمانوں کو ہر جائز و ناجائز

کوشش سے ہندو بنا کر ہنود کے کسی نہ کسی فرقے میں داخل کرلو۔ اور اس طرح ''سوراجیہ'' حاصل کرلو اور بھارت وَرش کو تمام غیر ہندوؤں سے پاک اور شُدھ کرلو۔

اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو پہلے ''سوراجیہ'' حاصل کرلو، اور ہندو ریاست قائم کرکے پھر سلطنت کے رُعب، جاہ وحشم کی تخویف اور زَر کی لالچ سے تمام مسلمانوں کو گمراہ کرکے ہندو بنالو۔'' (اخبار ملاپ، لاہور، ۱۹۲۵ء۔ اخبار زمیندار، لاہور۔ ۱۹۲۵ء۔ اخبار تنظیم، امرتسر ۱۹۲۵ء)

صدرُ الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) فرقہ پرست ہندو لیڈروں کے عزائم وَاشگاف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ہندو نادان نہیں، ان کی کوئی حرکت عَبَث و بےکار نہیں۔ وہ ہر کام کے لئے کوئی مقصد رکھتے ہیں۔ ان کا ہر عمل اس مقصد کے محور پر گردش کرتا ہے۔ جب تم نے انہیں پیشوا بنایا ہے، تو وہ اپنے مقصد کو مقدّم رکھیں گے۔'' (ص:۱۷، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔ شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

''میں صِرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ:

تَرکِ تعاون کا خیال مسٹر گاندھی کے دماغ میں مدتِ دراز سے مرکوز ہے۔ ان کے کارنامۂ زندگی سے اس کے دلائل ملیں گے لیکن وہ اپنے اس مقصد میں اپنی خواہش کے موافق کامیابی سے محروم رہے ہیں۔'' (ص:۱۹، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم مرادآباد۔ شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

ایک طرف تو مسٹر گاندھی مسلمانوں سے یہ خطاب کرتے ہیں کہ:

''تمہارے مطالبات بالکل بجا ہیں اور تم حق بجانب ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

دوسری طرف مسٹر گاندھی لب ولہجہ بدل کر یہ فرمادیتے ہیں کہ:

''دیکھو! خبردار! قانون کی حُد دو سے قدم باہر نہ رکھنا۔ امنِ عامّہ میں خلل اندازی سے باز رہنا، ورنہ میں تمہارے ساتھ نہیں۔''

اس سے گورنمنٹ کو مسلمانوں کی شوریدہ سَری اور قانون شکنی اور امنِ عامّہ میں فساد انگیزی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں۔

اور اپنے آپ کو امنِ عامّہ اور قانون کا حامی ظاہر کرتے ہیں۔'' (ص:۲۰، ماہنامہ

السَّوادُ الاعظم، مرادآباد، شمارہ شوال ۱۳۳۸ھ)

مفتی محمد عمر نعیمی مرادآبادی (وصال ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) شاگردِ حضرت مولا محمد نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) لکھتے ہیں:

''گذشتہ زمانے میں تحریک ''سوراج'' نہایت زور وشور سے چلی اور ملک نے عاقبت بینی اور دور اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر ایک غوغا مچادیا اور مدہوش ہو کر ایسے غیر عاقلانہ افعال کیے جن کے تلخ ثمرات اب تک اٹھانے پڑ رہے ہیں۔

''سوراج'' کے معنی ہندو راج تھے، اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو حکومت سے لڑوانے کے لئے مورچہ پر رکھ لیا تھا۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ سے مقابلے کے لئے جو تحریک چلی تھی اس کا نام عربی ''تَرکِ موالات'' تجویز کرکے یہ بات گورنمنٹ کے خاطر نشیں کرنی چاہی تھی کہ حکومت سے جنگ ومقاطعہ مسلمانوں کی طرف سے ہے۔

اور حکومت کے لئے جو لفظ تجویز کیا تھا وہ اپنی پرانی غیر رائج زبان کا لفظ ''سوراج'' تھا جس کا مطلب تھا کہ حکومت کے مستحق تو ہندو، اور بھینٹ چڑھانے کے لئے مسلمان۔

کتنے مسلمان ان ہنگاموں میں مارے گئے، کتنے اپنے اختیار سے بے روزگار ہوگئے، ان کی معاش خراب ہوگئی، اور ہندوؤں نے ان کی جگہ قبضے جمائے، طالب علموں نے اسکول چھوڑ دیے۔

اور پھر چلتے چلاتے ہجرت کا ایک شوشہ چھوڑ کر کتنے ہی کو بے خانماں کردیا، اور اس ''سوراج'' کی بدولت مسلمانوں نے وہ ناکردنی افعال کیے کہ خدا کی پناہ۔'' (ص:۱۲، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم مرادآباد۔ شمارہ ربیعُ الاول، ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء)

۳؍ تا ۵؍ مئی ۱۹۳۰ء امروہہ (مرادآباد) میں جمعیۃُ العُلماء ہند کی سہ روزہ کانفرنس ہوئی جس میں شرکت کے لئے مفتی کفایت اللہ دہلوی صدر جمعیۃُ العُلماء ہند (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کے متعدد خطوط مع دعوت نامہ صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) کے پاس پہنچے۔ کانگریس کے مکمل تعاون اور سِوِل نافرمانی وغیرہ سے متعلق کئی قراردادیں اس کانفرنس میں پاس ہوئیں۔

مفتی کفایت اللہ دہلوی کے مکتوب اور دعوت نامہ کے جواب میں صدرُ الافاضل مولانا

محمد نعیم الدین مرادآبادی نے تحریر فرمایا:

''عنایت فرمائے مَن جناب مولوی محمد کفایت اللہ صاحب، صدر جمعیۃ العلماء ہند۔
ماھُوَ المَسْنُون کے بعد۔

گذارش ہے کہ میرے پاس جناب کے خطوط اور دعوت نامے پہنچے۔ میں جناب سے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ:

آپ اس کا اِحساس فرمائیں کہ گذشتہ تجربوں نے یقین دلا دیا ہے کہ:

ہندو، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو ''سوراج'' سے زیادہ عزیز جانتے ہیں۔ انہیں کسی طرح گوارہ نہیں کہ سرزمینِ ہند میں مسلمانوں کا وجود رہے۔

اگر یہ تجربے نہ ہوتے تو بھی مسلمانوں کو قرآنِ پاک پر یقین ہے۔ مشرکین کی شِدَّتِ عداوت قرآنِ پاک میں وارِد ہے۔ ان سے نفع کی امید اور وفاداری کی توقع خیالِ باطل ہے۔

............آپ جمعیۃ کو ایسے طریقِ عمل سے بچایئے، جو گاندھی کی تحریک کے ہم معنی یا اس کی تائید ہو۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا گیا تو علاوہ ان مصائب کے جو ہندو پرستی کی بدولت اٹھانے پڑیں گے۔ مسلمانوں کی جماعت کے انتشار اور ان کے اس نئے اختلاف کا وَبال بھی آپ کی گردن پر ہوگا جو اس نئی تحریک سے پیدا ہوگا۔'' (ملتقطاً ص:۲۹، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔ شمارہ ذوالقعدہ، ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء)

یہاں ایک تاریخی حقیقت قارئین کے علم میں رہنی چاہیے کہ جمعیۃ العلماء کی طرف سے کانگریس کی مسلسل حمایت اور اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی وفاداری نے اسے تقسیم کے دہانے تک پہنچا دیا۔ چنانچہ مولانا عبدالحامد قادری بدایونی (وصال ۱۹۷۰ء) اس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''دہلی کی جمعیۃ علمائے ہند جسے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۹۲۶ء) اور مولانا محمد علی جوہر (م ۱۹۳۱ء) اور حضرت مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی (م ۱۹۳۱ء) **رحمۃُ اللّٰہ علیہم** کے مقدّس ہاتھوں قائم ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے قیام کی غرض فقط یہ تھی کہ:

سیاسی جماعتوں اور ان کے سیاسی مسائل کو شریعتِ مطہّرہ کی روشنی میں جانچا جائے اور مذہبی احکام کے ساتھ حضراتِ علما، مسلمانوں کی سیاست میں رہنمائی فرمائیں۔

افسوس کہ یہ جماعت مشرکینِ ہند کی دوستی کی بدولت مسلمانانِ ہند سے کٹ کر کانگریس کی آغوش میں جا پڑی۔

یہی سبب تھا کہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی و مولانا محمد علی جوہر نے ''توسیعِ نظامِ علما'' اور اس کے بعد ''جمعیۃ عُلماء کان پور'' قائم کی جس میں ہندوستان کے ہر گوشہ کے علما و مشائخ نے امداد و اِعانت فرمائی۔'' الخ

(اخبار دبدبۂ سکندری، رام پور۔ شمارہ ۵/ستمبر ۱۹۴۵ء)

''سوراج'' کا نظریہ آج بھی باقی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا اظہار فرقہ پرست ہندو و لیڈران کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک مسلم دشمن لیڈر شری سُبرامنیم سوامی نے ۲۰۱۱ء کے اپنے انگریزی مضمون میں کچھ اس طرح لکھا ہے کہ:

مسلمان دہشت گرد ہیں۔ انہیں سبق سکھانے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کو مل جُل کر یہ کام کرنا چاہیے۔ ان کی مسجدوں کو مسمار کر دینا چاہیے۔ جو مسلمان اپنے آبا واَجداد کو ہندو نہ مانیں انہیں ووٹ کے حق سے محروم کر دینا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ (DNA، بمبئی، جولائی ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆

تحریکات کے اَثرات ونتائج

تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات وہجرت کے اَثرات ونتائج کے بارے میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ مِلّیہ اسلامیہ، نئی دہلی) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''جنگ کے بعد جب ۱۹۱۹ء کے وسط میں خلافت کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی اور نومبر میں اس کا عام اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو ہندوستانی مسلم قیادت نے بڑی سمجھداری سے اس کا صدر مہاتما گاندھی کو بنادیا۔ رُولٹ ایکٹ کے خلاف جدوجہد میں مسلمانوں نے پورے خلوص سے اور مؤثر طور پر حصہ لیا تھا اور عدمِ تعاون کی تحریک میں دل وجان سے شامل ہوکر دونوں مِلّتوں نے اتحاد کے رشتے مضبوط کیے تھے۔'' (ص۶۲۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء)

''قوم پرور عُلما نے جمعیۃ العُلماءِ ہند قائم کی اور اس تنظیم کا پہلا پبلک اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں منعقد ہوا............اس کے بعد کے سال میں ایک ایسی تباہ کن غلطی ہوئی جس نے بتادیا کہ بے روک ٹوک مذہبی جوش وخروش کہاں لے جاسکتا ہے۔

یہ خیال پیش کیا گیا کہ اگر انگریزوں نے تُرکی کے سلطان کے ساتھ جو خلیفہ بھی تھا انصاف نہ کیا تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ہجرت کرکے قریب ترین دارُالامن یعنی افغانستان چلے جائیں۔

اس ہوش رُبا تجویز کو تسلیم کرلیا گیا اور مولانا عبدالباری (فرنگی محلی) نے ہجرت کی حمایت میں فتویٰ جاری کردیا۔

کوئی اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کا فیصلہ کرکے اپنی ساری جمع پونجی فروخت کر ڈالی۔ ابھی اور لوگ بھی ہجرت کے لئے کمر باندھ رہے تھے کہ افغانستان حکومت نے مہاجرین کے داخلے پر پابندی عاید کردی۔ اٹھارہ ہزار خاندان تو گویا بالکل تباہ ہوگئے۔

جو لوگ یہ مصائب جھیل کر اپنے گھروں کو واپس آنے میں کامیاب ہوگئے، ان کی تکلیفیں کم کرنے کے لئے خلافتیوں نے حتی الوسع کوشش کی لیکن یہ واقعہ یہ سبق نہ دے پایا کہ مذہبی وَلوَلے کو سنجیدہ سوچ کی بھٹّی میں تپانا ضروری ہوتا ہے۔'' (ص۵۷۳۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ مطبوعہ نئی دہلی)

ذہن نشین رہے کہ تحریکِ خلافت کے سرگرم کارُکن قاضی محمد علی عباسی کی یہ تحریر شہادت گذر چکی ہے کہ ھجرت کا فتویٰ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے نہیں دیا تھا بلکہ اس کے ''مفتی اعلیٰ'' مولانا ابُوالکلام آزاد تھے۔

''عدمِ تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی۔ اس سے کتنی بدظنی پھیلی اور انتشار پیدا ہوا اس کا اندازہ فسادات کی اس تعداد سے ہوسکتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں پھوٹ پڑے۔ ۱۹۲۳ء میں گیارہ۔ ۱۹۲۴ء میں آٹھ۔ ۱۹۲۵ء میں سولہ۔ ۱۹۲۶ء میں ۳۵۔ (ص۶۲۶۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

''عدمِ تعاون کی تحریک ۱۹۲۲ء میں واپس لی گئی تو اُن سب کو اس سے زبردست صدمہ پہنچا جو اس میں شریک تھے۔ مسلمانوں کے لئے خاص طور پر یہ بات بہت تباہ کن ثابت ہوئی۔

انھوں نے مذہبی بنیاد پر غیر مشروط فیصلے کیے تھے اور ان کی طرف سے رہنماؤں نے تحریک کی واپسی کے جو اعلان کیے ان میں کوئی مذہبی وجوہ نہیں تھے۔'' (ص:۶۲۴۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

''ایک دَور ایسا تھا جب اسٹیج پر مولانا محمد علی چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں وہ مہاتما گاندھی کے اتنے قریب تھے جتنے اور کوئی سیاسی رہنما کسی وقت ہوسکتے تھے۔ لیکن جب

۱۹۲۳ء میں وہ جیل سے باہر آئے اور ملک کی صورتِ حال کا مطالعہ کیا تو انھیں مجبوراً مہاتما گاندھی کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔

انھوں نے ہندوؤں کی جارحیت اور لڑاکا پن کے خلاف مسلمانوں کے غم و غصہ کی نمائندگی شروع کردی۔'' (ص ۶۲۷۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب)

''۱۹۲۳ء کے بعد جب مولانا محمد علی مہاتما گاندھی سے دور ہونے لگے تو صرف ایک مِلّت کے ایسے لیڈر ہوکر رہ گئے جن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کل کیا کریں گے؟

...........اپریل ۱۹۳۰ء میں بمبئی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس ہوئی اُس میں مولانا محمد علی جوہر نے اعلان کیا کہ:

مسلمان برطانوی غلبہ نہیں چاہتے لیکن وہ ہندو غلبہ بھی نہیں چاہتے۔ اور وہ مسٹر گاندھی کی تحریک (نمک ستیہ گرہ) میں حصہ نہیں لے سکتے۔ کیوں کہ:

''اس تحریک کا مقصد ہندوستان کے لئے آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ''ہندو مہاسبھا'' کا غلام بنانا ہے۔''

مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہی محسوس کرتی تھی اِس لئے انھوں نے مولانا محمد علی کی خوب خوب تعریف کی کہ انھوں نے ان کے جذبات کو پوری وضاحت اور شدّ و مد کے ساتھ پیش کردیا تھا۔ لیکن انصاف کا تقاضہ یہ کہنے پر مجبور بھی کرتا ہے کہ:

دوسری طرف ایسے رَجعَت پسند ہندو بھی تھے جو قومی اِحیا کا مطلب ہی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو دَبایا جائے۔'' (ص ۶۲۸۔ ہندوستانی مسلمان از پروفیسر محمد مجیب۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو۔ نئی دہلی)

مولانا نذیر احمد خَجندی میرٹھی کے اِستفتا محرَّرہ محرمُ الحرام ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء مُرسَلہ از ممبئی کے جواب میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی تحریر فرماتے ہیں:

''ہر سلطنتِ اسلام، نہ صرف سلطنت ہر جماعتِ اسلام، نہ صرف جماعت ہر فردِ اسلام کی خیر خواہی ہر مسلمان پر فرض ہے۔

قال رسولُ اللّٰہ ﷺ : اَلدِّینُ اَلنُّصح لِکلِّ مُسلم۔

رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

دینِ اسلام ہر مسلمان کی خیر خواہی کا نام ہے۔''

مگر ہر تکلیف بقدرِ استطاعت اور ہر فرض بقدرِ قدرت ہے۔ نامقدور بات پر مسلمان کو اُبھارنا جو نہ ہو سکے اور ضَرَر دے اور اسے فرض ٹھہرانا شریعت پر اِفترا اور مسلمانوں کی بدخواہی ہے۔

قالَ اللّٰہُ تعالیٰ: لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔

و قال اللّٰہُ تعالیٰ: فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

پھر خیر خواہی اسلام، حُدُودِ اسلام میں رہ کر ہے۔ مشرکین سے اتحاد وموالات اور ان کے راضی کرنے کو شعائرِ اسلام کی بندش، مشرک لیڈروں کو اپنے دین کا ہادی و رہبر بنانا، مشرک لیکچرر کو مسلمانوں کا واعظ ٹھہرانا، اسے مسجد میں لے جا کر جماعتِ مسلمین سے اونچا کھڑا کر کے لیکچر دِلوانا، اپنے ماتھے پر مُشرکوں سے قشقے لگوانا، مُشرکوں کے مجمع میں مُشرک لیڈروں کی جے پکارنا، مشرک لیڈروں کی ٹِکٹی اپنے کندھوں پر اُٹھا کر مَرگھٹ میں لے جانا، مساجد کو مشرک کا ماتم گاہ بنانا، اس کے ماتم کے لئے مساجد میں سر برہنہ ہونا، اس کے لئے نماز و دُعاے مغفرت کا اِشتہار دینا، قرآنِ مجید اور رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر دونوں کی پوجا کراتے ہوئے مندر میں لے جانا،

......صاف لکھ دینا کہ: ہم نے قرآن وحدیث کی تمام عمر بت پرستی پر نثار کردی۔

صاف لکھ دینا کہ: اگر آج تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کرلیا تو اپنے خدا کو راضی کرلیا۔

صاف لکھ دینا کہ: ہماری جماعت ایک ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہے جو کفر واسلام کا امتیاز اٹھادے گا۔

صاف لکھ دینا کہ: ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس مقام ٹھہرائے گا۔

یہ امور خیر خواہِ اسلام نہیں کُند چھری سے اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ یہ سب افعال واَقوال، ضلالِ بعید و کفرِ شدید ہیں۔ اور ان کے فاعل وقائل وقابل، اَعدائے دینِ حمید و دشمنانِ ربِّ مجید ہیں۔

اِتَّخَذُوا دِینَھُمْ لَھْواً وَلَعِباً — بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللّٰہِ کُفْراً — وَسَیَعلمُ الذینَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنْقَلِبٍ یَنْقَلِبُون۔

جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنالیا— اللہ کی نعمت ناشکری سے بدل دی— اور اب جاننا چاہتے ہیں ظالم کہ کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔'' (ص:۱۳۳۔۱۳۴۔ جلد۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم۔ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

''جو شخص حفاظتِ اسلام وسلطنتِ اسلام واَماکنِ مقدسہ کی اِستطاعت رکھتا ہے اور کاہلی سے نہ کرے، مُرتکبِ کبیرہ ہے۔
یا کفّار کی خوشامد وخوشنودی کے لئے، تو مُستوجبِ لعنت ہے۔
یا دِل سے ضَررِ اسلام پسند کرنے کے سبب، تو کافر ہے۔
اور جو اِستطاعت نہیں رکھتا، معذور ہے۔
شریعت اُس کام کا حکم فرماتی ہے جو شرعاً جائز اور عادۃً ممکن اور عقلاً مُفید ہو۔ حرام یا ناممکن یا عَبَث افعال حکمِ شرع نہیں ہوسکتے۔'' (ص:۴۱۶۔ جلد۱۴۔ فتاویٰ رضویہ مترجم مطبوعہ، لاہور)

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) نے اِسٹوڈنٹس یونین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو خطاب کرتے ہوئے طلبہ کو کچھ ہدایت کی۔ اس کے بعد کیا ہُوا اسے غور سے پڑھیں اور سمجھیں:

''دوسرے دن پھر اجتماع ہوا تو لڑکوں نے کہا کہ:

''ہم آپ ہی کو ہندوستان کا سب سے بڑا مُجتہد اور عالم سمجھتے ہیں۔''

تب مولانا نے کہا کہ:

جب مجھ کو تم لوگ مجاز سمجھتے ہو اور مجھ سے سوال کرتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ:

''حکومت سے عدمِ تعاون اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔

اور میں تم کو پکارتا ہوں کہ:
''کالج کی چہار دیواری سے باہر نکلو اور کالج کی تعلیم کا بائیکاٹ کرو۔'' (ص:۱۷۰۔ تحریکِ خلافت۔ از قاضی محمد عدیل عباسی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ طبعِ دوم ۱۹۹۷ء)

''حکومت سے تَرکِ موالات اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکانِ اسلام فرض ہیں۔'' (ص:۱۶۴۔ تبرکاتِ آزاد۔ از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء)

جناب احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر روزنامہ آزاد ہند، کلکتہ لکھتے ہیں:

''مدرسہ اسلامیہ کا اِفتتاح مسجد ناخدا (کلکتہ) میں مہاتما گاندھی نے ۱۳/دسمبر ۱۹۲۰ء میں کیا۔ اُس وقت مولانا (عبدالرزاق) ملیح آبادی اور مولانا (حسین احمد) مدنی میں ایسا رِشتۂ رفاقت واخوّت قائم ہوا کہ مَرتے دم تک باقی رہا۔'' (ص۵۔ بعنوان ''اکابر کی روایتوں کا امین''۔ ''فِدائے ملت نمبر'' روزنامہ ہندوستان اکسپریس، دریا گنج، نئی دہلی۔ شمارہ ۲۳/اپریل ۲۰۰۷ء)

حضرت مولانا احمد رضا قادری برکاتی بریلوی سے ۱۹۲۰ء میں اسی سلسلے میں دوسوالات اِستفتا کی شکل میں کیے گئے جن کا تفصیلی جواب آپ نے کتابی صورت میں دیا اور اَحکامِ موالات ومعاملات کو محقّقانہ طور پر تحریر فرما کر "المَحَجَّةُ المُؤتَمَنَةُ فی آیةِ المُمتَحَنَة (۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) تاریخی نام رکھا۔ جس میں اس اِفراط وتفریط کے بارے میں آپ لکھتے ہیں:

''غرض تَرکِ موالات میں اِفراط کی تو وہ کہ مجرَّد معاملت حرامِ قطعی۔ اور تفریط کی تو یہ کہ ہندوؤں سے وِداد واتحاد واجب۔ بلکہ ان کی غلامی واِنقیاد فرض بلکہ مدارِ ایمان۔ فَسُبحٰنَ مُقلّبِ القُلوبِ وَالاَبصَار۔

اول میں تحریمِ حلال کی، دوم میں تحلیلِ حرام۔ بلکہ اِفتراضِ حرام۔ اور ان دونوں کے حکم، ظاہر وطشت ازبام۔

لِلّٰہ انصاف! کیا یہاں اہلِ حق نے انگریزوں کو خوش کرنے کو مَعاذَ اللّٰہ مسلمانوں کو تباہ کرنے والا مسئلہ نکالا؟۔ یا ان اہلِ باطل نے مشرکین کو خوش کرنے کو صراحۃً کلامُ اللہ واَحکامُ اللہ کو پاؤں کے نیچے مل ڈالا؟

مسلمانوں کو خدا لگتی کہنی چاہیے۔ ہندوؤں کی غلامی سے چھڑانے کو جو فتاویٰ عُلماے اہلِ سُنّت نے دیئے، کلامِ الٰہی واحکامِ الٰہی بیان کیے، یہ تو ان کے دَھرم میں انگریزوں کے

خوش کرنے کو ہوئے۔

وہ جو "پیرِ نیچر" کے دور میں نصرانیت کی غلامی اُوپچی تھی۔ جسے اب آدھی صدی کے بعد لیڈر رونے بیٹھے ہیں۔ کیا اس کا رَدعُلماے اہلِ سُنَّت نے نہ کیا؟ وہ کس کو خوش کرنے کو تھا؟ بکثرت رسائل ومسائل ان کے رَد میں نہ لکھے گئے؟" (ص ۴۶ و ۴۷۔ **اَلْمَحَجَّةُ الْمُؤْتَمَنَة۔ مطبوعہ بریلی**)

کافروں، مُشرکوں اور بدمذہبوں سے موالات اور اتحادووَداد کے خلاف امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے بڑی شدت کے ساتھ تنبیہ اور تہدید فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"عام مُشرکینِ ہند کو لَمْ یُقَاتِلُوکُم فِی الدِّین کا مصداق ماننا اِیمان کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا ہے۔ کیا وہ ہم سے دین پر نہ لڑے؟ کیا قربانیِ گاؤ پر ان کے سخت ظالمانہ فساد پُرانے پڑ گئے؟ کیا کٹارپور وآرہ اور کہاں کہاں کے ناپاک وہولناک مظالم جو ابھی تازہ ہیں، دِلوں سے مَحو ہو گئے؟

بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کیے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے۔ ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں۔ قرآنِ کریم کے پاک اوراق پھاڑے۔ جَلائے۔ اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لیے کلیجہ منہ کو آئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِين o اَلا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِين o اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلى الظّٰلِمِين o

اب کوئی دردرسیدہ مسلمان ان لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ:

اے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والو! ہمدردیِ اسلام کا ظاہری تانا تننے والو!

کچھ حَیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مَرو۔

اسلام و مسلمین ومساجد وقرآن پر یہ ظلم توڑنے والے، کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے چہیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پیشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غمگسار، مشرکینِ ہند نہیں جن کے ہاتھ آج تم بِکے جاتے ہو؟ جن کی جَے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو؟ اُف۔ اُف۔ اُف۔ تُف۔ تُف۔ تُف — اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِين وَالْكٰفِرِين فِي جَهَنَّمَ جَمِيْعًا۔

اور بے ایمان پکّا بے ایمان ہوگا وہ جو واحدِ قہّار کو یکسر پیٹھ دے کر کہے کہ:

یہ ملعون مظالم تو بعض بعض شہر کے بعض بعض کفّار نے کیے، اس سے سب تو قَاتَلُوکُمْ

فِی الدِّین نہیں ہو گئے۔

کوئی قوم ساری کی ساری نہیں لڑتی۔ کفّارِ زمانۂ رسالت جن کی نسبت حکم ہُوا:

فَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ۔ انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔

اور حکم ہُوا۔ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً۔

سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں۔

کیا ان کا ہر ہر فرد میدانِ جنگ میں آیا تھا؟

لڑائی دیکھی جاتی ہے۔ اگر جو لڑے ان کی خاص کوئی ذاتی غرض ہے جس میں ساری قوم شریک نہیں تو وہ لڑائی خاص انہیں کی طرف منسوب ہوگی جو اس کے مُرتکب ہوئے۔ مثلاً کسی گاؤں کے دُھرے مینڈھے پر بعض لوگوں سے جنگ ہو تو وہ انہیں کی ہے۔ نہ تمام قوم کی۔

اور اگر لڑائی مذہبی ہے تو ان سب اہلِ مذہب کی ہے۔ کہ باقی دامے، دِرمے، قلمے، قدمے، مُعین ہوں گے۔ اور کچھ نہ ہو تو راضی ہوں گے اور اپنے مذہب کی فتح پر تو خوش ہوں گے اور دوسرے کی ہو تو رنجیدہ ہوں گے۔ قَالَ اللّٰه تعالیٰ:

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا۔

تو وہ سب مُحارِبین بِالفعل ہیں۔ خواہ زبان سے یا دل سے..........

مُحاربۂ مذہبی ہر قوم کا اس بات پر ہوتا ہے جسے وہ اپنے دین کی رُو سے زِشت ومُنکَر جانے۔ اسی کے اِزالہ کے لئے لڑائی ہوتی ہے۔ اور اِزالۂ مُنکَر تین قسم ہے۔ موقعہ ہو تو ہاتھ سے۔ ورنہ زَبان سے۔ ورنہ دل سے۔ نبی صلّی الله علیه وسلّم فرماتے ہیں۔:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ۔ فَاِن لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ۔ فَاِن لَمْ يَسْتَطِع فَبِقَلْبِهٖ۔

یہ تینوں صورتیں اِزالہ وتغیر کی ہیں۔ اور یہ سب اہلِ مُحاربہ سے مُحاربہ ہی ہیں۔ بِالفعل ہتھیار اُٹھانا شرط نہیں۔ جس کا ثبوت اوپر گذرا۔

اور اگر یہی ٹھہری کہ اگرچہ لڑائی سرتاجِ قوم اور تمام افرادِ قوم کی رضا سے ہو مگر قَاتَلُوکُمْ فِی الدِّین میں صرف وہی داخل ہوں گے جنھوں نے میدان میں ہتھیار اٹھائے۔ تو ذرا انگریزوں کے ساتھ اپنے بائیکاٹ کا مزاج پوچھ لیجیے۔

کیا ہر انگریز تُرکوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ لاکھوں یا شاید کروروں ہوں جنہوں نے اس میدان کی صورت تک نہ دیکھی۔ خصوصاً ہندوستان میں سِوِل

کے انگریز۔تو یہ سب لم یُقاتِلُوکُمْ فِی الدِّین ہوئے۔اورتمہارا یہ ترکِ تعاون کا عام مسئلہ تمہارے ہی منہ سخت جھوٹا اورشریعت پر اِفترا ٹھہرا۔مقاطعہ کروتو انہیں معدود سے کرو جو میدان میں تُرکوں سے لڑے۔غرض:

نے فُروعَت مُحکم آمد نے اصول

شرم بادَت از خدا واز رسول

(ملخّصاًالمَحَجَّةُ المُؤْتَمَنَة ۔ص۲۷ تا ۲۹،مطبوعہ بریلی۔وص:۴۵۲ تاص:۴۵۵، فتاویٰ رضویہ،جلد۱۴،رضافاؤنڈیشن۔لاہور)

ایک اِستفتامیں اُس وقت کے حالات اور پھرحضرت امام احمدرضا قادری برکاتی بریلوی کا شرعی فیصلہ ملاحظہ فرمائیں:

''کیافرماتے ہیں عُلمائے دین اس مسئلہ میں کہ تبلیغ خلافت کی غرض سے جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں ہنود بھی شریک ہوئے۔دورانِ تقریرمسلمانوں نے اللّٰہُ اکبر کے نعرے لگائے اور ہنود نے وندے ماترم۔مہاتما گاندھی کی جے۔تِلک مہاراج کی جے۔کے نعرے لگائے۔

کیا ہنود کو مساجد میں اِس قسم کے نعرے لگانا جائز ہے؟ اور اگر بعض مسلمانوں نے خود اپنی زبان سے اسی مقام پر دورانِ تقریر اہلِ ہنود کے ساتھ یا خود پیش قدمی کرتے ہوئے اس قسم کی جے کی آوازیں بلند کی ہوں تو ان کا کیا حکم ہے؟ بَیِّنُوا بِالدَّلِیل تَوجَرُوا مِنَ الرَّبِّ الجَلِیل۔''(مسئولہ محمد مجتبیٰ خاں۔کوٹھی سیدمحمد حسین صاحب بیرسٹر،میرٹھ۔۱۵رذوالحجہ ۳۹ھ/۱۹۲۱ء)

الجواب: ۔مُشرکین کی جے پکارنا اُن کی تعظیم ہے اور کافر کی تعظیم کفر ہے۔فتاویٰ ظہیریہ واَشباہ ودُرِّمُختار میں ہے: تَبجِیلُ الکافِرِ کُفُرٌ۔

ایسے کلمہ گویوں پر لازم ہے کہ نئے سرے سے اسلام لائیں۔پھراپنی عورتیں رکھنا چاہیں تو ان سے ازسَرِ نَو نِکاح کریں۔

بلکہ ایسے جلسوں میں جو مضامین باطلہ ومخالفِ شرع ہوتے ہیں اُن پر بہ نیتِ تحسین اللّٰہُ اکبر کہنا بھی حرامِ قطعی ہے کہ ذکرِ الٰہی کی توہین ہے۔

مُشرکوں کو مسجدوں میں اِس طرح لے جانا اور اُن کا اپنے کلماتِ کفر بِالاِعلان کہنا اور مسلمان کہلانے والوں کا اُس پر راضی ہونا باجماعِ اُمّت حرام ہے۔

رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

اِنَّمَا بُنِیَتِ المَسَاجِدُلِمَابُنِیتُ لَہٗ۔وَفِی اُخریٰ۔لِلذِّکرِ والصَّلوٰۃِ وقِرأۃِ القُرآن۔

مسجدیں تو صرف اس لئے بنیں جس لئے بنیں۔وہ تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز اور تلاوت کے لئے بنیں۔

یہاں تک کہ صحیح حدیثوں میں فرمایا: جو مسجد میں اپنی کسی گمی چیز کو پوچھے اس سے کہو: لارَدَّ اللّٰہُ عَلَیْکَ ضَالَّتَکَ۔اللہ تیری گمی چیز تجھے نہ ملائے۔مسجدیں اس لئے نہ بنیں۔

نہ کافروں کو لے جانے اور مشرکوں کی جے پکروانے کے لئے۔مگر کیا کیجیے کہ ان لوگوں کے دل مسخ ہوگئے۔انہوں نے مُشرک کے غلام ہوکر اللہ ورسول کے سب احکام مَنسوخ کردیے۔

احمق بےعقل جاہلوں کی کیا گنتی؟ ساری کمیٹی میں سب سے بڑے عالم کہلانے والے مولوی عبدالباری فرنگی محلی ہیں۔..........وہ اِقرار لکھ رہے ہیں کہ وہ بِالکل پسِ رَوِ گاندھی کے ہیں۔اس کو اپنا رہنما لیا ہے۔جو وہ کہتا ہے وہی مانتے ہیں۔اِنّا لِلّٰہِ واِنّا اِلیہِ راجِعُون۔

اس کا نام دین ہے؟ اس کا نام اسلام ہے؟ حالاں کہ رب عَزَّ وجَلَّ فرماتا ہے:

اگر تم نے کافروں کا کہا مانا تو ضرور تم بھی مُشرک ہو۔

ولٰکِنِ الظّٰلِمِین بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجحَدُونَ ۔ وسَیَعلَمُ الَّذِینَ ظَلَمُوا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَنقلِبُون۔واللّٰہُ تَعالیٰ اعلم۔

(ص۳۰۵۔فتاویٰ رضویہ۔جلدِ ششم۔مطبوعہ سنّی دارُالاشاعت،مبارکپور،ضلع اعظم گڑھ،یوپی)

گاندھی کی قیادت میں چلنے والی تحریکِ خلافت کا اصل مقصد واضح کرتے ہوئے امام احمدرضا قادری برکاتی بریلوی اپنی کتاب "دَوَامُ العَیش فِی الاَئِمَّۃِ مِنْ قُرَیش" (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

''تُرکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔اصل مقصود بغلامیِ ہنود سوراج کی چکی ہے۔بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے۔بھاری بھرکم خلافت کا نام لو۔عوام بپھریں،چندہ خوب ملے اور

گنگا وجمنا کی مقدس زمین آزاد کرانے کا کام چلے۔

اے پَس رَوِ مُشرِکاں بزمزم نہ رَسی
کیں رَہ کہ تو می رَوِی بہ گنگ وجمن ست

(ص: ۲۲۵۔جلد۱۴۔فتاویٰ رضویہ مترجم۔رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

بہرحال! مجموعی طور پرتحریکِ خلافت جس رُخ پر جارہی تھی اورتحریک تَرکِ موالات نے جو رَنگ اختیار کرلیا تھا اس میں جوش وجذبہ نے اتنا ہیجانی ماحول پیدا کردیا تھا کہ ہوش وحواس اور مستقبل بینی سے قائدینِ تحریک عام طور پر غافل اور بے نیاز ہوگئے تھے۔شرعی اصول و ضوابط سے بے پَرواہوکرطرح طرح کی جذباتی باتیں کہی جارہی تھیں۔''انگریز دشمنی'' کے ساتھ ''مُشرِک دوستی'' کے نظارے عام تھے۔سیاسی عزائم کے سامنے سب کچھ یا بہت کچھ جائز کردیا گیا تھا جس کا قصہ طویل اوراُس وقت کے اخبارات ورسائل میں مذکور ومسطور ہے۔

حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) خلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اپنی ایک تحریر میں سلطنتِ اسلامیہ کی اِعانت وحمایت اور خادمُ الحرمین کی امداد ونُصرت، مسلمانوں پر فرض قرار دینے کے ساتھ تحریکِ خلافت کے ایک نہایت اہم پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے ان مَساعی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ:

ہندوؤں کو اپنے ساتھ شریک کریں اور اپنا ہم آواز بنائیں تا کہ ان کی صَدا میں زور آئے اور سلطنت ان کی درخواست کان لگا کر سُنے۔

مذہب کا فتویٰ اس کو ممنوع اور ناجائز نہیں قرار دیتا اور اِس قدر جدوجہد جواز میں رہتی۔لیکن صورتِ حال کچھ اور ہے۔

ہندو اِمام بنے ہوئے آگے ہیں اور مسلمان آمین کہنے والے کی طرح اُن کی ہر صَدا کے ساتھ موافقت کررہے ہیں۔

پہلے ''مہاتما گاندھی'' کا حکم ہوتا ہے اس کے پیچھے ''مولوی عبدالباری'' کا فتویٰ مقلِّد کی طرح سَرِ نیاز خَم کرتا چلا جاتا ہے۔

پہلے تو ہندوؤں نے سُود کے پھندوں میں مسلمانوں کی دولتیں اور جاگیریں لے لیں۔

اب وہ مُفلِس ہوگئے اور کچھ پاس نہ رہا تو مقاماتِ مقدّسہ اور سلطنتِ اسلامیہ کی حمایت کی آڑ میں مذہب سے بھی بے دخل کرنا شروع کردیا۔'' (ص ۱۵و۱۶، ماہنامہ اَلسَّوادُ الاعظم

مرادآباد۔شمارہ شوالُ المکرّم ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

''سلطنتِ اسلامیہ کی اِعانت اور مقاماتِ مقدّسہ کی حمایت وحفاظت کے لئے مسلمان ہر مکمل تدبیر عمل میں لائیں۔لیکن اپنے دین ومذہب کو محفوظ رکھیں۔اپنے آپ کو ہندوؤں کے ہاتھوں میں نہ دے ڈالیں۔

اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں، اپنی عقل وحواس کو مُعطّل نہ کریں۔اپنے ہوش وخرد کو کام میں لائیں۔نہایت فرزانگی کے ساتھ اپنے نیک وبد انجام اعمال پر نظر ڈالیں۔

ایسی بے رائی کہ ہر بات میں گاندھی پر نظر ہے، کچھ کام نہیں آسکتی۔

فرض کرو۔آج گاندھی تمہارے موافق ہیں اور تم ہر مشورے میں ان کی رائے کے محتاج ہو، کل اگر گاندھی کا رَنگ بدل جائے، تم کیا کروگے؟'' (ص:۲۱۔ماہنامہ اَلسَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔شمارہ شوال ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء)

امام احمد رضا اورآپ کے ہم خیال دیگر عُلماے اہلِ سُنّت کا حامیانِ تحریک سے سارا اِختلاف یہ تھا کہ مسئلۂ خلافت ومسئلۂ موالات جو خالص شرعی مسائل ہیں، انھیں استعمال کرنے اوران کی صورت مسخ کرنے کی سیاسی کوشش کیوں جارہی ہے؟ شریعت مخالف عمل اور بیان کا سلسلہ کیوں جاری کیا گیا ہے؟ اورشرعی مسئلہ کی باگ ڈور کسی کافر ومشرک یا کسی یہودی ونصرانی کے ہاتھ میں دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

برطانیہ سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے سیدھے سیدھے تحریکِ آزادی چلا کر عوام کو بیدار کیا جائے اور کسی بھی مَرحلے میں ''ہندومسلم اتحاد'' کے نام پر کفار ومشرکین کی خوشنودی حاصل کرتے ہوئے احکامِ شریعت کو پامال نہ کیا جائے اور مشرکینِ ہند کی قیادت مسلمانانِ ہند پر ہرگز مسلّط نہ کی جائے، نہ اس تحریک کو ان کے حوالہ کیا جائے جیسا کہ اِس وقت یہ سب کچھ ہورہا ہے۔

یہ مَوقف شرعی اصول پرمبنی اور بالکل درست تھا اور ہے جس کی شہادت بعد کے حالات نے بھی فراہم کردی۔اور تاریخِ ہند نے بھی امام احمد رضا کے موقف کو صد فی صد درست قرار دیا۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے فرزند اکبر حضرت مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) نے قائدینِ تحریکِ خلافت وموالات کو مُخاطَب کرتے ہوئے صاف صاف فرمایا تھا کہ:

’’یہ لوگ موالات کو حکمِ شریعت سمجھ کر نہیں مانتے ہیں۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے موافق کرنے کے لئے آیتیں تلاوت کرتے ہیں۔
مانتے تو ہیں گاندھی کا حکم سمجھ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ترکِ موالات کے ساتھ ہنود سے موالات فرض سمجھتے ہیں۔
آج تمام ہندوستان جانتا ہے کہ خلافت کمیٹی صرف ترکِ موالات بتاتی ہے اور ہنود سے موالات نہ تنہا موالات بلکہ ان کی رضا میں فنا ہو جانا ضروری قرار دیتی ہے۔‘‘ (ص:۵۵۔ دَوَامِغُ الحَمِیر ۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء)

اکبر الٰہ آبادی نے شاعرانہ انداز میں بڑے پتے کی بات کہی ہے:

کامیابی ’’خارِج اَز مِلَّت‘‘ سے ناکامی بھلی
لطفِ دشمن ہی سے ہو شہرت تو گم نامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمھیں اہلِ حرم، اِس سے بچو
دَیر والے کج اَدا کہہ دیں، یہ بدنامی بھلی
پختہ ہو کر اپنی شاخ و بُن سے ہوتا ہے جُدا؟
اے ثمر! چشمِ محبت میں تری خامی بھلی

ترکِ موالات سے مشرکینِ ہند کو مستثنیٰ کر کے صرف انگریزوں سے ترکِ موالات بحکمِ گاندھی ۱۹۲۴ء تک باضابطہ مذہبی فرض قرار دیا گیا کیوں کہ تحریکِ ترکِ موالات/ نان کوآپریشن موومنٹ جیسے ہی ۱۹۲۴ء میں گاندھی نے واپس لینے کا باضابطہ اِعلان کیا ویسے ہی سارے کانگریسی عُلما وخلافتی لیڈر اپنا یہ مذہبی فرض بھول گئے۔ بلکہ اس سے پہلے ۱۹۲۲ء کے چَورَاچَورِی (گورکھ پور) حادثہ کے بعد ہی اس تحریک سے سَرد مہری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) نے اپنی ایک تقریر میں اپنی اسلامی بصیرت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

’’میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جسے خدا کے فضل سے شریعتِ اسلامی کی کچھ بصیرت دی گئی ہے، کہتا ہوں کہ:
ایک مسلمان پر حُبِّ وطن کے لحاظ سے، مذہب کے اعتبار سے، اَخلاق کے لحاظ سے، فرض ہے کہ ترکِ موالات کرے۔‘‘ (ص:۳۰۔ روزنامہ زمیندار لاہور۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔

’’مسلمانوں کے لئے یہ قریب قریب کفر ہو گیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ سے اپنی اِستطاعت کے اندر محبت واِطاعت اور اِعانت کا کوئی تعلق رکھیں۔
اگر وہ کوئی تعلق اس طرح کا رکھیں گے تو ایک منٹ کے لئے بھی ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں جگہ دیں۔‘‘ (ص:۳۷۔ خطباتِ آزاد۔ اردو کتاب گھر، دہلی۔ ۱۹۵۹ء)

مذکورہ تحریکات کے نتیجے میں ایک طبقۂ عُلما پر ’’کانگریسیت‘‘ کا خُمار اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ بقول مولانا شبیر احمد عثانی (متوفی ۱۳۶۹ھ/ دسمبر ۱۹۴۹ء) سابق صدر مہتمم دارُ العلوم دیوبند و شیخُ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات:

’’حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے عہدِ مبارک تک دارالعلوم (دیوبند) ہر قسم کے داخلی اور خارجی فتنوں سے پاک وصاف تھا۔ درسِ حدیث میں خدا اور رسول کی اِطاعت کے بجائے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کی اِطاعت کا دَرس نہیں دیا جاتا تھا۔
اب تفسیرِ جلالین، بیضاوی اور درسِ حدیث میں کانگریسیت کا سبق پڑھایا جانے لگا۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے کارناموں کی نہ صرف تعریف کی جاتی ہے بلکہ ان کی تائید قرآن وحدیث سے پیش کی جانے لگی۔
درسِ حدیث میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہوگا کہ جس میں کانگریس کا تذکرہ اور اس میں شمولیت کی تلقین نہ کی جاتی ہو۔
انھیں تقریروں اور رات دن کی متواتر کوششوں کا نتیجہ ہے کہ:
’’آج دارُ العلوم (دیوبند) نہ صرف ہنود کا مداح ہے بلکہ ان کے رَنگ میں بہت کچھ رنگا جا چکا ہے۔‘‘ (اخبار وحدت دہلی۔ شمارہ ۲۳/ دسمبر ۱۹۳۷ء۔ بحوالہ اخبار دبدبۂ سکندری رام پور، شمارہ ۵/ نومبر ۱۹۴۵ء)

❑❑❑

علمائے اہلِ سُنّت کی خدمات

تاج العُلما مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارَہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء) امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی عملی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''—— آج (۱۳۴۰ھ) سے برسوں پہلے جنگِ بلقان (۱۲۔۱۹۱۱ء) کے موقعہ پر انہوں (مولانا احمد رضا) نے سلطنتِ اسلامی ومظلومین مسلمین کی اِعانت واِمداد کی مناسب وصحیح شرعی تدابیر لوگوں کو بتائیں۔ عام طور پر شائع کیں۔ قولاً وعملاً اُن کی تائید کی۔ خود چندہ دے کر عوام کو اس طرف رغبت دلائی اور اب بھی لوگوں کو صحیح مُفید شرعی طریقے اِعانتِ اسلام ومسلمین کے بتاتے رہتے ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب جو عملی کوششیں کر سکتے تھے، انھوں نے کیں۔ خود چندہ دیا اور اپنے زیر اثر لوگوں سے دلوایا۔ مسلمانوں کو اسلامی سلطنت کی اِمداد واِعانت پر توجہ ورغبت دلائی۔ تحفظِ سلطنتِ اسلامی کی مُفید وکارگر تدابیر بتائیں۔

یہ عملی کوشش نہیں تو کیا ہے؟'' (ص ۱۲۔ برکاتِ مارَہرہ ومہمانانِ بدایوں (۱۳۴۰ھ) مطبوعہ حسنی پریس، بریلی۔ ۱۳۴۰ھ)

''اس سے زیادہ اور کون سے پہلے دن سے مولانا احمد رضا خاں صاحب کوشش کرتے؟ کہ خلافت کمیٹی والے تو آج حمایتِ خلافت وحفاظتِ سلطنتِ اسلامی کا نام لینے بیٹھے ہیں۔ جب کہ سلطنتِ اسلامی کا خاتمہ ہو چکا۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اس وقت سے کوشش کی جب اس موجودہ مصیبتِ عُظمیٰ کا خیال بھی دلوں سے دور تھا۔ اور جنگ بلقان (جو بلحاظِ حالاتِ مابعد اس مصیبتِ عظمیٰ کی تمہید وابتدا ثابت ہوئی) کے ہی زمانہ سے حمایت واعانتِ سلطنتِ اسلامی میں اپنی رائے ومَسلک قولاً وعملاً ظاہر کر دیا۔ عوام کو رغبت دلانے کے لئے بریلی میں جلسۂ عام میں خود چندہ دیا۔ حمایتِ سلطنتِ اسلامی واعانتِ مظلومینِ تُرک کی نافع ومفید تدابیر آگاہیِ عام کے لئے شائع کیں۔'' (ص ۱۲ و ۱۳۔ برکاتِ مارَہرہ ومہمانانِ بدایوں۔ مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔ ۱۳۴۰ھ)

۲۲ر تا ۲۴ر مارچ ۱۹۲۱ء جمعیۃُ العُلماء ہند کا جو اہم اجلاس بریلی میں منعقد ہوا۔ اس میں خلافت وتَرکِ موالات سے متعلق گفتگو کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) نے حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قُدِّسَ سِرُّہ' کو ایک خط تحریر کیا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی تھی، چنانچہ اس اِجلاس بریلی میں وفدِ علمائے اہل سنّت کے ساتھ مولانا سید سلیمان اشرف نے شرکت کی اور مولانا آزاد کے دیے گئے وقت پینتیس (۳۵) منٹ تک اِجلاس میں اپنے خطاب کے ذریعہ اہلِ سُنّت کا موقف واضح کیا اور عُلمائے تحریک خلافت وموالات کے تجاوزات کی نشان دہی کی۔

مولانا سید سلیمان اشرف کی شخصیت وخطابت کی تصویر کشی کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی دہلوی (متوفی ۱۹۵۴ء) نے لکھا ہے کہ:

''گورا رَنگ، مضبوط جسم، گنجان داڑھی، تیز وچمک دار آنکھیں، عمر پچاس کے قریب، بہار میں مکان ہے۔ علی گڑھ کالج میں دینیات کے پروفیسر ہیں۔ صوفیانہ مَشرب رکھتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای آئی آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود شریف پڑھنے کے لئے تھوڑی دیر میں وَقفہ ہوتا ہے۔ ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی

سے گنگا کی دھار انکلی ہے جو ہَری دُوار تک کہیں رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔

بیان کی ایسی رَوانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔'' (درویش جنتری ۱۹۲۳ء از خواجہ حسن نظامی۔ بحوالہ کتابی دنیا، کراچی، شمارہ جنوری، فروری ۱۹۶۷ء)

ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۵ء) سابق صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی ''رَفت و بُوْد'' کے عنوان سے مولانا سید سلیمان اشرف کے بارے میں اپنے تأثرات کا اِس طرح ذکر کرتے ہیں:

''میں نے بہت سی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں۔ بڑے بڑے عُلما کو دیکھا ہے۔ لیکن سید سلیمان اشرف جیسا عالم میں نے نہیں دیکھا ہے۔'' (روزنامہ جسارت، کراچی۔ شمارہ ۲۰؍جون ۱۹۸۰ء)

مذکورہ اِجلاسِ بریلی میں اہلِ سُنَّت کا مَوقِف واضح کرتے ہوئے علاّمہ سید سلیمان اشرف نے فرمایا:

''آپ مُلکی مفاد اور بہبود کے لئے مل کر کوشش کیجیے مگر جہاں سے مذہبی حدُود آئیں، مسلمان الگ۔ اور ہندو الگ۔ ہم اپنے ''مذہب میں'' ہندوؤں سے اِتحاد نہیں کر سکتے۔

غرض مقاماتِ مقدسہ و خلافتِ اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجیے، اس سے ہمیں خلاف نہیں۔ خلاف اُن حَرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی ومخالفِ دین کر رہے ہیں۔

اِن حَرکات کو دور کر دیجیے۔ ان سے باز آجائیے۔ ان کی روک تھام کیجیے۔ عوام کو ان سے باز رکھیے، تو خلافتِ اسلامیہ و مما لکِ مقدسہ کی حفاظت، ہندوستان کے ملکی مفاد کی کوششیں، ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر کرنے کو تیار ہیں۔'' (ص ۷۔۸۔ رودادِ مناظرہ۔ بہادری پریس۔ بریلی)

مولانا عبدالرَّزّاق ملیح آبادی ندوی (متوفی ۱۹۵۹ء) عینی شاہد کے طور پر لکھتے ہیں:

..........خطیب، مولانا سلیمان اشرف تھے اور اس میں شک نہیں کہ بڑے فصیح وبلیغ مقرر تھے۔

موصوف کی تقریر نے جو بڑی لمبی تھی، کانفرنس کو ہلا ڈالا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب اور کچھ کہنا ممکن نہیں۔'' (ذکرِ آزاد۔ وہفت روزہ چٹان لاہور۔ ۶؍مارچ ۱۹۶۱ء)

اتنے اہم مسائل پر اتنی برجستہ اور جامع تقریر سن کر اَرکانِ جمعیۃ العُلَماء مَبہوت ہو کر رہ گئے اور آزاد صاحب کا یہ حال تھا کہ:

''مولانا سلیمان اشرف کی جادو بیانی، مولانا (آزاد) سن رہے تھے اور ان کے کندھے مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی جادو بیانی سُن کر نمایاں طور پر پھڑک رہے تھے۔'' (حوالۂ مذکورہ)

حُجَّۃُ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) خلفِ اکبر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا یہ اظہارِ حق بھی تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

''حرمین شریفین و مقاماتِ مقدَّسہ و مما لکِ اسلامیہ کی حفاظت و خدمت ہمارے نزدیک ہر مسلمان پر بقدرِ وُسعت و طاقت فرض ہے۔ اس میں ہمیں کچھ کلام نہ ہے نہ تھا۔ تمام کفّار ومشرکین ونصاریٰ و یہود و مُرتدین وغیرھُم سے تَرکِ موالات ہم ہمیشہ کے لئے ضروری وفرض جانتے ہیں۔

ہمیں خلاف آپ کی اُن خلافِ شرع وخلافِ اسلام حرکات سے ہے جن میں سے کچھ مولوی سید سلیمان اشرف صاحب نے بیان کیں اور جن کے متعلق جماعت (رضائے مصطفیٰ بریلی) کے ستر (۷۰) سوالات بنام ''اِتمامِ حُجَّتِ تامَّہ'' آپ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے جواب دیجیے۔

جب تک آپ ان تمام حرکات سے اپنا رجوع نہ شائع کر دیں گے اور ان سے عہدہ برآ نہ ہولیں گے، ہم آپ سے علیحدہ ہیں۔

اور اس کے بعد خدمت و حفاظتِ حرمین شریفین ومقاماتِ مقدَّسہ و مما لکِ اسلامیہ میں آپ کے ساتھ مل کر جائز کوشش کرنے کو تیار ہیں۔'' الخ (ص ۱۰، ۱۱۔ رودادِ مناظرہ۔ مطبوعہ بریلی)

تحریکِ خلافت اور جمعیۃ العُلماء ہند کے اس دورِ اِفراط وتفریط میں ۲۲/۲۳/۲۴/ شعبان ۱۳۳۹ھ مطابق ۱/۲/۳/مئی ۱۹۲۱ء کو امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی سرپرستی میں اہلِ سُنّت و جماعت کی تنظیم ''اَنصارُ الاسلام'' کی طرف سے بریلی میں شان دار اجلاس ہوئے۔ جن میں اَماکنِ مقدّسہ کی حفاظت اور تُرکوں کی مدد کے لئے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی۔ مندرجہ ذیل حضرات نے اِن جلسوں سے خطاب فرمایا:

(۱) مولانا سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی (مارَہروی)

(۲) مولانا محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آبادی، (خلیفۂ امام احمد رضا بریلوی)

(۳) مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی //

(۴) پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری ثُمَّ علی گڑھی //

(۵) مولانا سید دیدار علی شاہ اَلْوَرِی ثُمَّ لاہوری //

ان حضرات نے تُرکوں کی مدد، اَماکنِ مقدّسہ کی حفاظت اور ترکِ موالات کے موضوع پر مدلّل تقریریں فرمائیں۔ لیکن ان کا مطمحِ نظر سیاسی نہیں بلکہ شرعی تھا اس لئے مخالفین کی طرف سے ان جلسوں کو درہم برہم کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

اس جذباتی دور میں سیاسی غلبہ کی وجہ سے معقولیت اور شریعت کی بات سننے کے لئے بہت کم لوگ تیار تھے۔ کیوں کہ سُوءِ اتفاق کہ مخالفین کے رہبر بھی از قسمِ عُلما ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ کفّار و مشرکین کے ساتھ تھے اور یہ علیحدہ۔ اور یہی بہت بڑا فرق تھا جو اُس وقت محسوس نہیں کیا گیا۔

اِجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) عُلمائے اہلِ سُنّت اور مسلمانانِ بریلی کا یہ عظیمُ الشان جلسہ گورنمنٹ برطانیہ سے زور کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ:

اپنا اور تمام اِتحادیوں کا اثر جزیرۃُ العرب سے اُٹھا کر مسلمانوں کو مذہبی دست اندازی کی تکلیف سے باز رکھے۔

(۲) یہ جلسہ گورنمنٹ سے زبردست مطالبہ کرتا ہے کہ:

وہ مظلومینِ سمرنا وغیرہ کی مالی اعانت و اِرسالِ زر کے قابلِ اطمینان ذرائع ہمارے

لئے بہم پہونچائے۔

(۳) یہ جلسہ تُرک وعرب میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک وفد بھیجنا تجویز کرتا ہے اور گورنمنٹ سے زور کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے کہ:

عرب میں (اہلِ عرب کی اِمداد و اِعانت کے لئے) ہمارے وفد کی ذِمّہ داری قبول کرے۔

(۴) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ:

ان مطالبات (کومنْوانے) کے لئے گورنمنٹ کے پاس وفد بھیجا جائے۔

(۵) یہ جلسہ مسلمانوں کو پورے زور کے ساتھ ترغیب دیتا ہے کہ:

اپنے تمام مقدمات جن کو وہ آپس میں طے کرنے کے مجاز ہیں، مطابق شرع شریف فیصل کرلیں اور کچہریوں کی مقدمہ بازی سے کہ فریقین کے لئے تباہ کن ہوتی ہیں، بچیں۔

(۶) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ:

گورنمنٹ جو قانون ایسا بنائے جس سے کسی اسلامی مسئلے کو مَضَرَّت پہنچے یا پہنچنے کا اندیشہ ہو، اُس کی ضرور ترمیم چاہی جائے اور اُس کی جائز کوشش اِنتہا تک پہنچائی جائے۔

(۷) یہ جلسہ اپنے مسلمان بھائیوں کو خاص اپنی تجارت بڑھانے کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے ذرائع کی توسیع اور حتی الاِمکان ان صورتوں کے بہم پہنچانے پر توجہ دلاتا ہے جن سے مسلمان کبھی کسی غیر مسلم تجارت کے محتاج نہ رہیں۔

(۸) یہ جلسہ اپنے مسلمان بھائیوں کو اسلامی بینک کھولنے پر توجہ دلاتا ہے تا کہ مسلمان غیر مسلموں کی دست بُرد سے بچیں۔

(۹) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ:

تُجّار اور رُؤسا سے ایک اسلامی خزانہ قائم کرنے کی تحریک کی جائے جس میں ماہ بماہ یا سال بہ سال کچھ رقم جمع ہوتی رہے کہ وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی تجارت کی توسیع کی ضرورتوں اور نیز اِعانتِ سلطنتِ اسلامیہ و ضروریاتِ اسلام میں کام آئے۔

(۱۰) یہ جلسہ مسلمانوں کو علمِ دین و مذہبِ اہلِ سُنّت و جماعت مطابقِ عقائدِ عُلماے حرمین شریفین کی اِشاعت پر نہایت تاکید سے توجہ دلاتا ہے۔

(۱۱) یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ:

جو غلط طریقے، ناجائز راستے، مُضِر وَطیرے بغلط لباسِ شرعی پہنائے گئے ہیں، ان کی شناعَت پر مسلمانوں کو تحریراً تقریراً مطلع کیا جائے۔"

(ماہنامہ اَلسَّوادُ الاعظم، مراد آباد۔ شعبان ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء۔ وص۵ ہفت روز دبدبۂ سکندری۔ رام پور۔ بابت ۲۸ رمئی ۱۹۲۱ء۔ وروزانہ "پیسہ اَخبار" لاہور۔ شمارہ ۱۳ رمئی ۱۹۲۱ء)

بیشتر بمنزلہ جمہور عُلماے اہلِ سُنّت بھی اسی نظریہ کی تائید میں تھے جس کی ترجمانی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے فرمائی۔ چنانچہ پروفیسر محمد مسعود احمد مجدِّدی مظہری دہلوی (وصال ۲۱ ربیع الآخر ۱۴۲۹ھ/۲۸ اپریل ۲۰۰۸ء۔ کراچی) فرزندِ حضرت مفتی محمد مظہر اللہ نقشبندی مجدِّدی خطیب و امام شاہی مسجد فتح پوری دہلی (متوفی ۱۹۶۶ء) رقم طراز ہیں:

"حضرت مفتیِ اعظم محمد مظہر اللہ مجدّدی دہلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ بھی تحریکِ آزادیِ ہند سے الگ تھلگ نہیں رہے۔ البتہ سیاسی معاملات میں ہمیشہ شریعت کو پیشِ نظر رکھا۔ تحریکِ خلافت کے آغاز (۱۹۱۹ء) میں کچھ عرصہ شریک رہے لیکن جب تحریکِ تَرکِ موالات (۱۹۲۰ء) کا آغاز ہوا تو اس سے علیحدہ ہو گئے اور "ہندو مسلم اتحاد" کے خلاف فتویٰ دیا۔ اس فتویٰ کی بنیاد سیاسی نہ تھی بلکہ خالصۃً شرعی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی سے حضرت (مفتی مظہر اللہ دہلوی) کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ حضرات، حضرت کے پاس آتے جاتے تھے۔ چنانچہ مولانا منوّر حسین سیفُ الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی صاحبان بھی حضرت مفتیِ اعظم (دہلی) سے ملتے تھے مگر حضوری کے بعد یہی کہتے تھے کہ:

"مفتی صاحب اٹل ہیں۔ وہ مُشرکوں کے ساتھ کسی صورت میں اِشتراک کو جائز نہیں سمجھتے۔"

حضرت (مفتی مظہر اللہ دہلوی) نے ہمیشہ سیاسی معاملات کو شریعت کی کسوٹی پر پَرکھا۔

اور اس دینی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا جو اُن کے مُعاصِر عُلما میں ماسِوا چند ایک کے، کسی کو حاصل نہ تھی۔

تَرکِ موالات کے علاوہ جب مُشرکینِ ہند کی تالیفِ قلوب کے لئے گائے کی قربانی تَرک کرنے کی تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے شروع ہوئی تو حضرت نے سخت مزاحمت فرمائی اور اس کے خلاف فتویٰ دیا۔" (۲۹و۳۰ حیاتِ مظہری۔ مطبوعہ کراچی۔)

نواب مشتاق احمد خاں حیدر آبادی فرزند نواب فخر یار جنگ وزیر مالیات حیدر آباد، دَکن نے حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ سنّی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (خلیفۂ حضرت امام احمد رضا بریلوی) پر لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے کہ:

"یہ تحریکِ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ کالج (علی گڑھ) میں عُلماے کرام اور سیاست دانوں کی یلغار تھی۔ ذِہنی خلجان اور افراتفری کا عالم تھا۔ سب چھوٹے بڑے نتائج سے بے پَروا اسی رَو میں بَہے جا رہے تھے۔ مولانا (سید سلیمان اشرف) اُن معدودے چند بزرگوں میں تھے جنھیں اس تحریک سے اختلاف تھا۔

ان کی نظر میں بعض مُضمرات مسلمانوں کے عقائد اور مفاد کے منافی تھے۔ مثلاً شردَھانند جیسے کٹّر ہندو کو تقریر کے لئے مسجد میں لانا ایک ناقابلِ برداشت جسارت تھی۔

مولانا اپنے خیالات کا اظہار کُھلّم کُھلّا اور لگی لِپٹی کے بغیر کر دیتے تھے۔ رَو میں بہہ جانے والے لوگوں نے خاص کر بعض عُلماے کرام نے انھیں بہت کچھ بُرا بھلا کہا اور اخباروں اور رسالوں میں لَعن طَعن ہوتی رہی مگر وہ ٹَس سے مَس نہ ہوئے۔

ایک دن جب وہ تفسیر کا درس دے رہے تھے، مولانا محمد علی جوہر جنھوں نے اس زمانہ میں اپنا مُستقر علی گڈھ بنالیا تھا، طلبہ کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) میں تشریف لائے۔ اور قریب آ کر مولانا پر ایک طنزیہ فقرہ چُست کر دیا............

اس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اور سُنا۔ مولانا کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے مَوقِف پر ڈٹے رہے۔ بلکہ اس گرما گرم بحث میں مولانا محمد علی جوہر جیسے شخص کو نیچا دکھا دیا۔

اُس دن میں نے مولانا کو بڑے جلال میں دیکھا۔ اُن کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ:

''آپ لوگوں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو تماشہ بنا دیا ہے۔ میں زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ کون حق پر ہے؟'' (ص ۹۲۔ ماہنامہ ضیائے حرم۔ لاھور۔ شمارہ جون ۱۹۷۷ء)

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے وصال (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی خبر دیتے ہوئے روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور نے ''آہ! مولانا احمد رضا خاں صاحب'' کے عنوان سے ایک اِداریہ لکھا تھا جس کا یہ تاریخی حصہ پڑھنے کے لائق ہے جس سے حقیقتِ حال بخوبی واضح ہوجاتی ہے:

''ترکِ موالات کے متعلق مرحوم کی رائے یہ تھی کہ:

مسلمانوں کے لئے ترکِ موالات کا حکم صاف اور عام ہے تو اس میں اِستثنا کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ کہ:

جب اسلام میں یہود و نصاریٰ اور مُشرکین کے ساتھ یکساں ترکِ موالات کا حکم ہے تو جس طرح انگریزوں اور ان کی حکومت سے ترکِ موالات کیا جاتا ہے ویسے ہی ہندوؤں سے بھی جو مُشرکین میں شمار کیے جاتے ہیں، ترکِ موالات ہونی چاہیئے۔

یہ منطق نہایت کمزور ہے کہ انگریزوں سے تو ترکِ موالات ہو اور ہندوؤں سے محض سیاسی اتحاد کے لئے موالات رَوا رکھی جائے۔'' (روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور۔ شمارہ ۳ر نومبر ۱۹۲۱ء)

❑❑❑

ڈاکٹر اقبالؔ اور سید سلیمان ندوی کا مَوقِف

شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبالؔ (متوفی ۱۹۳۸ء) اِبتداءً پنجاب خلافت کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد انھوں نے اس کمیٹی سے استعفا دے دیا۔

اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر اقبالؔ لکھتے ہیں کہ:

............''گرامی صاحب کی خدمت میں **السَّلامُ علیکُم** عرض کیجیے۔

سُنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں اِستعفا دے دیا؟ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔

جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لئے خطرناک تھا۔ ۱۱ر فروری ۱۹۲۰ء۔ (ص ۲۷۔ مکاتیبِ اقبالؔ بنام نیاز الدین خاں۔ مطبوعہ بزمِ اقبالؔ لاہور۔ ۱۹۵۴ء)

پروفیسر حاکم علی (اسلامیہ کالج، لاہور) نے ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کے سلسلے میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) سے اِستفتا کیا تھا جس کا تحقیقی و تفصیلی جواب آپ نے تحریر فرمایا۔ کالج کی جنرل کونسل نے اس کی روشنی میں ترکِ موالات کے خلاف قرارداد پاس کی۔ لیکن جب انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا اجلاس ۲۱ر نومبر ۱۹۲۰ء کو

ہواتو علی برادران اور مولانا آزاد نے ترکِ موالات کی حمایت میں زوردار تقریریں
کیں۔انجمن کے صدر سر شیخ عبدالقادر نے اسے سخت ناپسند کرتے ہوئے اپنی تقریر میں اس
کا جواب دیا۔ڈاکٹر اقبال انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جنرل سکریٹری تھے۔انہوں نے اپنا
خیال اور موقف پیش کرتے ہوئے کہا:

''میں ہمیشہ ہر معاملے کو مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک کسی اَمر میں پورا
غور و خوض نہیں کر لیتا ہوں، قطعی رائے نہیں قائم کرتا۔

میں مسلمانوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ:

آج اگر وہ شریعت کے اَحکام پر نہ چلے تو ہندوستان میں ان کی حیثیت اسلامی نقطۂ نظر
سے بالکل تباہ ہو جائے گی۔'' (ص:۶۴۔اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام لاہور، از محمد حنیف
شاہد۔مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء)

شاعرِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) کے صاحبزادے مسٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال نے اصولی طور پر خلافت یا ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ نہ لیا۔کیوں
کہ وہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریکِ ترکِ موالات میں شامل ہونا پسند نہ کرتے
تھے۔مسلمانوں کے احتجاجی اور ایجی ٹیشنل سیاست میں مُلوّث ہونے کے بھی خلاف تھے۔

علاوہ اس کے انھیں شُبہ تھا کہ ان تحریکوں کے لیڈر گو بظاہر مسلمان تھے لیکن درحقیقت
مسلم قومیت کے بجائے قومیتِ متحدہ کے مبلّغ اور ترجمان تھے۔

اقبال کے علاوہ ہندوستان میں اور شخصیات بھی تھیں جنھوں نے ان تحریکوں میں حصہ نہ
لیا۔بلکہ ان کی مخالفت کی۔

محمد علی جناح ان تحریکات کے خلاف تھے اور کانگریس سے تَرکِ تعلق محض ان تحریکات ہی
کی وجہ سے کیا۔اسی طرح پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان تحریکوں کی مخالفت کی اور بنارس ہندو
یونیورسٹی کو ان کے مُضر اثرات سے محفوظ رکھا۔''

(ص ۲۱۲۔معاصر اسلامی تحریکات اور فکرِ اقبال۔ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی۔تخلیق کار
پبلشر، دہلی۔۱۹۹۹ء)

''یہ سیاست و اقتدار اور آئین و قانون کی بحثیں تو بڑی دِقّت طلب ہیں۔

عُلما اتنا تو سمجھیں کہ انگریز دشمنی کے جذبے میں اگر ہم نے وہی راستہ اختیار کر لیا جس پر
کانگریس چل رہی ہے تو یہ راستہ مغرب کی لادِین اور لااخلاق سیاست کا تو ہوگا، کتاب وسُنّت
کا نہیں ہوگا۔

یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ مسلمان جب کبھی اپنے تصوّراتِ سیاست اور ملّی نَصبُ العین
یا جُداگانہ قومی وجود کے تحفظ کی بحث چھیڑیں تو اسے ''انگریزی اِقتدار کی حمایت،
یا مفاد پرستی'' پر محمول کیا جائے؟

زور دیا جائے تو محض انگریز دشمنی پر۔انگریز دشمنی کوئی مثبت اصولِ سیاست نہیں ہے۔

مسلمان بڑے سادہ ہیں۔اس قسم کی تعبیریں قبول کر لیتے ہیں۔کیا مسلمان سیاست
کو مذھب سے الگ رکھیں؟ اپنے لئے جُداگانہ قومیت کا مطالبہ نہ کریں؟ اس گروہ بندی میں
شامل ہو جائیں جس کی بِنا اِشتراکِ وطن پر ہے؟

اور یہ سب قطعِ نظر اس تصور کے جسے ہندوستانی قومیت کے نام سے اُبھارا جا رہا ہے اس
لئے کہ اَدیان اصلاً سب ایک ہیں؟

یہ ایک خطرناک بات ہے کہ ''اَدیان سب ایک ہیں''۔اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دین فی
الحقیقت کوئی اصولِ اجتماعی نہیں بلکہ ایک اَخلاقی نصبُ العین ہے۔''

(اقبال کے حضور۔جلدِ اول۔بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔شمارہ پنج شنبہ
۹/ جون ۱۹۷۷ء)

علاّمہ اقبال کے صاحبزادے مسٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال مسئلۂ خلافت پر مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر
عدمِ تعاون کی تحریک میں شرکت کے خلاف تھے۔کیوں کہ کسی
''قابلِ قبول ہندو مسلم معاہدہ'' کے بغیر محض انگریز دشمنی کی بنا پر
قومیتِ متحدہ کی تعمیر ممکن نہ تھی۔

علاوہ اس کے انھیں خدشہ تھا کہ کہیں:

ایسے اشتراک اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر قومیتِ
متحدہ کے داعی، ان کی علٰیحدہ ملّی حیثیت نہ ختم کر دیں۔جس کے

سبب بعد میں انھیں پشیماں ہونا پڑے۔

اِنھیں اختلاف کی بنا پر اقبالؔ نے صوبائی خلافت کمیٹی سے اِستعفادے دیا۔''

(ص: ۲۴۸۔ ج دوم۔ زندہ رَوَد۔ از جاوید اقبال۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)

اور جب خلافت کی ''دَریُوزہ گری'' کے لئے مولانا محمد علی جوہرؔ کی قیادت میں ایک وفد پیرس ولندن وروم کے دورے پر گیا (آغازِ سفر فروری ۱۹۲۰ء۔ اختتامِ سفر ستمبر ۱۹۲۰ء) تو انگریز ذہنیت سے واقف اور اس سفر کے کسی مثبت ومفید نتیجہ سے مایوس ڈاکٹر اقبالؔ نے سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) ممبرِ وفد کو خط لکھ کر اپنے مطالعہ ومشاہدہ وتجربہ سے اس طرح آگاہ کیا:

''سفرِ یورپ سے مَعَ الخیر مُراجَعَت مبارک ہو۔ ہندی وفد کوؤزَرَاے انگلستان کا جواب وہی ہے جو''اِن حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے''۔

ڈاکٹر اِقبالؔ نے اسے قومی وملّی توہین سمجھتے ہوئے کہا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے — تُو اَحکامِ حق سے نہ کر، بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تُو گدائی؟
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

ڈاکٹر اقبالؔ اپنے ایک مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) کے اندر واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

''اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھوں بِک جانا گوارا نہیں ہوسکتا۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصل راہ سے بہت دور جاپڑے۔

وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھارہے ہیں جس کو کوئی مخلص ایک منٹ کے لئے قبول نہیں کرسکتا۔'' (ص: ۲۴۹۔ ج دوم۔ زندہ رَوَد۔ از جاوید اقبال۔ مطبوعہ لاہور)

سید سلیمان ندوی، دارُالمصنفین، اعظم گڑھ (متوفی ۱۹۵۳ء) نے تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے دوران اختیار کردہ طرز وطریقہ کی بے اصولی وبے اعتدالی اور سیاسی شور وہنگامہ کو غیر مؤثر وغیر مفید بلکہ مُضِر بتاتے ہوئے اس کی تنقید کی اور انہوں نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے آخر میں یہ فیصلہ کن بات کہی:

''زمانہ خود اس کا فیصلہ کردے گا کہ آخری فوز وفلاح کی بہترین صورت کیا ہے؟ مادّیت پرستی کی وہ راہ جس پر یورپ وامریکہ اور ان کی تقلید میں ایشیا کے بھی مصلحین ورہبران چل پڑے ہیں۔

یا اصلاحِ باطن، تزکیۂ نفس، وصَفائے روح کا وہ مَسلک جس کی ہدایت:

جملہ اَنبیائے کرام، جملہ ھادیانِ مذاہب، جملہ عارفانِ اَخلاق، شروع سے آج تک کرتے آئے ہیں۔'' (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ۔ صوبہ اتر پردیش۔ ۱۹۲۰ء)

□□□

شُدِّھی تحریک اور جماعتِ رضائے مصطفیٰ، بریلی

ہندوؤں کو منظّم اور مسلمانوں کے خلاف متحرک کرنے کے لئے سُوامی دَیانَند سَرَسُوَتی نے ۱۰؍اپریل ۱۸۷۵ء کو ''آریہ سماج'' کے نام سے بمبئی میں ایک تنظیم قائم کی جس کا پہلا باضابطہ اجلاس ۲۴؍جون ۱۸۷۷ء کو لاہور کے اندر ہُوا۔ اور اس تنظیم کو اس کے اغراض ومقاصد کے ساتھ ہندوستان بھر میں سرگرم کرنے کے لئے متعدّد تجاویز اور قراردادیں پاس ہوئیں۔

سُوامی دیانند سرسوتی نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کے لئے ایک کتاب بنام'' ستیارتھ پرکاش'' لکھی جس میں قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی کو بطورِ خاص نشانہ بنایا۔

اس سوامی دیانند سرسوتی کی موت (۳۰؍اکتوبر ۱۸۸۳ء) کے بعد سوامی کا جانشین سُوامی شرَدھانَند (مقتول ۲۳؍دسمبر ۱۹۲۶ء) ہُوا جس نے مسلمانانِ ہند کو ہندو بنانے کی متعصّبانہ وجارحانہ مُہم بنام شُدّھی کا مُنظّم آغاز کیا۔

شُدھی کا مطلب ہے کہ مسلمانوں کو پاک وصاف کر کے انھیں ہندو بنالیا جائے۔ اس شُدّھی تحریک سے دہلی، پنجاب (بشمول موجودہ صوبہ ہریانہ) متھرا، آگرہ، جھانسی، اَلوَر، بھَرت پور وغیرہ کے مختلف علاقے بہت زیادہ متأثر ہوئے اور ہزار ہاہزار سادہ لوح وغُربَت زدہ مسلمان دائرۂ اسلام سے نکل کر ہندوؤں کی آغوش میں چلے گئے۔ مَعاذَ اللّٰہِ رَبِّ العٰلَمِیْن۔

۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۴ء میں شُدّھی تحریک نے مَلکانہ وراجپوتانہ میں بڑی تیاری اور تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلادیے۔ اس شُدّھی تحریک یعنی تحریکِ اِرْتِدادِ مسلمین کی روک تھام کے لئے سب سے پہلے عُلماے اہلِ سُنّت میدانِ عمل آئے۔

چنانچہ فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے دونوں شہزادگان، حُجّۃ الاسلام مولانا محمد حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ومفتیِ اعظم مولانا محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی نوری بریلوی (وصال محرم ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) کی سرپرستی وصدارت میں بروزِ جمعہ بعد نمازِ مغرب ۸؍جمادی الآخرہ ۱۳۴۱ھ/مطابق ۲۶؍جنوری ۱۹۲۳ء، مسجد بی بی جی، بریلی میں فتنۂ اِرتداد کے خلاف منصوبہ بندی واِقدام کے سلسلے میں امام احمد رضا کی قائم کردہ ''جماعتِ رضائے مصطفیٰ'' (تشکیل در ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کی جانب سے ایک بڑا اِجلاس ہوا۔ اِس اجلاس میں شرکت اور اسے خطاب کرنے والے عُلماے اہلِ سُنّت کے اَسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

صدرُالافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، مولانا رحم الٰہی منگلوری سہارن پوری، مولانا عبدالعلیم صدّیقی میرٹھی، مولانا حسنین رضا بریلوی، مفتی محمد عبدالباقی بُرہانُ الحق رضوی جبل پوری، مولانا اَبرارحسن تلہری شاہجہاں پوری، مولانا سید غُلام قطب الدین سَہسوانی، مولانا حشمت علی رضوی پیلی بھیتی، مولانا سید ایوب علی رضوی بریلوی، نواب وحید احمد خاں بریلوی، اور منشی فدایار خاں بریلوی نیز اساتذۂ دارالعلوم منظرِ اسلام بریلی وعمائد ومُعزّزینِ شہر بریلی۔

اِس اِجلاس میں صدرُالافاضل حضرت مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) کی تقریر کی رپورٹ، ہفت روزہ دبدبۂ سِکندری، رام پور (صوبہ اتر پردیش، انڈیا) میں اس طرح شائع ہوئی:

''استاذُالعُلما حضرت مولانا مولوی حکیم محمد نعیم الدین صاحب مُدَّ ظِلُّھُمُ العَالِی نے اسلام کی حقانیت اور اس کی عظمت کا ایسا نقشہ صفحاتِ قلوب پر کھینچا جس سے مسلمانوں کے دِل اسلام کی محبت کے مَزے لینے لگے۔

اور اس فتنۂ اِرتداد کا اِس طرح بیان فرمایا کہ:
مجمع کا دل دَہل گیا اور مجمع چیخیں مار مار کر رونے لگا۔

آپ نے مسلمانوں کو اِتباعِ شریعت کی طرف توجہ دلائی اور اَحکامِ اسلامی کی خلاف ورزی کو مسلمانوں کی کمزوری اور مخالفینِ اسلام کی جرأت و ہمت کی عِلّت ثابت کیا۔

الحمدُ لِلّٰہ ! اس کا اثر مُرتّب ہوا کہ مجمع نے بِالاِعلان بلند آوازوں سے تمام خلافِ شرع باتوں سے توبہ کی۔

آپ نے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ ایک وقت مسائلِ شرعیہ سیکھنے کا مقرر کریں۔

پھر وفد کے جانے اور اپنے بہکے ہوئے بھائیوں کو راہ پر لانے اور ان کی دینی خدمت کرنے کا ذکر کیا۔

اور یہ بھی بتایا کہ اس وفد کو کسی کی مخالفت اور مباحثہ وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ وفد اپنے اسلامی بھائیوں کو پابندِ اسلام بنانے کی کوشش کرے گا۔

ایک ایک کلمہ جو آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتا تھا۔ دِلوں میں اُتر جاتا تھا۔'' الخ

(ص ۵۔ دبدبۂ سکندری، رام پور (صوبہ اتر پردیش۔انڈیا) شمارہ ۵ر فروری ۱۹۲۳ء)

اس اِجلاس میں طے کیا گیا کہ:

متأثرہ علاقوں میں تبلیغی وفود بھیجے جائیں۔ جگہ جگہ مدارس و مکاتب قائم کیے جائیں۔ مسلمانوں کو اسلام پر قائم رہ کر اس کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنے کی ترغیب دی جائے۔ گمراہ اور مُرتد ہو جانے والوں کو دعوت و مَوعِظَت کے ذریعہ اسلام سے قریب کرنے اور انھیں دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کی حکیمانہ و داعِیانہ کوشش کی جائے۔ وغیرہ وغیرہ

جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی کا پہلا وفد ۲۷ر جنوری ۱۹۲۳ء کو بریلی سے روانہ ہوا جس نے میرٹھ و بلند شہر و علی گڑھ وغیرہ کے حالات کی سنگینی کا جائزہ لیتے ہوئے اور ان مقامات پر کچھ دَعوتی و تبلیغی کام کرتے ہوئے آگرہ پہنچ کر اسے اپنا تبلیغی ہیڈ کوارٹر بنایا اور اَطراف و جوانب میں آگرہ ہی سے ہر طرح کی تبلیغی سرگرمیوں کا اس نے آغاز کیا۔

بریلی اسٹیشن سے روانگی کے وقت (بروز ہفتہ ۹ر جمادی الاخری ۱۳۴۱ھ/۲۷ر جنوری ۱۹۲۳ء) درجنوں عُلمائے اہلِ سُنّت اور سیکڑوں عوام و خواص کو نواب وحید احمد صاحب بریلوی ناظرِ جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی نے یہ پیغام دیا:

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نَحمَدُہٗ و نُصَلّی عَلٰی رَسُولِہِ الکرِیم ۔ برادران و دردمندانِ اِسلام!

یہ جلسہ آج دل و جگر پر کاری ضرب کھانے کے بعد کراہنے اور ٹھنڈی آہیں کھینچنے اور اپنی بدنصیبی پر رونے کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔

افسوس! اسلام جیسا مقدس مذہب جس کے سامنے دنیا سَرِ نیاز خم کیے چلی جاتی ہے اور آئے دن قوموں کی قومیں اور فوجوں کی فوجیں اس کے حلقۂ اِطاعت میں داخل ہوتی رہتی تھیں، آج ہم بدنصیب، کم ہمت، نامَرد، بُزدل، غفلت شِعار، ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی بے پَروائیوں کی بدولت اس حال کو پہنچ گیا کہ ہنود جیسی قوم کہ جس کے یہاں ایک خارج شدہ ہندو کو پھر اپنے مذہب میں واپس لینا دشوار ہے، گاؤں گاؤں میں شُدّھی سبھائیں قائم کرے اور ساڑھے چار لاکھ مسلمانوں کو ہندو بنا ڈالنے کے اعلان پر اعلان کرائے؟

مسلمان کسی پر چڑھ کر نہیں گئے۔ کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلکہ اِتحادِ ہنود میں محو ہو رہے ہیں۔ ان کے لیڈر اپنے مذہبی شعائر تک کو اس اتحاد کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

ریاستِ حیدر آباد دَکن میں ان کی خاطر ذبیحۂ گاؤ کو بند کر کے مسلمانوں کو ان کے جائز شرعی مذہبی حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس پر بھی ہندوؤں کا غصہ کسی طرح فرو نہیں ہو سکتا اور ان کی آتشِ غضب کے بھڑکتے ہوئے شعلے دَم بَدم ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ملتان، لاہور، امرتسر، آرہ، کٹار پور وغیرہ کے واقعات آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

ہندو مَہاسَبھا کے اِجلاس، گیا (بہار) میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے ہندوؤں میں کیسے اِشتدادی انتظام کی کوشش کی۔ اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف مسلّح کرنے کی رائے دے کر مسلمانوں کے لئے کیسا خطرۂ عظیم پیدا کر دیا ہے؟

برادرانِ اسلام، عُلما کے اِقدام سے ڈر رہے تھے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　　آگے آگے دیکھیے، ہوتا ہے کیا؟

خدا خیر کرے۔ ابھی تو اس سمندر میں طغیانی کے آثار نمودار ہوئے ہیں۔ مَوجوں کا تلاطُم کیا حال کرے گا۔ یہ حال دیکھ کر تمام مسلم اخبارات نے شور برپا کر رکھا ہے کہ عُلمائے اسلام دوڑیں۔ ڈوبتوں کو بچائیں۔ بہکتوں کو سمجھائیں۔ غریب کمزور مسلمانوں کی دست گیری کریں۔

ہندوستان کی مختلف جماعتوں کو بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ طبقۂ عُلما کو بھی آوازیں دی جاتی ہیں۔ روزانہ اخبار دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن اب تک نظر نہیں آیا کہ کوئی جماعت مسلمانوں

کی حمایت میں بے تابانہ میدانِ عمل میں آئی ہو۔اس لئے ''جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی''
نے باوصف کمالِ بے اِستطاعتی، بے سامانی، قدم اٹھایا اور اپنے عُلما کو توجُّہ دلا کر ایک چھوٹا
سا وفد بنا ڈالا جو دس (۱۰) ارکان پر مشتمل ہے۔اور اس وقت آپ کے سامنے اسلامی خدمت
کے لئے کمربستہ تیار ہے۔'' الخ۔(ص ۵ و ۶ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری۔رام پور۔(صوبہ
اتر پردیش، انڈیا) بابت ۵؍فروری ۱۹۲۳ء)

بروز شنبہ بتاریخ ۹؍جمادی الآخرہ ۱۳۴۱ھ/۲۷؍جنوری ۱۹۲۳ء بریلی سے روانہ ہونے
والے تبلیغی و دَعوَتی وفد کی قیادت مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا نوری بریلوی (وصال محرمُ
الحرام ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) نے فرمائی اور دس (۱۰) عُلمائے اہلِ سُنَّت اس وفد میں شامل تھے۔
دس ارکانِ وفد کے اَسما کہیں یک جا نظر سے نہیں گذرے مگر مختلف رپورٹوں سے جو نام
سامنے آتے ہیں ان میں حضرت مولانا الشاہ محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی و حضرت مولانا نعیم الدین
مرادآبادی و حضرت مولانا حشمت علی رضوی پیلی بھیتی و حضرت مولانا سید ایوب علی رضوی
بریلوی کے نام نمایاں ہیں۔

آگرہ میں حضرت مولانا سید دیدار علی اَلوَرِی خطیب و امام شاہی مسجد آگرہ، خلیفۂ
امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی نے وفدِ جماعت کی تائید و حمایت و اِعانت بڑے اخلاص
اور سرگرمی کے ساتھ کی۔اسی طرح آپ کے صاحب زادے ابوالبرکات سید احمد قادری
رضوی اَلوَرِی ثُمَّ لاہوری نے بھی اس وفد کی نصرت و اِعانت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اَضلاعِ میرٹھ و بلند شہر و علی گڑھ کا دَورہ کرتے ہوئے جب یہ وفد آگرہ پہنچا جہاں
سُوامی شَردَھانَند (مقتول ۱۹۲۶ء) نے ''شُدّھی بھارتی سبھا'' قائم کر کے آگرہ کو اپنا ہیڈ
کوارٹر بنا رکھا تھا، تو مسلمانانِ آگرہ نے جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی کا والہانہ اور پُرجوش
اِستقبال کیا۔جس کی ایک مطبوعہ رپورٹ یہ ہے:

''وفدِ اسلام دَورہ کرتا ہُوا آگرہ پہنچا۔یہاں کے مفتیِ شہر حضرت مولانا مولوی سید محمد
دیدار علی صاحب (اَلوَرِی) اور ان کے فرزندِ اَرجمند جناب مولانا مولوی مفتی سید احمد
صاحب نے اس وفد کا کمالِ احترام کیا اور اس کی اِعانت میں بہت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے
رہے۔ان کی محنتوں اور مخلصانہ کوششوں سے وفد کو اپنی ابتدائی حالت میں بڑی تقویت ہوئی۔
انھیں کے اثر سے شہر کے باشندوں نے وفد کے ساتھ بہت ہمدردی کی۔جن میں

جناب حاجی ولی اللہ خاں صاحب اور جناب منشی وارث علی خاں صاحب اور جناب منشی کریم
صاحب خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

یہ اصحاب، وفد کی ہر طرح کی اِعانتِ قلبی، اِخلاص کے ساتھ فرما رہے ہیں۔جَزَاھُمُ
اللّٰہُ خَیرًا لجزَاء۔

(ص ۱۱۔رَودادِ جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی۔سالِ چہارم ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء)

وفدِ جماعتِ رضائے مصطفیٰ، بریلی سب سے پہلے سلطان پورہ آگرہ، یکم فروری کو پہنچا
۔اور وہاں سے اس نے شاہی جامع مسجد آگرہ پہنچ کر اس کے امام و خطیب سے ملاقات
و گفتگو کی اور ۲؍فروری ۱۹۲۳ء بروز جمعہ ایک دینی و تبلیغی اِجلاس کا اہتمام کیا گیا جس میں
شاہی جامع مسجد آگرہ کے امام و خطیب نے دل چسپی کے ساتھ ہر طرح تعاون فرمایا۔

اس جلسۂ جمعہ در شاہی جامع مسجد آگرہ کے سلسلے میں منشی وارث علی خاں صاحب ٹھیکہ
دار، محلّہ رکاب گنج، آگرہ کا ایک مُراسلہ محرَّرہ ۳؍فروری ۱۹۲۳ء دبدبۂ سکندری، رام پور میں
اس طرح شائع ہوا:

''۲؍فروری ۱۹۲۳ء بروزِ جمعہ جامع مسجد، آگرہ میں یہ وفد پہنچا اور اس نے مسلمانانِ
آگرہ کو ہوشیار کیا۔

مجمع بہت کثیر تھا۔اَجزائے وفد میں اوّل دو صاحبوں نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ
نعت شریف پڑھی۔پھر مفتیِ آگرہ حضرت فاضل علّامہ جناب مولانا مولوی سید ابو محمد محمد دیدار
علی صاحب اَلوَرِی مُدَّ ظِلُّہُ العَالِی نے مختصر لفظوں میں وفد کا ورود اور اس کے مقاصد بیان
فرما کر اَجزائے وفد میں سے حضرت استاذُ العُلما مولانا مولوی حکیم حافظ محمد نعیم الدین صاحب
مرادآبادی مُدَّ ظِلُّہُ الھادِی کو وعظ کے لئے پیش فرمایا۔

انھوں نے دینِ اسلام کی عظمت و شان کا ایسا نقشہ کھینچا جس سے تمام مجمع ایک
غیر معمولی اثر کے ساتھ متأثر نظر آتا تھا۔کلمات جادو کی طرح اثر کرتے تھے۔سامعین کی
حالت دَم بھر میں بدل گئی اور جلسہ تڑپ اٹھا۔سننے والے روتے روتے بے حال ہوگئے۔
مسلمانوں نے شریعت کی فرماں برداری کے عہد کیے اور گناہوں سے بآوازِ بلند تائب
ہوئے۔

ایک عجیب سماں تھا۔جو موجود تھے، توبہ کر رہے تھے۔اور ان کے قلوب میں اسلامی

محبت موجیں مار رہی تھیں۔ راج پوتوں کے ساتھ ہمدردی کا ولولہ ہر دل میں پیدا ہو گیا۔

جلسہ تمام ہونے کے بعد شہر میں جا بجا اس وعظ کا تذکرہ ہے۔ اور جو لوگ حاضر تھے وہ اپنے اَحباب سے توبہ کرا رہے ہیں۔

وفد کی اس شان و شوکت سے یقین ہوتا ہے کہ اِن شَاءَ اللّٰـہ تَعالیٰ اس کی سَعی کامیاب ہوگی۔'' الخ

المرقوم ۳؍فروری ۱۹۲۳ء۔ مطبوعہ ص ۵ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری رام پور (صوبہ اتر پردیش۔ انڈیا) شمارہ ۱۲؍فروری ۱۹۲۳ء)

صدرُالافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی کی ایسی تقریر اس اِجلاس میں ہوئی جو دِلوں کو چھو گئی اور سامعین کے اسلامی جذبات ان کے سینے میں موج زَن ہو گئے۔

مفتیِ اعظم مولانا الشاہ محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی اس پُر اثر تقریر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارا وفد جامع مسجد (آگرہ) پہنچا جہاں مسلمانوں کا بڑا مجمع تھا۔ نمازِ جمعہ کے بعد ہمارے وفد کے بہترین مُبلّغ حضرت مولانا المحترم مولوی محمد نعیم الدین صاحب زِیــدَتْ بَرکاتُہُ نے اسلام کی شان و شوکت اور موجودہ حالتِ زار پر دل گداز تقریر فرمائی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجمع ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور مسلمانوں کے دل اسلامی جوش سے لَہریں مار رَہے تھے۔...............

اس موقع پر مولانا نے داڑھیاں مونڈانے اور کبائر میں مبتلا ہونے والوں سے توبہ کرائی۔ مسجد کا وسیع صحن، توبہ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اَلحَمدُ لِلّٰہ! مولانا نے ثابت کیا کہ اس وقت اسلامی اَحکام کے خلاف عمل کرنا، اسلام کو اس نازک حالت میں صدمہ پہنچانا اور اس کے دشمنوں کی تائید ہے۔

جلسہ کے ختم ہونے کے بعد جا بجا اس وعظ کے چرچے تھے۔ اور معلوم ہوا کہ جو لوگ جلسہ میں توبہ کر گئے تھے، وہ اپنے دوستوں سے توبہ کرانے پہ مُصِر ہیں۔

(مکتوب مؤرخہ ۱۵؍جمادی الآخرہ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء۔ بنام ناظم جماعتِ رضائے مصطفیٰ۔ مرکزی دفتر بریلی۔ مطبوعہ ص ۸۔ دبدبۂ سکندری، رام پور۔ شمارہ ۱۹؍فروری ۱۹۳۲ء دوشنبہ)

اس دور کے مذہبی اور سیاسی حالات سے واقفیت کے لئے ڈاکٹر اقبالؔ کے دوست

مولانا غلام بھیک نیرنگ (وکیلِ انبالہ، پنجاب) کے ایک مضمون بعنوان ''اقبالؔ کے بعض حالات'' کا یہ حصہ ملاحظہ فرماتے چلیں:

''۱۹۲۳ء کے آغاز میں اسی سلسلہ کی ایک منظّم اور اعلانیہ شُدّھی تحریک آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹہ، وغیرہ اَضلاع میں جاری ہوئی۔ اور مسلمانوں نے اس حملہ کی مدافعت کے لئے ان شُدّھی زدہ علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے۔

اس زمانے میں جو تجربات و مشاہدات ہوئے، ان کے پیشِ نظر راقم نے یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو بہ مشورہ و اِمداد بعض اکابرِ مِلّت مثل حاجی مولوی سَر رحیم بخش مرحوم، مولانا عبدالماجد بدایونی، نواب عبدالوہاب خاں مرحوم۔ ایک مرکزی ''جمعیت تبلیغ الاسلام'' قائم کی جو بفضلہٖ تعالیٰ اب تک قائم ہے۔

چوں کہ اقبالؔ کو تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا خاص شوق تھا (اس لئے) وہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں ہماری اس جمعیت کے ممبر ہو گئے۔'' (ص ۲۲۔ سہ ماہی اقبال۔ لاہور۔ شمارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء۔)

چنانچہ سَر اقبالؔ اپنے ایک مکتوب مُحرَّرہ ۵؍دسمبر ۱۹۲۸ء بنام مولانا غلام بھیک نیرنگ (انبالہ، پنجاب) میں فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام تمام کاموں پر مقدَّم ہے۔
اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد، سیاسیات سے محض آزادی اور
اِقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اِسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے
جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رَوَیّہ سے معلوم ہوتا ہے تو
مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

یہ بات میں علیٰ وجہِ البصیرت کہتا ہوں۔ اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد۔ ہندوستان کے سیاسیات کی رَوِش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہبِ اسلام کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔

اور میرے خیال میں شُدّھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ یا کم از کم یہ شدھی بھی اسی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔

بہر حال! جس جاں فشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اَجر حضور سرورِ کائنات

ﷺ ہی دے سکتے ہیں۔آپ کے ایجنٹ کے طور پر کچھ کہنے سننے کو حاضر ہوں۔مگر آپ اور مولوی عبدالماجد بدایونی، جنوبی ہند کے دورہ کے لئے تیار رَہیں۔'' (سہ ماهی اقبال، لاهور، ۱۹۵۷ء)

یہاں یہ حقیقت واضح رہے کہ ۱۹۲۳ء ہی میں آر ایس ایس لیڈر ویر ساوَرکر کی ایک نظریاتی کتاب ''ہندوتوا'' منظرِ عام پر آئی جس میں ''ہندو'' کی ایک مستقل حیثیت اور شناخت پر زور دیا گیا۔''ہندوتوا'' کو قومی شناخت کی علامت ظاہر کیا گیا۔جس کا صاف وصریح مطلب ہے کہ ''غیر ہندو'' کی قومیت بالکل علیحدہ ہے۔

اسی لئے سیاسی طور پر دوقومی نظریہ کا بانی ویر ساوَرکر کو کہا جاتا ہے۔جس کا پیغام ہے کہ:

''ہندو مذہب، ہندو تہذیب، ہندو زبان، ہندو وطن، ہندو آئین، ہندو قوم، سب کچھ دوسروں سے ممتاز اور بالکل الگ ہے۔''

سُوامی شَرد ھانند (مقتول دسمبر ۱۹۲۶ء) کی نہایت خطرناک تحریک شُدّھی یعنی تحریکِ اِرتدادِ مسلمین میں پنڈت کالی چرن، پنڈت رام چندر اور دَھرم بھکشو لکھوو غیرہ پیش پیش تھے، جن کا عُلما و مبلّغینِ اسلام نے مَردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے ہَزاروں لاکھوں مسلمانوں کے ایمان واسلام کا تحفظ کیا۔

لیکن تحریکِ اِرتداد کے سَدِّ باب کے لئے مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی تدابیر ومساعی کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ:

تحریکِ خلافت وتحریکِ موالات وھجرت کے عُلما وزُعَما وقائدین نیز دیگر قوم پرست مسلم لیڈروں کا کوئی قابلِ ذکر اور مؤثر کردار شُدّھی تحریک کے خلاف دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا اور لاکھوں مسلمانوں کے اِرتداد کا طوفان انہیں خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔کچھ یہی حال جمعیۃُ العُلماء کا بھی ہے۔اس نے بھی اپنے وسائل واَفراد کے لحاظ سے وہ کردار اَدا نہیں کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔

کیا اس کے پسِ پُشت نظریۂ ''قوم پرستی'' ''مُتَّحِدہ قومیت'' اور ''ہندو مسلم اِتحاد'' کے واضح اثرات ونتائج کار فرما نہیں ہیں؟؟؟

اَربابِ بصیرت اور دیدہ وَر مسلم تاریخ نگاروں کو اس پہلو پر غور کر کے اس کا صحیح تجزیہ کرنا چاہیے کہ شُدّھی تحریک (یعنی تحریکِ اِرتدادِ مسلمین ۱۹۲۳ء) کی طرف سے عُلما وزُعَمائے تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات نے کیوں چشم پوشی وغفلت برتی؟ اس اجتماعی بے حسی وبے اِعتنائی کے اَسباب ومحرّکات کیا تھے؟ اِرتداد جیسی خطرناک طوفانی مُہم بھی ان کی ایمانی غَیرت وحَمیَّت کو بیدار کیوں نہ کر سکی؟ جس نے ان کے مومنانہ ضمیر کے وجود پر ایک نمایاں سوالیہ نشان لگادیا؟ اور جمعیۃُ العُلما بھی کوئی اہم اور سرگرم کردار کیوں نہ ادا کر سکی؟

اس کا صحیح جواب بھی مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کر کے انہیں مستقبل کی اس طرح کی ممکنہ غلطی سے مکمل اِجتناب واِحتراز کا پیغام دیا جانا بے حد ضروری ہے۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی قائم کردہ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی شریف (تشکیل در ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے شُدّھی تحریک ۱۹۲۳ء کے مقابلے میں علاقۂ آگرہ ومیوات وراج پوتانہ میں اپنا وفد بھیج کر اس کا سیلاب روکا اور لاکھوں مسلمانوں کو مُرتد ہونے سے بچایا۔

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے رُکن ومبلّغ ابوالبرکات مولانا سید احمد قادری اَلْوَرِی ثُمَّ لاہوری تحریر فرماتے ہیں:

''بحمدِ اللّٰہ ہمارا وفد راج پُوت علاقوں میں سرگرم ہے۔اِشاعت وتبلیغ اسلام کی اہم مصروفیتوں میں اِتنا وقت نہیں مل سکا کہ حالات کی اطلاع دی جاسکتی۔اس لئے آج ایک عرصہ کے بعد اطلاع دی جارہی ہے۔

حالات ایسے اِضطراب انگیز ہیں کہ کوئی وقت فرصت واطمینان کا نہیں ملتا۔جہاں کام کیا جاتا ہے وہاں کے مہمّات، شبانہ روز کی مصروفیت چاہتے ہیں۔

مزید برآں دَم بدَم ہر طرف سے وحشت انگیز خبریں پہنچتی ہیں۔آریہ لیکچرر جابجا پھر رہے ہیں۔انھوں نے یہاں کے راج پُوتوں میں ایک عجیب خلفشار پیدا کر دیا ہے۔''
(ص ۳ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور۔بابت ۱۲/مارچ ۱۹۲۳ء)

طرح طرح کے مسائل اور قلّتِ وسائل کے ساتھ کام کی وُسعت کا یہ حال تھا کہ مولانا سید ایوب علی رضوی بریلوی (وصال رمضان ۱۳۹۰ھ/نومبر ۱۹۷۰ء) لکھتے ہیں:

''ہمارا کام علاقۂ اِرتداد کے مختلف اَضلاع میں ہے جن کی تعداد دس (۱۰) کے قریب ہے۔ بہت سی اسلامی جماعتیں ہمارے ساتھ شریکِ عمل ہیں اور ہماری جماعت (رضائے مصطفیٰ بریلی) مرکزی حیثیت سے ایک عُمدہ نظام کے تحت مؤثر کام کر رہی ہے۔

ہماری جماعتوں کے تبلیغی مدارس کثیرُ التعداد ہیں اور بہت سے مبلّغ مصروفِ عمل ہیں۔''

(ص ۱۹۔ رودادِ جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی۔ سالِ چہارم ۱۳۴۲ھ/۲۴۔۱۹۲۳ء)

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی آگرہ برانچ کے ناظمِ دفتر کی طرف سے اخبارات و رسائل میں یہ اعلان شائع ہوا:

''علاقۂ اِرتداد بہت وسیع ہے۔ بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں اب تک کسی جماعت کا کوئی مبلّغ نہیں پہنچا ہے۔ اس لئے مزید مبلّغوں کی سخت ضرورت ہے۔

اسلامی انجمنوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ:

تبلیغِ اسلام کا کام کرنے کے لئے جلد از جلد مبلّغین بھیجنے کا انتظام کریں۔ اور جو انجمنیں مبلّغین کا خرچ نہ اُٹھا سکیں اور ان کے پاس کام کرنے والے آدمی ہوں، ایسے آدمیوں کا بھیج دینا ضروری ہے۔

مبلّغین، جماعت (رضائے مصطفیٰ) کے صدر دفتر آگرہ، محلّہ رکاب گنج میں پہنچیں۔''

(ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور۔ شمارہ ۱۱/جون ۱۹۲۳ء)

ممبر وفدِ جماعت رضائے مصطفیٰ حضرت مولانا حشمت علی لکھنوی ثم پیلی بھیتی (وصال ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) نے شُدّھی تحریک یعنی فتنۂ اِرتداد کے خلاف جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے میدانِ عمل میں آنے اور آگرہ کو اپنا صدر مقام بنا کر متأثرہ علاقوں میں تبلیغی سرگرمیوں کے

بالکل ابتدائی دور میں ہی تحریر فرمایا تھا کہ:

''جمعیۃُ العُلماء و خلافت کمیٹی کی طرف سے ابھی تک کوئی عملی خدمت شروع نہیں کی گئی، باوجود یہ کہ ان جماعتوں کے پاس کافی روپیہ اور کثیرُ التعداد مبلّغ اور لکچرار بھی ہیں۔

اگر ان میں سے ایک جُزو اِس کام پر مامور کر دیا جاتا تو اِن جماعتوں کی شان سے کچھ بعید نہ ہوتا۔ لیکن نہ معلوم یہ جماعتیں اس کام کو کیوں غیر ضروری سمجھتی ہیں؟ اور پانچ لاکھ مسلمانوں کے ایمان کا خطرہ انہیں بے چین کیوں نہیں کرتا؟

مسلمانوں کی غفلت کب تک رہے گی؟ اور وہ اپنے دین پر ایسے زبردست حملے دیکھ کر بھی ہوش میں نہ آئیں گے؟ (ص ۴، دبدبۂ سکندری، رام پور، مؤرخہ ۱۶/فروری ۱۹۲۳ء۔ وص ۹۵۔ تحریک شُدّھی اور عُلمائے اہلِ سُنّت، مؤلّفہ محمد شہاب الدین رضوی، مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی۔ ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء)

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی قائم کردہ تنظیم ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' (تشکیل ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) اور عُلمائے اہلِ سُنّت نے شُدّھی تحریک کے مقابلے میں بڑا ہی گراں قدر اور اَہم کردار ادا کیا۔ صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، صدرُ الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، محدّثِ اعظم ہند مولانا سید محمد اشرفی کچھوچھوی، حُجّۃُ الاسلام مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی، مفتیِ اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا قادری بریلوی، مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی، مولانا ابوالبرکات سید احمد اَلوَرِی ثُمَّ لاہوری، شیر بیشۂ اہلِ سنّت مولانا حشمت علی لکھنوی وغیرھُم کی خدمات اور شُدّھی مخالف تبلیغی مساعی ناقابلِ فراموش ہیں۔

شُدّھی تحریک کے زہریلے جَراثیم اور خطرناک مَفاسِد کے اِزالہ کے سلسلے میں مَلکانہ یعنی آگرہ و متھرا و بھرت پور و اَلوَر وغیرہ میں جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی کی مَساعیِ جمیلہ کو حضرت سید شاہ ابوالقاسم اسمٰعیل حسن عُرف شاہ جی میاں قادری برکاتی مارَہروی (وصال صفر ۱۳۴۷ھ) کی خصوصی سرپرستی کے علاوہ اُس وقت (۱۹۲۳ء) کی دو عظیمُ المرتبت شخصیتوں

اور مقبولِ عوام وخواص بزرگوں (۱) امیرِ ملّت سید جماعت علی شاہ محدّث علی پوری سیالکوٹی (وصال ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء) اور شیخُ المشائخ سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (وصال ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء) کی مکمل روحانی وعملی تائید وحمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ جن کے وفود اور مُبلّغین نے جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے مَلکانہ راجپوتوں کے علاقوں میں قریہ قریہ گھوم کر اور اپنی جان جُوکھم میں ڈال کر ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو اِرتداد سے محفوظ رکھا اور ہزاروں وہ مسلمان جو اِرتداد کا شکار ہوچکے تھے انھیں دوبارہ کلمہ پڑھا کر مشرّف باسلام کیا۔

عُلمائے بدایوں میں مولانا عبدالماجد قادری بدایونی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عبدالصمد مقتدری بدایونی تحریکِ اِرتداد کے خلاف میدانِ عمل میں سرگرم رہے اور تحفظ ودِفاعِ اسلام کی مخلصانہ خدمت انجام دی۔

شُدّھی تحریک کے خلاف سینہ سپر ہونے والی اسلامی تنظیموں میں جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے علاوہ جماعتِ اشرفیہ، کچھوچھہ ضلع فیض آباد، وانجمن خُدّامُ الصُّوفیہ علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ، پنجاب، ومرکزی جمعیت تبلیغِ اسلام اَنبالہ، پنجاب کے نام نمایاں ہیں۔

تفصیلات ۱۹۲۳ء و۱۹۲۴ء کے رسائل ومجلّات بِالخصوص دبدبۂ سکندری، رام پور وعلی گڑھ گزٹ واشرفی کچھوچھہ، والفقیہ امرتسر میں تاریخی ریکارڈ کے طور پر درج ہوچکی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب "جماعت رضائے مصطفیٰ" نیز "تحریکِ شدھی اور عُلمائے اہلِ سُنّت" مؤلّفہ مولانا محمد شہاب الدین رضوی مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی کا مطالعہ کرکے اس وقت کے حالات وکوائف اور جماعت کی خدمات، ہر طرح کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مزید مطالعہ اور تحقیق وتنقیح کے بعد شائع کی جائیں تو ان کی اہمیت واِفادیت دوچند ہوسکتی ہے۔

شُدّھی تحریک کے خلاف میدانِ عمل میں آنے کے بعد جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی (تشکیل در ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کا کچھ گجراتی اہلِ عقیدت اور مخلصین نے خاصا مالی تعاون کیا۔ اِسی طرح اس جماعت کی مالی اِعانت عالی جناب چودھری عبدالحمید، رئیسِ سہاور ضلع ایٹہ (صوبہ اتر پردیش۔ انڈیا) نے مخلصانہ طور پر کی اور دوسرے اہلِ ثروت مسلم رؤسا کو بھی

اس کی طرف متوجہ کیا۔

علی گڑھ کے شِروانی رؤسا نے بڑھ چڑھ کر جماعتِ رضائے مصطفیٰ، بریلی کی طرف دستِ تعاون دراز کیا جن میں چند نمایاں نام یہ ہیں:

(۱) آنریبل خان بہادر نواب سَر مُزَّمِّلُ اللہ (چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

(۲) خان بہادر مولانا محمد خلیل الرحمٰن، رئیسِ اعظم وقلعہ دارِ قدیم بھیکم پور، علی گڑھ

(۳) مولانا عُبید الرحمٰن خان بہادر، رئیسِ اعظم بوڑھانسی۔ علی گڑھ

(۴) حاجی محمد یوسف خان بہادر، رئیسِ بوڑھانسی۔ علی گڑھ

(۵) حاجی محمد صالح خان بہادر، رئیسِ بھیکم پور۔ علی گڑھ

(۶) نواب محمد عامر مصطفیٰ خان بہادر، رئیسِ کنکر والی کوٹھی، علی گڑھ۔

(۷) خان بہادر نواب محمد ابوبکر خاں، رئیسِ دادوں ضلع علی گڑھ۔

(۸) مولانا حاجی محمد جان خان بہادر، رئیسِ دادوں ضلع علی گڑھ۔

(ص ۱۱ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور، بابت ۱۱/جون ۱۹۲۳ء۔ رپورٹ از ناظمِ وفدِ اسلام۔ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی)

مولانا محمد احسان الحق نعیمی بہرائچی ان مالی مُعاوِنین جماعت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملک کے رؤسا میں وہ پہلا ہاتھ جو حمایتِ اسلام کے لئے بڑھا اور جس نے ڈوبتے بھائیوں کو وَرطۂ حیرت وہلاکت سے نکالنے کے لئے اپنے زرومال کی قربانی دی، وہ شِروانی رؤسا کا ہاتھ ہے۔ ان رؤسا نے اپنی طرف سے ایک وفد شِروانی علاقے میں کام کرنے کے لئے بھیجا جو ماہِ فروری ۱۹۲۳ء سے وفدِ اسلام (جماعتِ رضائے مصطفیٰ) کے ساتھ مل کر کام کررہا ہے۔

جماعت رضائے مصطفیٰ اس کا کیا شکریہ ادا کرسکتی ہے کہ ان حضرات نے اپنے وفد کو اس کے ساتھ ملحق کردیا۔ جب کہ جماعت رضائے مصطفیٰ کو آج تک کسی چندہ کی اپیل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

.........ہم اپنے ان مُحسن اور حامیِ اسلام رؤسا کے حق میں اس وقت اور سفر وحضر میں تہِ

دل سے ترقی وکامیابی کی دُعا کرتے ہیں۔'' (ص ۱۱ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور۔ بابت ۱۱؍جون ۱۹۲۳ء)

مولانا حکیم محمد اسمٰعیل رضوی ممبرِ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کے ایک دوست مولانا ضیاءالدین احمد صدیقی کو نواب مُزَّمِّلُ اللہ نے وفدِ شروانی کا رپورٹر بنایا تھا۔ اپنی ایک رپورٹ میں مولانا ضیاءالدین احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''جناب مولانا مولوی محمد مصطفیٰ رضا خاں صاحب بریلی کا یہ ایثار قابلِ اظہار ہے کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑے ہوئے مسلم راج پوت بھائیوں کی اِصلاح کی خاطر آگرہ میں برابر جَمے ہوئے ہیں۔'' (ص ۶ ہفت روزہ دبدبۂ سکندری، رام پور۔ (صوبہ اتر پردیش۔ انڈیا۔) بابت ۱۰؍دسمبر ۱۹۲۳ء)

مولانا حکیم محمد اسمٰعیل صدیقی رضوی وفدِ شروانی کے صدر تھے۔ اس وفد کو شروانی رؤسا کی مکمل مالی سرپرستی حاصل تھی۔ اس وفدِ شروانی کی تیاری وتشکیل میں چودھری عبدالحمید، رئیسِ سہاور ضلع ایٹہ (یوپی) کی کوشش کارفرما تھی۔ اور یہی چودھری عبدالحمید مخلصین ومُعاوِنینِ جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی میں پیش پیش اور نمایاں حیثیت واہمیت کے حامل تھے۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے قدیم مُحِبّین ومُعتقِدین میں تھے۔

عُلمائے بدایوں وبریلی کے مرکزِ عقیدت مارہرہ مطہرہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا سید شاہ ابوالقاسم محمد اسمٰعیل حسن عُرف شاہ جی میاں قادری برکاتی (وصال صفر ۱۳۴۷ھ) اپنے ضعف وپیری کے عالم میں جب کہ آپ کی حیاتِ مستعار کا آخری دَور تھا، حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (وصال ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) کے ایک عنایت نامہ کا جواب دیتے ہوئے آپ کے نام اپنے ایک داعیانہ ومخلصانہ مکتوب میں اس شُدّھی تحریک اور اس کے اثرات ونتائج نیز دعوت وتبلیغ وتحفظ ودفاعِ اسلام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

..........فقیر اس دینی مقصدِ اہم اور مذہبی فرضِ لازم میں اپنی حسبِ وُسعت، دوسری ظاہری تدابیر سے بھی غافل نہیں، اور اپنے اَحباب واَصحاب کو اُوس کے لئے قولاً وعملاً ترغیب وتحریص دیتا اور ان کی اِمداد واِعانت میں حَسبِ مقدرت ساعی ہے۔ اور اِن شاءَ اللّٰہُ الکریم رہے گا۔

اُون میں سے بعض اہلِ خیر برسرِ موقع پہنچ کر اپنی حسبِ وُسعت وضرورت کار تیار ہیں۔

مولیٰ تعالیٰ ان کی سَعی کو کامیاب ومشکور فرمائے۔ آمین

آپ پر بھی ظاہر ہے کہ ہم عالَمِ اسباب میں ہیں۔ جہاں توکُّل کے معنی تدبیر کرکے حوالہ بتقدیر کرنے کے ہیں۔ اور جہاں اب سے پہلے بھی قوتِ روحانی کے ساتھ جدوجہدِ جسمانی اور جَذب وکشِشِ باطنی کے ساتھ سَعی وتدبیرِ ظاہری مُمِد ومُعاوِن رہی ہے اور اس اشتراکِ عمل کی ضرورت اِس وقت زمانہ کی مقتضیات اور اپنی بداعمالیوں، عصیاں پناہیوں کے ہاتھوں، قوتِ روحانی وکشِشِ باطنی کے روز بروز کمزور بلکہ قریب بہ زوالِ کلّی ہوتے جانے سے، اور بڑھ گئی ہے۔

اور اسبابِ ظاہری کے ساتھ لینے کے لئے پہلے قدم پر بڑی ضرورت آکر روپیہ کی پڑتی ہے۔ خُدَّامِ دین کے لئے عیش وراحت کے سامان مہیّا کرنے کو نہیں۔ اُون میں جو سچے دین کے خادِم اور اپنے اَسلافِ کرام اور مشائخِ عِظام کے سچے اَخلاف ہیں، اُونہیں تو اپنے اَکابر واَسلاف کی طرح اب بھی ہر طرح کی جسمانی تنگی وتُرشی برداشت کرکے خدمتِ دین ادا کرنے کے لئے آپ اِنْ شاءَ اللّٰہُ الکریم جَلَّ مَجْدُہٗ آمادہ پائیں گے۔ بلکہ اس کی ضرورت خود دین کی خدمت اور اُون بھائیوں کی حفاظت کے لئے ہے جن پر اَعْدَاے دین نے اپنے دام بچھائے ہیں۔

ایسی حالت میں کیا یہ فقیر اس بارہ میں آپ سے اسلام ومسلمین کی اِعانت کے لئے کچھ امید کرسکتا ہے؟ اور وہ بھی اپنے پاس سے نہ بھی سہی بلکہ اس طرح سے کہ آپ:

اِتّحادیانِ ہنود کو، جنہوں نے خدا ورسول جَلَّ وعَلا و صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے صریح ارشادات کو دیدہ ودانستہ پیٹھ دے کر اتحاد اتحاد کا شور مچا کر اور ہندو غلامی اور مُشرک پرستی کے جوش میں اسلام وایمان وحدیث وقرآن، ہنود اور ان کے طاغوتِ اعظم (لَئِیم) مَردود پر بھینٹ چڑھا کر آج ہندوؤں کو یہ جرأت بڑھائی کہ اُونھوں نے غریب بے یارو مددگار مسلمانوں پر ہر طرح کے ظلم وجبر وزبردستی توڑنے کے بعد کُھلَّم کُھلاَّ بے دھڑک مسلّح ہوکر زور وزَر کی قوت سے اُونہیں دین سے برگشتہ کرنا اور اپنے اِتحادی پس رَوؤں کے خوابِ اتحاد کی، مسلمانوں کو ہندو بناکر تعبیر دینا شروع کردی۔

تو کہنا یہ ہے کہ:

کیا آپ ان اتحادیوں میں اپنے بڑھے ہوئے اثر ورسوخ سے کام لے کر اُون کے ایک

قائدِ اعظم ہونے کی حیثیت سے اُون پر یہ زور دیں گے کہ وہ کم از کم اُوسی مال وزَر کو جو اُونھوں نے خود مسلمانوں ہی سے حمایت وحفاظتِ اسلام ومسلمین ہی کا نام لے کر اِکٹھّا کیا ہے، خُدَّامِ دین کی خدمتِ دین وحفاظتِ مسلمین کے مَقصدِ صحیح میں صَرف کرنے کے لئے دے دیں تا کہ اوس سے اسبابِ ظاہری کا سَر انجام ہو کر اربابِ باطن کی قوتِ روحانی وجَذبِ باطنی کی مدد اور عَون ونُصرتِ الٰہی کی حمایت سے اِن شاءَ اللّٰہُ العزیز یہ اہم دینی مُہم بہ کامیابی وخوش اسلوبیِ تمام انجام کو پہنچے؟

اور اب کہ اس نامُرادِ سراپا فسادِ اتحاد کا نتیجہ بے دینی وارتداد اور مشرکینِ ہنود کا مسلمانوں پر جَبر واستبداد جس پر عُلمائے دین وارَبابِ بصیرت ویقین نے پہلے ہی دن متنبّہ کر دیا تھا، آج خود دِل دادگانِ اِتحاد کو بھی اُوس سے انکار کرتے نہیں بَن پڑ رہا ہے۔

کیا ایسی حالت میں یہ فقیر آپ سے توقع کر سکتا ہے کہ:

جس طرح آپ نے اس نامُراد تحریکِ اتحاد کی نشوونما، اس کی ترقی وفروغ میں اسے حفاظت وبہتریِ اسلام ومسلمین کا بہت بڑا ذریعہ بتا کر ہر طرح ہمہ تن سَعی وکوشش کی، آج اسی طرح نہایت صفائی اور پوری کوشش سے اس ناپاک اتحاد کی خباثت اور دین ومسلمین کے لئے اس کی سخت تباہ کن ومُضِر حیثیت مسلمانوں کے دل نشیں کر کے کچھ تلافیِ مافات بلکہ تعمیرِ ماھُدِم پر توجہ فرمائیں گے؟

اور اب کہ ہنود علانیہ اور خود آپ کے ہی شُرکاے کار ومُعتمدین کے بقول:

"جتھے بندی کر کے بہ جَبر وزبردستی مسلمانوں کو مُرتد بنانے میں سرگرم ہیں۔"

سورۂ ممتحنہ کی آیۂ کریمہ سے غلط وبے محل اِستدلال کی، برائے گفت آڑ نہ پکڑیں گے؟

یارب! یہ مخلصانہ دین دارانہ معروضات سماعِ قبول پائیں۔

فقیر اسمٰعیل حسن عفی عنہٗ قادری برکاتی۔ خادمِ آستانہ برکاتیہ۔

یک شنبہ ۶ رشعبانُ المکرّم ۱۳۴۱ھ۔ از خانقاہِ برکاتیہ، مارہرہ۔ ضلع ایٹہ۔

(ص ۲۷۲ تا ص ۲۷۴۔ مفاوضاتِ طیبہ (۱۳۵۴ھ) مُرتّبہ سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی۔ دارُالاشاعت برکاتی۔ خانقاہِ برکاتیہ، مارہرہ۔ ضلع ایٹہ۔ (یوپی۔ انڈیا)

معلوم نہیں کہ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اس اہم مخلصانہ مکتوب کا کچھ جواب

دیا کہ نہیں؟ اور اس کا بھی کچھ علم نہیں کہ شُدھی تحریک یعنی تحریکِ اِرتدادِ مسلمین کی روک تھام کے لئے خود انھوں نے کوئی قدم اٹھایا کہ نہیں؟ اور اپنے اَنصار ومُعاوِنین کو اِس اہم اور ضروری خدمتِ اسلام ومسلمین کی طرف کچھ متوجّہ کیا یا نہیں؟

مولانا شاہ محمد فاخر الہ آبادی (دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد) کے ایک عنایت نامہ بسلسلۂ تبلیغ واشاعت وخدمت وحفاظتِ اسلام ومسلمین، اپنے جوابی مکتوب (۲۲ررجب ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) میں حضرت سید شاہ ابوالقاسم اسمٰعیل حسن قادری برکاتی مارَہروی (وصال صفر ۱۳۴۷ھ) تحریر فرماتے ہیں:

........فقیر اگرچہ اپنی بے بضاعتیِ عِلمی وعَملی سے اس اہم فرضِ دینی کی کما حقُّہٗ بجا آوری کے قابل نہیں، پھر بھی کم از کم اُون خُدَّامِ دین کی اُون مَساعیِ جمیلہ دینیہ میں بیش از بیش وجلد از جلد کامیابی کی دِلی دُعا سے غافل نہیں۔

اور اِشاعتِ دین وحفاظتِ اسلام ومسلمین میں خُدَّامِ دین کی بقدرِ قدرت جس طرح بھی اِمداد واِعانت بَن پڑے اوسے عِلماً وعَملاً فرض ولازم جانتا ہے۔

اور اگر اس مقصد کے لئے مسلمانوں کی مَساعی کسی صورت اجتماعی حلقہ ودَائرہ کے نظام میں لائے جانے کی داعی ہوں تو اوس میں بھی شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا، جب کہ اس حلقہ ودَائرہ کی تحدید خالِص مذھبِ مہذَّب اہلِ سُنَّت وجماعت کے اِتباعِ کامل کے مطابق ہو۔ اور اَغیار مُبتدِعین ومُرتدین وکفّار اوس میں کسی طرف سے کسی طرح کا دَخل واِقتدار نہ پا سکیں۔

جس خاص خطرۂ اِرتداد کے اِنسداد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، غالبًا آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ جماعتِ مبارکہ رضائے مصطفیٰ (علیہ اَفضلُ الصَّلوٰۃ والثّناء) بریلی نے اِرتداد کے اِنسداد میں اپنی مَساعی عرصہ سے جاری کر رکھی ہیں۔ اوس وقت سے جب کہ ہندوستان کی دوسری بہت سی دَعویدارانِ حمایت وحفاظتِ اسلام انجمنیں باوجود اپنی مال داری وفارغُ البالی کے اس فتنۂ عظیمہ کی طرف سے بے پَروا بیٹھی ہوئی تھیں۔

اس غریب سُنّی جماعت نے باوجود اپنی بے حد کمزور مالی حالت اور دوسری گوناگوں مزاحمتوں کے محض متوکّلانہ خدمتِ دین کے جوش میں اس فرضِ دینی کی بجا آوری شروع

کردی ہے۔اوربحمداللّٰہِ تعالٰی وبِعَونِہٖ جَلَّ مَجُدُہٗ اس کی مساعیِ جمیلہ بارآور بھی ہورہی ہیں۔

فقیر بھی اس جماعت کا اوس کی مَساعیِ دینیہ میں بیش از بیش وجلد از جلد کامیابیِ تام کے لئے اپنی حسبِ اِستطاعت ساعی اوردُعا گو ہے۔

اوراگر کسی اورخالص سُنّی جماعت کی طرف سے اس سلسلہ میں اپنی خدمات مذہبِ مہذَّب اہلِ سُنَّت وجماعت کی حُدُود میں جاری کرنے کا علمِ اطمینانی بہم پہنچے گا تو اوس کی بھی حسبِ اِستطاعت اِمدادواعانت سے اِنْ شَاءَ اللّٰہُ العَزِیز دریغ نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں اس قدر اور گوش گذار کرنا چاہتا ہوں کہ:

اس فتنۂ اِرتداد کا اِنسداد اپنی اہمیت اوراَعْدَاءِ دین کی زور وزَر کی قوت اورزمانہ کی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے جس قدر مَصارِف چاہتا ہے اوس کا اندازہ غالبًا آپ کو بھی ہوگا۔اورمشائخ وسجّادہ نشین حضرات جنھیں آپ نے اپنی اِس تحریر کا مخاطَبِ خاص بنایا ہے اون سب کے سب نہیں تو اکثر وبیشتر کی مالی حالت جیسی کچھ ہے، وہ غالبًا آپ سے بھی مخفی نہ ہوگی۔

ایسی حالت میں فقیر کا یہ عرض کرنا بے جانہ ہوگا کہ:

آپ نام نہاد جماعتِ اَحرار کو جس نے اِتحاد اِتحاد کا غُل مچا کر ہندوؤں کو اپنی دیرینہ خباثت کے اس طرح سے اظہار کی جرأت بڑھائی۔اوراونھوں نے مسلمانوں کو ہندو بنا کر اوس نام نہاد اتحاد کو عملی صورت دینے کی کوششیں کیں۔

اوروہی شردَھانند آریہ جسے انھیں نام نہاد اَحرار نے خدااور رسول جَلَّ وعَلاَ وصَلَّی اللّٰہ عَلیہِ وسَلَّم کے صریح فرامین کو مُشرک پرستی کے اندھادُھند میں دیدہ ودانستہ پیٹھ دے کر مسلمانوں کا واعظ وھادِی بنا کر جامع مسجد دہلی کے مِکبَّر پر مَسندِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلیہِ وسَلَّم پر جَمایا تھا۔آج مسلمانوں کے ساتھ اپنی اوسی زبانی ہمدردی کے مَکّاری کے جامہ کو اوتار پھینک کر خود آپ کے بقول بھی کُھل کر اس (مسلمانوں کو مُرتد ہندو بنانے اوراس طرح واقعی طور پر ہندوؤں سے متحد کرنے کے) کام میں مصروف ہوگیا۔

تو عرض یہ ہے کہ آپ نام نہاد جماعتِ اَحرار کو خود اسی کے ہی اوٹھائے ہوئے۔اس مُہلکۂ عظیمہ کے اِنسداد کی طرف توجہ دلایئے۔

یہ نام نہاد جماعتِ اَحرار بزعمِ خود حمایتِ اسلام حِفاظتِ مسلمین کی واحد ٹھیکہ دار ہونے کے ساتھ ہی مال دار بھی ہے۔اورآپ کا اس جماعت میں دَخل واثر بھی ہے۔

اگر اس وقت یہ جماعت اس فتنہ کے اِنسداد میں اوسی مال سے جو اوس نے مسلمانوں سے حمایتِ اسلام وحفاظتِ مسلمین ہی کا نام لے کر اِکٹھا کیا ہے، مسلمانوں کی اِعانت کردے تو اوس سے تبلیغ وحفاظتِ دین کے ضروری وظاہری لوازِم وضروریات کی فراہمی میں خُدَّامِ دین کو ایک معقول حدتک اِعانت ملے گی۔

اوراکابرِکرام وصوفیۂ عِظام کے سچے اَخلاف کو بھی اپنی باطنی وروحانی قوتِ علمی وعَملی سے مسلمانوں کی صلاح وفلاح اوراسلام کی تبلیغ واشاعت کی خدمت انجام دینے میں جو اون کا اصل کام ہے، تیار پائیں گے۔جس کے لئے اپنی طرف سے وہ ہر وقت تیار ہیں۔

الفقیر اسمٰعیل حسن القادری البرکاتی الاحمدی عفی عنہٗ۔از کوٹھی نواب سردار نواز جنگ پوسٹ ماسٹر جنرل۔حیدرآباد دَکن۔۲۲؍رجب المرجب ۱۳۴۱ھ۔

(ص ۶۹ تا ص ۲۷۔"مفاوضاتِ طیبہ" (۱۳۵۴ھ) دارُ الاشاعت برکاتی، خانقاہِ برکاتیہ۔مارہرہ مطہَّرہ ضلع ایٹہ۔(یوپی۔انڈیا)

بہرحال! ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ شریف (ضلع فیض آباد۔صوبہ اتر پردیش) کی ایک نہایت اہم تجزیاتی رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

"مُشرکینِ ہند کی یہ نگاہ سرسری طور پر نہ تھی بلکہ گہری تھی۔مگر وہ قدرت کے فیصلے اور آنے والے واقعات سے بے خبر تھے۔چنانچہ اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ خلافت کے حقیقی غم خوار اوراسلامی دفاعی قوت کی سچی جاں نثار فوج اورنوجوان مسلمانوں کا واقعی لشکر جس کا دوسرا نام "جماعت رضائے مصطفٰی بریلی" ہے اور جس کو عرصہ سے دنیا ضلالت شکن اور اِرتدادفگن کا خطاب دے چکی ہے، وہ لشکرِ ظفر پیکر لے کر غازیِ اعظم کی فاتحانہ شوکت دیکھ کر ادھر سے مطمئن ہو کر مَلکانہ کے میدانِ جہاد پر ٹوٹ پڑا ہے اور پنجاب ومما لکِ متحدہ سے اس وقت تک بارہ (۱۲) کمک اس کے لئے پہنچ چکی ہے۔جن کے مقابل قدیم اِرتداد پسندوں سے بھی "مشرکینِ ہند" کو کوئی مُعتد بہ نفع حاصل نہیں ہوسکتا۔

رؤسا بھی اب غافل نہیں جیسا کہ جماعتِ مبارکہ (رضائے مصطفٰی بریلی) کی رپورٹ

سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے شیروانی رؤسا نے جن میں ''اشرفی'' کے سرپرست عالی جناب خان بہادر نواب محمد ابوبکر خاں صاحب رئیسِ دادوں (علی گڑھ) بھی شامل ہیں، اسلام کے لئے کمربستہ اور تیار ہو چکے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے حقیقی سردار مشائخِ کرام اپنی اپنی خانقاہوں سے نکل پڑے اور ان کی کِبر سِنی اور ضعیفُ العُمری نے ان کو خدمتِ اسلام سے باز نہیں رکھا۔'' (ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ مقدسہ، شمارہ ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ/اگست ۱۹۲۳ء)

صدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی کے زیرِ اہتمام منعقدہ سنی کانفرنس مرادآباد ۱۹۲۵ء کو خطاب کرتے ہوئے حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۹۴۳ء۔ خلفِ اکبر امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی) نے شُدّھی تحریک کے پیدا کردہ خطرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''موجودہ زمانہ میں ہم سایہ قوم نے مسلم آزاری کی جو پیہم کوشش جاری کر رکھی ہے، ان میں شُدّھی کا فتنہ سب سے اہم ہے۔

شُدّھی مسلمانوں کو مُرتد بنانے اور مُشرک بنانے کا کام ہے۔ **معاذاللہ**۔

جس کے لئے ہندو دو برس سے۔ سالہا سال کی منظّم کوششوں اور تیاریوں کے بعد۔ پوری قوت کے ساتھ ٹوٹ پڑے ہیں۔

ہر طبقہ کے ہندو اِس میں سرگرم ہیں۔ والیانِ ریاست اور راجگان اِن سبھاؤں میں شرکت کرتے ہیں۔ مدتوں کی پُر اطمینان کوششوں سے، وہ ہندوستان بھر میں ایک نظم قائم کر چکے ہیں۔ گاؤں گاؤں سبھائیں قائم ہیں۔ ان کے کثیرُ التّعداد مُناظِرین ملک بھر میں دورے کرتے پھرتے ہیں۔ جابجا مسلمانوں کو چھیڑنا، ان کو پریشان کرنا، جاہلوں اور دیہاتیوں کو بہکانا، شاہانِ اسلام اور بزرگانِ دین کی شان میں گالیاں دینا، گستاخیاں کرنا، اسلام کی توہین کے ٹریکٹ چھاپنا اور ان میں پروردگارِ عالم تک کو گالیاں دینا، یہ ان کا شیوہ ہے۔

طمع اور دَباؤ سے مسلمانوں کو مُرتد بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی ان کے دین کی تبلیغ کا ذریعہ ہے۔

بہت سے نادار اور جاہل مسلمان ان کے دامِ فریب میں پھنس کر اپنا ایمان کھو بیٹھے۔

اِن حالات پر نظر کرتے ہوئے تبلیغ وحفاظتِ اسلام کا مسئلہ اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔

اب تک تو شدھی کی کوششیں راجپوتانہ ہی میں تھیں لیکن اب انھوں نے اپنا میدانِ عمل وسیع کر دیا اور تمام ہندوستان میں جہاں موقع ملتا ہے، ہاتھ مارتے ہیں۔ قوموں کی قومیں ان کے دستبرد سے تباہ ہو رہی ہیں۔

داعیانِ اسلام پر الزام لگانے والے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ:

انھوں نے اپنے مذہب یا فرقہ کی تبلیغ کے لئے کیا کیا ذرائع اپنائے؟

جب کہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ:

اسلام امن وآشتی کا مذہب ہے اور داعیانِ اسلام نے ظلم وجَبر یا زور ولالچ کی تبلیغ نہیں کی، بلکہ حقانیت وصداقت کی بنیاد پر اسلام کی تبلیغ کی۔'' الخ۔

(ص ۱۳۔ خطبۂ صدارت جمعیۃ عالیہ اسلامیہ، مرادآباد۔ از حُجّۃُ الاسلام مولانا حامد رضا بریلوی۔ مطبع اہلِ سُنّت بریلی ۱۹۲۵ء)

محدّثِ اعظم ہند سید محمد اشرفی کچھوچھوی (وصال رجب ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) نے تحریکِ اِرتداد کے خلاف عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ اِس سلسلے میں آپ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مؤرخہ ۲۳/ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۷/اگست ۱۹۲۳ء کو میں طلبیدہ فرنگی محل لکھنؤ گیا اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوا تا کہ مبلّغینِ اسلام کی مساعیِ جمیلہ کو مشاہدہ کروں۔'' (ماہنامہ اشرفی، کچھوچھہ مقدسہ، ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ/اگست ۱۹۲۳ء)

اپنے ایک خطبۂ صدارت در کانفرنس عیدگاہ بھڑوچ، گجرات منعقدہ ۱۸/۱۹/۲۰/نومبر ۱۹۵۷ء میں محدّثِ اعظم ہند فرماتے ہیں:

''اس ادارہ کو سب سے پہلے ملکانہ کی اس تحریکِ شدھی سے مقابلہ کرنا پڑا جو تحریک، ننگی تلوار کے سایہ اور سرمایہ سے شروع ہوئی تھی اور جس کے دفاع کے لئے کسی اِقدام میں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ بدیسی حکومت کی پالیسی اِفتراق پیدا کرنے کی ہَوا دے رہی تھی۔ اور ملک کے تمام ادارے خوف زدہ ہو کر خاموش ہو گئے تھے۔

اس وقت ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' رضائے مصطفیٰ علیہ الصّلوٰۃ و السّلام

حاصل کرنے کے لئے خطرات سے بے پَرَواہو کر جان کی بازی لگا کر سَر بکف میدان میں کود پڑی۔ اور جماعت کی شان دار کامیابیوں کو دیکھ کر اوروں میں بھی جرأت ہوئی۔ اور چندہ خوروں نے بھی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

مگر مَلکانہ کا ذرّہ ذرّہ گواہ ہے۔ اور اس وقت کے حکومتی دفاتر گواہ ہیں کہ "جماعت رضائے مصطفیٰ" نے تحریک (شدھی) کو ایسی فاش شکست دی کہ جو بچھڑ چکے تھے، آ کے گلے ملے۔ اور جو بچھڑنے کے قریب تھے وہ باز رَہے۔ اور اس سَعی کے کے نتیجے میں جو قطعی بیگانے تھے ان کی بڑی تعداد کے افراد اپنے یگانے ہوگئے اور میدان میں صرف "جماعت رضائے مصطفیٰ" کا جھنڈا لہراتا رہا۔ مدارس قائم کیے گئے۔ اور مَلکانہ کا ذرّہ ذرّہ حلاوتِ ایمان حاصل کرنے لگا۔" (ماہنامہ سنی لکھنؤ۔ بابت جمادی الآخرہ ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷)

جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کو اپنی دَعوتی وتبلیغی مُہم کے ابتدائی مَراحل میں حاصل ہونے والی کامیابی پر روحانی وقلبی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے حضرت مولانا حشمت علی لکھنوی ثُمَّ پیلی بھیتی (وصال ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

"راجپوت علاقہ کے خزاں دیدہ چمنستان میں پھر اسلامی ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر بادِ بہاری نے اپنے فیضانِ کرم سے توجہ فرمائی۔ پھر مُردہ زمین میں جان پڑنے کی امید پیدا ہوئی۔ پھر مسلمانوں کی، پنجۂ اغیار میں پھنسی ہوئی نسلوں کی آزادی کے اسباب مُہیا ہوئے۔ پھر اسلامی سمندر میں مَوجیں اٹھیں۔ پھر اندھیری رات میں صبحِ درخشاں کے آثار نمودار ہوئے۔ فَلِلّٰہِ الحَمد۔

ایک وہ دن تھا کہ ہمارا وَفد اس علاقہ میں پہنچا اور اس نے وہ جگر خوں کن مناظر دیکھے جن کے تصور سے دل کانپتا ہے۔ مسلمانوں کی نسلیں، مسلمانوں کے لختِ جگر، کفری رُسوم میں مبتلا، ہندوؤں کی سی معاشرت، ہندوؤں کی سی صورت، اس پر طُرّہ یہ کہ ہندو اُپدیشک، ان میں دورے کر رہے ہیں۔

ان کی اصلاح کے لئے مدتوں کی لگاتار اَن تھک کوششیں درکار ہیں۔ ان کو مانوس کرنا اور اپنی باتیں سنانے کے لئے راضی کرلینا بڑی بات تھی۔ مگر فضلِ الٰہی شاملِ حال تھا کہ ہمارے خیال میں یہ بات آئی کہ ہم موضع سلطان پورہ (آگرہ) کے، راجپوتوں میں سے بااثر

حضرات کو اپنے ساتھ لے لیں۔ جن سے علاوہ برادری کے ان لوگوں کے ساتھ تعلقاتِ قرابت ورشتہ داری بھی ہیں۔

ہماری یہ تدبیر کارآمد ثابت ہوئی اور بہت تھوڑے عرصہ میں ہم کو یہ بات میسر آئی کہ اس موضع (کھڑوائی۔ آگرہ) کے لوگوں کی نفرتیں دور ہوگئیں۔ وہ ہم سے مانوس ہوگئے اور ہماری مجلسوں میں آنے لگے۔"

(ہفت روزہ دبدبۂ سکندری۔ رام پور۔ بابت ۲۶ر فروری ۱۹۲۳ء)

اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس وقت کے مشہور لیڈروں سے تحریری اپیل کی گئی کہ:

"ہم اُمُّ الاُحرار والدۂ علی برادران وامامُ الاُحرار مولانا آزاد، وحکیم (اجمل خاں)، وڈاکٹر انصاری ودیگر برادرانِ حُرِّیَّت سے اپیل کرتے ہیں کہ:

وہ اپنی حُرِیَّت نوازی کا ثبوت پہنچائیں اور ہندونوازی کے دام سے آزادی حاصل کرکے ہندو خطرہ کے دفاع میں ہماری لیڈری کریں۔" (پندرہ روزہ درویش۔ دہلی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۳ء)

"افسوس ہے کہ خلافت کمیٹی کے اراکین "ہندو مسلم اتحاد" کے لئے اس فتنہ کے اِنسداد میں عام مسلمانوں کا ساتھ دینے سے صاف انکار کرتے ہیں۔" (ماہنامہ "پیر بھائی"۔ دہلی۔ رمضان ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء)

"ہندو خطرہ" کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون کا خاص حصہ یہ ہے:

"خلافت کمیٹی نے جس کے اَربابِ حل وعقد نے ہمیشہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا کہ "جمعیت خالص مذھبی جماعت ہے" اِرتداد کے اِنسداد سے بہ حیثیت ایک جماعت کے اپنی علیٰحدگی کا اعلان کردیا ہے۔

ہم نہیں سمجھتے کہ ایک خالص مذھبی جماعت کے لئے ایک خاص اہم ترین مسئلہ سے علیٰحدگی کیوں کر جائز ہوسکتی ہے؟

اور اس علیٰحدگی کی صورت میں اس کو خالص مذھبی یا کم از کم اسلامی جماعت کہلانے کا حق کیوں کر حاصل رہ سکتا ہے؟" (پندرہ روزہ درویش۔ دہلی۔ یکم ستمبر ۱۹۲۳ء)

ڈاکٹر ایچ، بی، خان شدھی تحریک کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مگر یہ فتنہ اُس وقت (۱۹۰۹) زیادہ زور نہیں پکڑ سکا تھا۔ البتّہ ۱۹۲۲ء کے آخر میں اس فتنہ نے باقاعدہ ایک ملک گیر مُہم کی شکل اختیار کر لی تھی اور ایسی صورت میں اہلِ اسلام پر عموماً اور عُلماے کرام پر خصوصاً یہ ذِمَّہ داری عائد ہوتی تھی کہ اس فتنے کا سَدِّ باب کریں۔

اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ''جماعتِ مبارکہ رضاے مصطفیٰ بریلی'' نے سب سے پہلا، عُلما کا وفد روانہ کیا۔ جو دس (۱۰) ارکان پر مشتمل تھا۔

یہ وفد اُن علاقوں میں گیا جہاں نومسلم راج پُوت آباد تھے۔ ان مقامات پر ہی ہندو مَہاسَبھا اور سُوامی شَردَھانَنْد کے پرچاری (مبلّغ) سرگرمِ عمل تھے۔

یہ وفد جنوری ۱۹۲۳ء میں سب سے پہلے میرٹھ کے علاقوں میں گیا۔ ان علاقوں میں چار لاکھ افراد کے گمراہ ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔ اس وفد نے گمراہ ہونے والے افراد کو وعظ وتلقین کے ذریعہ دعوتِ اسلام دے کر دوبارہ نظامِ اسلام کی طرف رجوع کرنے کے لئے آمادہ کیا'' الخ۔ علی گڑھ گزٹ۔ ۵؍فروری ۱۹۲۳ء۔

(ص ۲۶۴ و ۲۶۵۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا کردار۔ از ڈاکٹر ایچ، بی ،خان۔ مطبوعہ قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ وثقافت۔ اسلام آباد، پاکستان۔ ۱۹۸۵ء)

ڈاکٹر ایچ، بی، خان مزید لکھتے ہیں:

.... مولانا محمد علی جوہر نے ان مسلمانوں کی ہمت افزائی بھی نہیں کی جو تبلیغ اور تنظیم میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی مخالفت کی۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر مولانا محمد علی اپنے ہم مذہبوں کی ہر دل عزیزی اور مقبولیتِ عامَّہ سے کسی حد تک محروم ہو گئے۔'' اِفاداتِ محمد علی۔ ص ۱۵۲ و ۱۵۳۔ بحوالہ ہمدرد۔ ۲۷ تا ۲۹؍دسمبر ۱۹۲۷ء۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تو شدھی اور سنگٹھن کی تحریکات کو جائز قرار دیتے ہوئے کسی حد تک ان کی ہمت افزائی کی۔ تبرکاتِ آزاد۔ ص ۲۰۸۔ از غلام رسول مہر۔ مطبوعہ لاہور۔

مولانا محمد علی اور دیگر مسلم زُعَما اس بات کے متمنی تھے کہ جس طرح ہم نے اپنے مسلمان بھائیوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت پر ان کی دل شکنی کی ہے، اسی طرح ہندو زُعَما کا بھی یہ فرض ہے

کہ وہ بھی اپنے ہم مذہبوں کی فرقہ وارانہ ذہنیت اور ان کے اعمال وافعال کی مذمَّت کریں جس کی بنا پر دونوں قوموں کے مابین منافرت اور نفرت پیدا ہوئی۔ لیکن ہندو قوم پرست لیڈروں نے فرقہ پرست ہندوؤں کی تحریکات اور ان کی دل آزار کتب کی اِشاعت پر کسی قسم کی بھی مذمَّت نہیں کی اور نہ ہی ان کی ہمت شکنی کی۔'' الخ۔ (ص ۲۷۵۔ برصغیر پاک وہند کی سیاست میں عُلما کا کردار۔ از ڈاکٹر ایچ، بی، خان۔ مطبوعہ اسلام آباد، پاک۔ ۱۹۸۵ء)

بہت سے وطنیت پرست زُعَما وقائدین اور عُلماے جمعیۃ العلما نے اپنی عاقبت نا اندیشی کی وجہ سے حد سے متجاوز ہو کر ''ہندو مسلم اتحاد'' جسے مُشرک نوازی سے تعبیر کیا جانا چاہیے، اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچایا اور اس نعرہ کے سہارے ''اِدغام واِنضمام'' کی ایسی لہر چل پڑی جس پر بڑی مشکل سے قابو پایا جاسکا۔

امروہہ (مرادآباد) کے سہ روزہ اجلاسِ جمعیۃ العلماء ہند (مؤرخہ، ۳؍تا ۵؍مئی ۱۹۳۰ء) میں کئی کانگریس نواز تجاویز پاس ہوئیں۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد عمر نعیمی مرادآبادی (وصال ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) تلمیذِ صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) اس اِجلاس کی قراردادِ تعاونِ کانگریس بسلسلۂ ''سِول نافرمانی'' وغیرہ پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اربابِ جمعیۃ نے ہندوؤں کے ساتھ وداد ومحبت کو قائم رکھا۔ اور نہ اِرتداد کا سیلاب روکا، نہ شردھانند کو اسلام سوز حرکات سے باز رکھا، نہ ہندوؤں کے مظالم کے خلاف آواز بلند کی، نہ خلافت کمیٹی کے زمانے میں جب مسلمان قشقے لگاتے تھے، بتوں کی نقاب کشائی کے لئے جاتے تھے، ہولی میں گلال ملتے اور رنگ کھیلتے تھے، اس وقت کوئی حکم اسلام کا انہیں سنایا۔

بلکہ اس کے علیٰ الرَّغم جب غازی عبدالرشید نے شردھانند کو قتل کیا تو اس غازی کو جنت کی خوشبو سے محروم گردانا۔'' (ص: ۲۷ و ۲۸، ماہنامہ السَّوادُ الاعظم، مرادآباد، شمارہ، ذوالقعدہ، ۱۳۴۸ھ)

مولانا حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) اور ان کے ہم خیال وہم نوا عُلماے دیوبند کھلے بندوں یہ اعلان کرتے تھے کہ ''قومیں اَوطان سے بنتی ہیں''۔

مولانا حسین احمد مدنی (شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کے ہاتھوں میں اس نظریۂ قومیت کا پرچم تھا۔ اور ان کے پیچھے جمعیۃ عُلماے ہند کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اور آج بھی ان کے وارث عُلما سیاسی حلقوں میں ''قوم پرست'' اور ''نیشنلسٹ عُلما'' ہی کہے اور سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ اُمّتِ اِجابت اور ملّتِ اسلامیہ کا خمیر دینِ اسلام ہے جو اس کا اصل سرمایہ وامتیاز وشناخت ہے۔ جب کہ قومیت، جغرافیائی وحدت، یا نسبی و نسلی یگانگت سے عبارت ہے۔ دین کے تشخّص اور اُمّت وملّت کے تحفُّظ کو اسلام ہر حال میں فوقیت اور ترجیح دیتا ہے۔ دیگر امور ومعاملات کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ قومیّتِ متحدہ کے نام پر مسلم تشخُّص کا جذبہ سَرد کر کے ہندو مسلم اِدغام و اِنضمام کی راہ ہموار کرنا مسلمانانِ ہند کے لئے نہ پہلے قابلِ قبول تھا نہ اِس وقت ہے اور نہ آئندہ ایسا کبھی ہوسکتا ہے۔

مسلم مخالف قومی وفکری رُجحان کی تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؔ نے اُسی وقت کہا تھا کہ:

عَجم ہُنوز نداند رُموزِ دیں ورنہ
زِ دیوبندؔ حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسَرِ منبر کہ ''مِلّت از وطن ست''
چہ بے خبر زِمقامِ محمدِ عربی ست
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
وگر باُو نہ رسیدی، تمام بولہبی ست

☆☆☆

ندانی نکتۂ دینِ عرب را
کہ گوئی صبحِ روشن تیرہ شب را
اگر قوم از وطن بودے محمد
ندا دے دعوتِ دیں بولہب را

☆☆☆

حق را بفریبد کہ نبی را بفریبد
آں شیخ کہ خود را مدنی می خواند

☆☆☆

اپنی مِلّت کو قیاس اَقوامِ مغرب پہ نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک ونَسَب پہ اِنحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں؟
اور جمعیت ہوئی رخصت تو مِلّت بھی گئی

عُلماے دیوبند کی اکثریتی رائے کے برعکس مولانا شبیر احمد عثمانی سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات، وصدر مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) اس نظریۂ وطنیت جس سے اسلام وایمان پہ حرف آئے، اس کے خلاف اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہمارے لئے سب سے پہلے ایک اسلامی وحدت ومرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بدوں کسی نام نہاد قومیتِ متحدہ کے تیز دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے آپ کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے۔

مسلمان دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں۔ عہد وپیمان کر سکتے ہیں۔ بہت سے امور میں تعاون اور اشتراکِ عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے۔'' (ص ۲۳۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام، دہلی۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

☆☆☆☆

تحفّظ ودِفاعِ اسلام کی تاریخ میں

جماعتِ رضائے مصطفیٰ کی گراں قدرخدمات کاروشن باب

ازمُحدّثِ اعظم مولاناسیدمحمداشرفی جیلانی کچھوچھوی

(وصال۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء)

قدرت کے خزینۂ فضل وکرم میں جہاں جمال ورحمت کے بے بہا زَروجواہر ہیں وہاں اس کے خزانۂ بے نیازی میں جلال وہیبت کے بھی اَنمول موتی ہیں۔حقیقت شناس طبیعتیں اورحق بیں نگاہیں جمال ہو یاجلال دونوں کوایک ہی سرکار کاعطیہ باوَرکرتی ہیں۔دنیا ایسے بہادروں سے خالی نہیں ہے جوبے نیازی کے تیروں کودل وجگر میں جگہ دیتے ہیں اورمظاہرِجلال وہیبت کوبے مانگے کی دولت سمجھتے ہیں۔

اہلِ دنیا کواس کا اِقرار ہے کہ کوئی اپنے لئے رحمت کے سِوا کچھ نہ طلب کرے گالیکن اسلامی تاریخ اورہاں صرف اسلامی تاریخ ہی وہ ہے جس کے زَرّیں اوراق میں ہم کوعاشقانِ بَلا کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔

ہاں ہاں!وہ جو یہ جانتے مانتے ہیں کہ ''ہرچہ از دوست می رسد نیکوست'' وہ بَلاؤں کوبھی اسی شوق اورخوشی سے لیتے ہیں جیسے ہم عطاؤں کو۔

اللہ اللہ!مصطفیٰ صلَّی اللّٰہ علیہِ وسَلَّم جومُحِب ومَحبوبِ خُداہیں۔وہ محبوب ہیں اسی لئے توان کی جنبشِ لب پرعالَم کا فیصلہ رکھ دیا گیا ہے۔اوران کے جلالی تیور میں دنیا کا انقلاب مضمر ہے۔

وہ،وہ ہیں جن کی رضا،خداوندی رضاٹھہری ہے۔اوروہ مُحِب ہیں اس لئے حضور پر جومصائب آئے اُنھیں برداشت کرناصرف حضورہی کا کام تھا۔

بات یہ ہے کہ جس کا جتنا مرتبہ زائد ہے اُس پراُس کے مرتبہ کے لائق بَلا کی شِدَّت ہے۔دنیا میں سب سے زیادہ عظیم اِبتلا اَنبیائے کرام پر،پھراَصفِیاوصالحین پر،پھراوروں پرہوتا ہے۔خودحدیث کاارشاد ہے اَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَ مْثَلُ۔

یُبْتَلٰی الرَّجُلُ عَلٰی حَسبِ دِینِہٖ فاِنْ کَانَ فِی دِینِہٖ صُلْبًا اَشْتَدَّ بَلا ؤُہٗ۔ واِنْ کَانَ فِی دِینِہٖ رِقَّۃً ابْتَلٰی عَلٰی قَدرِدِینِہٖ فَمَایَبْرَحُ الْبَلاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰی یَتْرُکَہٗ یَمْشِی عَلٰی الْاَرضِ وَمَاعَلَیْہِ خَطِیئۃ۔

ایک حدیث میں فرمایا:اَشَدُّ النَّاسِ بَلاءً فِی الدُّنْیَانَبِیٌّ اَوْصَفِیٌّ۔

ایک حدیث میں ارشادہوا:اَشَدُّالنَّاسِ بَلاءً اَلْاَنْبِیاءُ ثُمَّ الصَّالِحُونَ۔ لَقَدْکَانَ اَحَدُ ھُمْ یُبْتَلٰی بِالفَقْرِحَتّٰی مَایَجِدُ اِلَّاالعَبَاءَ یَجُرُّبھا فَیُسْلُبُھَاوَیُبْتَلٰی بِالْقُمَّلِ حَتّٰی یَقْتُلَہٗ وَلَاَ حَدُ مِنْھُمْ کانَ اَشَدَّ فَرْحاً بِالبَلاءِ مِنْ اَحَدِکُمْ بِالْعَطَاءِ۔

چوں کہ حضورسَیِّدُالانبیاء وسَیِّدُ المُحِبِّین ہیں اس لئے حضور پر جوشِدَّتِ اِبتلا ہے وہ کسی پرنہیں۔

کیاحضور ہی وہ نہیں جنھوں نے کفّارِ مکہ وغیرہا سے اَنواع اَنواع کی تکلیفیں اُٹھائیں،اَذیتیں پائیں،مصیبتیں برداشت فرمائیں،اَقسام اَقسام کے مظالم وستم اُٹھائے؟

کبھی حضور پرپتھروں کا مینھ برسایا گیا،جسمِ نازنین خون سے رنگ گیا،قدمِ پاک نعلِ اقدس میں خون سے جم گیا،دندانِ مبارک شہید ہوا۔

کبھی حضور کے شہیدکرڈالنے کامشورہ ہوتا ہے۔کبھی حضور پرنماز پڑھتے ہوئے اونٹ کا اوجھ لاکررکھ دیا جاتا ہے۔کبھی کچھ کبھی کچھ۔

کیاحضورہی وہ نہیں ہیں جومشرکینِ مکہ کے ایجادکردہ ''نان کوآپریشن'' کی بِنا پرطویل مدت تک شِعبِ اَبی طالب میں سخت مصائب اُٹھایا کیے؟

کیاحضورہی وہ نہیں ہیں جوگھربار،وطن(مکہ معظّمہ)چھوڑکرمدینہ طیبہ کے عاشقوں کومَسرورفرمارہے ہیں؟

آخریہ کیا تھا؟وہی اِبتلا پسندی تھی جس کے لئے قدرت نے ذاتِ اقدس کواَزل میں نمونۂ حَسنہ کے لئے منتخب فرمالیا تھا۔

کیاصحابۂ کرام کی جاں فروشیاں،صرف حق پرستی کوجُرم قراردے کرکفّارومشرکین کی اُن پرتعدّیاں،اوربڑے بڑے جبالِ مصائب پراُن حضرات کی مسرتیں اورخوشیاں،اس اِبتلا پسندی کے نکتۂ بدیعہ کی جلوہ آرائیاں نہیں؟

کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میدانِ کربلا میں کون سا گھرانا مع مُخَدَّرَات کے محصور تھا؟

یہ وہ خاندان تھا جس کی غلامی و نیازمندی نے اگلوں کو ممتاز کر دیا تھا۔ اس گھرانے کی دَربانی کا نتیجہ تھا کہ فلاں ولی نے فلاں قلعہ کو طُرفۃ العین میں جڑ سے پھونک کر اُڑا دیا۔ فلاں بزرگ نے فلاں لشکر کو آنکھ جھپکتے تہ و بالا کر دیا تھا۔

لاریب کہ امام عالی مقام کی ایک پُر درد آہ، آسمان و زمین کی دَھجیاں اُڑانے اور اَشقِیا کی جماعت کو فنا کرنے کے لئے کافی تھی۔ مگر یہ اِبتلا پسندی تھی کہ محمدی گھرانے کا سرسبز وشاداب باغ، خزانِ شقاوت کے ہاتھوں برباد ہوتا نظر آتا ہے اور امام کی نگاہ تک نہیں بدلتی۔ چشمِ نازنین پر مَیل تک نہیں آتا۔ چہرۂ اقدس پر بَل نہیں پڑتا۔ جبینِ اَطہر پر شکن نہیں آتی۔ کسی بزرگ نے کسی حدیث قدسی کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

مابلا بر کسے عطا نہ کنیم ۔۔۔ تا کہ نامش، زِ اَولیا نہ کنیم
ایں بلا گوہر خزینۂ ماست ۔۔۔ ما بہر کس گہر، عطا نہ کنیم

بلاشُبہ مقبولیت و اِبتلا کا حق، چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور برگزیدہ نفوس کا قیام گاہ ہمیشہ میدانِ اِبتلا رہا ہے۔ اِبتلا کی دشوار گذار اور سنگلاخ زمین کی سرحد مظالمِ اَغیار کے ڈانڈے سے نکل کر مُدّعیانِ اسلام کے اَعمال سے شروع ہوتی ہے۔

خلافتِ صدیقی میں وہ دن بھی کیسا دن تھا جب کہ بعض بے ایمان کلمہ گویوں نے اَدائے زکٰوۃ سے اِنکار کر دیا تھا اور شام و فلسطین سے ہٹ کر خود دارُالخلافہ مدینہ طیبہ میدانِ جہاد ہو گیا تھا۔ دشواری یہ تھی کہ ان مُرتدین کی تعزیر و تہدید پر ابھی مسلمانوں کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر صِدّیقیت سے مصفّٰی اور افضلیت سے مجلّٰی تلوار، نیام سے باہر ہو گئی اور آخر عزمِ مُصمّم اور حق پرستی کی قوت نے اسلامی جھنڈے کے نیچے سارے مسلمانوں کو کھڑا کر دیا۔ اِس اسلامی لشکر نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ دَخَلَ الجَنَّۃَ

ان میں سے ہر مجاہد کو معلوم تھا کہ لَا نُکَفِّرُ اَحَداً مِن اَھلِ القِبلَۃَ۔

ان کو پوری طرح سے اس کی خبر تھی کہ ننانوے وجوہِ کفر پر ایک وجہِ اسلام کو ترجیح حاصل ہے۔

یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی پہچان مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ

قِبلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیحَتَنَا ہے۔

مگر یہ اسلام کے اصلُ الاصول اور قَرنِ اول کے اَفراد، اَساطینِ اسلام تھے۔ کچھ دیو کے بندے نہ تھے کہ کفریات ہضم کرنے والوں کے لئے اِن معلومات کو حیلہ قرار دینا جائز سمجھتے۔

یہ بَدآئین لوگوں کا قاعدہ ہے کہ خدمتِ اسلام کے لئے رَفضہ کا بَدا، یوں ثابت کریں کہ ضروریاتِ دین کو وہ ہر سال بدلتا رہے۔

صحابۂ کرام کا دامنِ تقدس اس بَدنُما داغ سے پاک تھا۔ وہ اسلام کے اس قانون کو اَنمٹ سمجھتے تھے کہ کسی ایک امرِ ضروری دینی کا اِنکار کفر اور خالص کفر ہے۔ اس انکار کے ہوتے کلمۂ طیبہ یا استقبالِ قبلہ یا اَکلِ ذبیحہ کچھ کام نہ آئے گا۔

یہ فیصلہ قطعی ہے اور کوئی حالت و زمانہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مجاہدین کے ایک ہی حملہ نے مُرتدین کو ملیا میٹ کر دیا۔

سیدنا امام حسین کی دشواری کا اِفتتاح اُنھیں ہاتھوں سے ہُوا تھا جن کو صرف کلمہ گوئی پر ناز تھا۔ جزیرۃُ العرب کا تقریباً کل حصہ کسی نہ کسی طرح یزید پلید کی خلافت پر بیعت کر چکا تھا۔ اور یقیناً سخت گستاخی ہے اگر کہا جائے کہ امام اس حدیث سے بے خبر تھے کہ اِذا بُویِعَ بِالْخَلیفَتَین فاقْتُلُوا الاٰخِرَ ھُمَا۔

آپ نے یزید کے خلاف اپنی بیعت جائز قرار دی۔ مگر آہ صد آہ۔ وہ کیسا قیامت خیز منظر تھا جب کہ شہادت سے چند منٹ پہلے خونِ امامِ مظلوم کی اِباحت پر شامیوں نے کوئی چار پانچ سو عُلما کا متفقہ فتویٰ پیش کیا تھا جس کا سَرنامہ اُس حدیث سے شروع ہوا تھا کہ میری اولاد میں ایک شخص ایسا اور ایسا ہوگا۔ اور اس طرح خاندانِ نبوت کی طہارت پر نجس حملہ کیا گیا تھا۔ غرض

مَن اَز بیگانگاں ہرگز نَنالَم ۔۔۔ کہ بامَن آنچہ کرد آں آشنا کرد

جہاں اچھوں نے ہمیشہ کفر و کفار کو مکھی اور مچھر برابر نہ سمجھا، وہاں اُن کی روشن علامت یہ بھی ہے کہ جو اپنے کہلائے جاتے ہیں وہی مارِ آستین یا غفلت شِعار نکلتے ہیں۔ جس پر تاریخِ اسلام کی ایک ایک سطر کی شہادت موجود ہے۔

اور اگر تم زندہ شہادت کے طالب ہو تو آؤ ہندوستان کی وسیع آبادی کا چکّر لگاؤ اور اُس اسلامی عَسکر کی تلاش کرو جس کی کفر و کفار پر شِدّت اور مُرتدِین و مُشرکین سے غِلظت و نفرت ضربُ المثل بن گئی ہو۔

نادان ہے وہ جو اِس قدر عرض کرنے پر بھی ''جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی'' کے سِوا دوسری جمعیت کا توھُّم بھی کرے۔ جس کا مشہور اور زبان زدِ سنگِ بنیاد کفر و مُرتدین سے جہادِ شدید ہے۔

جمعیتوں کو بنتے بگڑتے تو ہم روز دیکھا کرتے ہیں اور کمیٹیوں کے نِت نئے نرالے ڈھانچے بنانا ہندوستان کا روز مرّہ ہو گیا ہے۔ مگر چوبیس (۲۴) گھنٹے کی مسافتِ حیات طے کرنے پر اُن میں پراگندگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد طلوعِ آفتاب اُن کی موت پر ہوتا ہے۔ مگر یہ ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' جس بازو کے زور پر زندہ ہے، شیخُ الاسلام والمسلمین، امامِ اہلِ سُنّت، مُجدِّدِ مِائۃ حاضرہ رحمۃُ اللّٰہ تعالیٰ علیہ کی روحانیتِ مقدّسہ کی طاقت ہے۔ حضور ہی نے دستِ حق پرست سے اس کا نبیادی پتھر نصب فرمایا تھا اور حضور ہی کے روبَرو مجاہدوں نے کفر و اِرتداد کی مخالفت کرنے کا عزم کیا تھا۔

جس وقت ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کی ابتدائی تنظیم ہو رہی تھی، نہ مَلکانہ علاقۂ اِرتداد تھا، نہ ہندوستان کے کسی خِطہ میں اس فتنۂ مشرکین کا بظاہر اِمکان تھا۔ مگر اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) کی نورانی فراست آنے والے دِنوں کا مشاہدہ کر رہی تھی اور حضور کو شاید معلوم تھا کہ عنقریب سارا ہندوستان عرصۂ جہاد ہوگا اور اُس کے لئے اسلامی لشکر کی ترتیب لابُدّی ہے۔ چنانچہ حملۂ مشرکین سے پہلے، جماعت کا جہاد اُن مُرتدین ہی سے ہوتا رہا جن کے فتنہ کا شکار ہندوستان ایک مدت سے ہو رہا تھا اور جنھوں نے کفر بکنے کے لئے اُن مسائل کو حیلہ بنا رکھا تھا جن کی گردن کشی زمانۂ نبوت کے بعد ہی صِدّیقی تلوار نے کر دی تھی۔

اُسی زمانہ میں جماعتِ مبارکہ کی کفر و کفّار پر شِدّت کا چرچا ہونے لگا تھا اور اَعدَا کی زبانوں نے بھی جماعت کی غِلظتِ اسلامیہ کا اعتراف کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت اور ہاں مسلمانانِ ہند کے لئے امتحان کا وہ نازک وقت آ گیا جب کہ شرک کی لنگوٹی پیپل کے درخت سے اُتری یا گائے کے پیٹ سے نکل پڑی اور سماجی اَساڑھ کے اثر سے کیڑے

مکوڑے حَشراتُ الارض کی طرح پھیلے۔ ہر طرف سے مشرکین نے عزیز مسلمانوں پر دھاوا کر دیا اور اُن کے ایمان و عقیدہ پر بہ یک وقت ایسا ڈاکہ مارا کہ صرف مَلکانہ کے لاکھوں مسلمان ہمیشہ کے لئے دولتِ نجات سے بے مایہ کیے جانے لگے۔

یہ خبر ہندوستان میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور کوئی چھوٹا بڑا ایسا نہ رہا جو اِس واقعہ سے بے خبر رہا ہو۔ اور اِس خبر نے ہندوستانی کلمہ گویوں کی تقسیمیں کر دیں۔

کوئی تو سُن کر ایسا چُپ رہا کہ گویا سُنا ہی نہیں۔ یہ شرابِ غفلت کے مَتوالوں کا درجہ ہے۔

کسی نے سُن کر کہا کہ: یہ ''ہندو مسلم اتحاد'' پر حکومت کا خُفیہ حملہ ہے۔

یہ مشرکین کے تنخواہ داروں کا درجہ ہے۔

کسی نے کہا کہ: یہ مسلمانوں کی محض شرارت ہے اور اگر مشرکین کی طرف سے ایسا ہوتا تو ہم اُن کو مزہ چکھا دیتے۔

یہ اُن رزولیوشن پاس کرنے والے بہادروں کا درجہ ہے جو گھر بیٹھے بیٹھے سمندر پار کی جنگ میں خیالی سپاہی بنے ہوئے ہیں اور عالمِ خواب میں تاج و تخت کو روزانہ اُلٹ پلٹ کرتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ سُن لیا کہ گھر کے باہر اسلام پر حملہ ہو رہا ہے تو اپنے گھر کی خیریت مَنانے کے سِوا کچھ زبان سے نہیں نکلتا۔ بلکہ اگر کوئی زخم اُن کے بھی اتفاقی لگ گیا تو: خدا کرے جھوٹ ہو۔ کہتے جاتے اور خون پونچھتے جاتے ہیں۔

بڑا پکّا مسلمان وہ ہے جو اِس خبر کو سُن کر بے چین ہو گیا اور کہنے لگا کہ: ہائے خلافتِ صِدّیقی کا زمانہ ختم ہو چکا ورنہ فتنۂ اِرتداد کا بُت توڑ کر رکھ دیا جاتا۔

افسوس کہ ان مسلمان نام رکھنے والوں کی کفر پسندی اور شرک دوستی کا بُرا نتیجہ ظاہر ہوا۔ ہیہات کہ کام کرنے والوں کا اسلامی ہند میں فُقدان ہے۔

یہ بدقسمت ہندوستان میں کھرے مسلمانوں کا درجہ ہے۔

بہر حال! یہ سارے درجات زبانی جمع خرچ تک کے ہیں اور میدانِ عمل کا درجہ جو اسلام کا حقیقی مقتضیٰ ہے، ہندوستان بھر میں مفقود سا ہے۔ چنانچہ اِس خبر نے اسلامی ہند میں مایوسی کی چادر سی ڈال دی تھی کہ دوسری اِطلاع رحمتِ الٰہی کا مُژدہ یہ سناتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمایندہ جمعیت اور عَسکرِ اسلامی کی مقدمۃُ الجیش اور اسلامی علم و عمل کی

اُسوۂ حَسنہ یعنی ''جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی'' نے اس خبر سے متأثر ہوکر زبانی تعلّیوں اور دِکھاوے کی پُر جوش لسّانیوں سے علیٰحدہ رَہ کر میدانِ جہاد میں قدم رکھ دیا۔ اور طے کرلیا کہ ہندوستان کا یہ فتنۂ اِرتداد کچل کر اسلامی جھنڈے کو بلند سے بلند تر کردیا جائے۔

جس وقت یہ جماعت گھروں کو چھوڑ کر نکلی تھی اور میدانِ جہاد کی طرف کوچ کررہی تھی اُس وقت مُدَّعِیانِ اسلام نے اُس کی خدمتِ عظیمہ کی داد میں لَعن وطَعن کے تیر برسائے تھے اور اگر جماعت کا عَزمِ مُصمّم اُس کے لئے سپر نہ ہوتا تو شرک پسند بہادروں نے اُس کی مُزاحمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔

اب تم مَلکانہ کا میدانِ جنگ دیکھو۔ ایک طرف مُشرکینِ ہند کی صف ہے جس میں سامانِ رسد، کثرتِ افواج، تجربہ کار جنرل، ملک پر ملک، پختہ خندقیں اور پُرانی سُرنگیں، غرض ہر قسم کی جنگی قوت ہے۔

دوسری طرف تنہا اور، ہاں بالکل تنہا ''جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی'' کی صف ہے۔ جس میں مالی ناداری، قلّتِ افراد، ایسی جنگ کا پہلا سابقہ، بے سروسامانی، مُدَّعِیانِ اسلام کی طرف سے مُعانِدانہ رُکاوٹ، اور ہر طرح کی ظاہری کمزوری ہے۔ مگر آفرین ہے ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کی پامردی واِستقلال پر، کہ خدائے قدوس پر اِعتماد کرکے اسلام کے لئے سینہ سپر ہوگئی اور حقّانیت وصداقت کی خُدا داد قوت سے مشرکین کے بڑھتے ہوئے حملہ کو روک دیا اور شرک کے بُت کو توڑ پھوڑ کر مشرکین کے فتنہ کو ملیا میٹ کردیا۔

یعنی اس جنگِ عظیم اور مہابھارت کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مَلکانہ میں صرف ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کا اِقتدار ہے اور فوجِ اَعدا پسپا ہوکر مفرورین کی طویل فہرست چھوڑ گئی ہے۔ اور بڑے بڑے مَٹھ اس جماعت کا لوہا مان چکے ہیں۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جماعت کے لئے ایسی جنگ کا پہلا سابقہ تھا۔ یہ بالکل ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے۔ میدانِ جہاد کے سفر سے پہلے سپاہیوں کی خوراک کا مسئلہ ہے مگر جماعت کے عملی جوش نے اس پر بالکل نظر نہ کی اور فاقہ کشی پر تیار ہوکر لختِ دل وخونِ جگر کے کھانے پینے کو کافی سمجھا۔ اور واقعی ۱۳۴۱ھ کے آخر تک اس نے فاقہ کشی کر دِکھایا۔ اسی صبر وفاقہ کی روحانی قوت تھی جس نے دشمن کو پسپا کردیا۔

مجھے ان ایامِ جنگ میں جماعت کے جنگی دفتر میں حاضری کا شرف حاصل ہو چکا ہے نیز جماعت کے حسابات مطبوعہ میرے پاس موجود ہیں اور میں نے اُس کی ناقدانہ سیر کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں نکتہ چین اور خونخوار آنکھیں خونیں آنسوؤں کے ساتھ واپس آئیں۔

ہم ممبرانِ جماعت سے واقفیت رکھتے ہیں اور اُن کے عیش وآرام کا بارہا مشاہدہ کیا ہے۔ اب ہم اُن کو مَلکانہ میں وسیع دسترخوان کی جگہ کسی درخت کے نیچے فرشِ زمین پر بیٹھا کئی وَقتوں کے بعد چنے چَباتے بھی دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں سے آنسو کی جگہ خون ٹپک پڑتا ہے۔ لیکن فاقہ کشی کرنا اور پیاس کے شدائد کو برداشت کرنا ایک مدت کے لئے ہے کہ جس کے بعد بَشریت عاجز ہوجاتی ہے۔

مسلمانو! صرف دو دن بھوکے پیاسے رہو اور پھر سوچو کہ اسلامی فوج تقریباً دو (۲) برس تک بھوکی پیاسی لڑی اور بتاؤ کہ تم لشکرِ اسلام کا اس سے زیادہ کیا امتحان لینا چاہتے ہو؟

میں اُس چند گنتی کے روپیوں کو ہرگز فوجی سامانِ رسد نہ کہوں گا جس کو بینُ الاقوامی قانون کی بِنا پر صَرف کیا جاتا تو معمولی سرحدی چھیڑ چھاڑ میں صبح کا ناشتہ بلکہ صرف چائے تیار نہ ہوسکتی۔ اور جس کی آمد کا دروازہ چند مہینے کے بعد ایک حد تک بالکل مَسدُود ہوگیا۔ مسلمانوں نے دانا پانی اُس پر گویا بند کردیا۔

خانگی بہادروں نے اُس کے عروج سے عملِ حَسد شروع کردیا۔ چندہ ہَضم کرکے ڈکار نہ لینے والوں نے اپنا جال بھی پھیلا دیا اور شہرت پسندوں نے ایک ایک شخص کی علیٰحدہ علیٰحدہ جمعیت قائم کرکے اپنے خیالی کارناموں سے اَخبار کو بھر دیا۔

اور اس طرح جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی جس نے مُشرکینِ ہند کے دانت کھٹے کردیے تھے، ایک عظیم اِبتلا میں مبتلا ہوگئی۔

میں نے عرصہ ہوا کہ ایک منطقی اِستدلال ان حملہ آوروں کا سُنا تھا۔ یہ نئے نام کے رَنگروٹ جماعت رضائے مصطفیٰ کی فاتح اور کارکُن فوج کو دَبانے کے لئے ''اسلامی اتحاد'' کا مغالطہ پھیلاتے رہے اور اُن کو معمولی انسانیت اس فیصلہ پر نہ لاسکی کہ تفریق وتشتُّت کی بنیاد اُس نے ڈالی جس نے سب سے پہلے اسلامی فوج جماعت رضائے مصطفیٰ کے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہونا پسند نہ کیا۔

مَلکانہ کے علاقہ میں پہلا قدم ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کا پہنچا اوراتحادِ اسلامی کی دعوت اسی کے نشانِ قدم کی پیروی کے لئے تھی۔ چنانچہ اشرفی جھنڈا اور حضرت پیرسید جماعت علی شاہ صاحب مُدَّظِلُّہٗ کی اَفواج نے اس شاہراہِ عمل کی تقلید میں جماعتِ مبارکہ کی تکثیرِ سَوَاد میں حصہ لیا۔ یہ ہے ''اتحادِ اسلامی''۔

نہ یہ کہ کسی رئیس یا مولوی کی عزت اَفزائی میں مُشرکین کے مقابلہ کا نام کرکے عَساکرِ اسلامیہ کی پامالی کا فرض ادا کیا جائے اور مشرکین کی نمک خواری کا ثبوت دے کر اس کو ''اتحادِ اسلامی'' قرار دیا جائے۔

بہرحال! جماعت کی مشکلات کا مقدمہ مشرکین کی مَساعی اور اُن کی کثرت اور دولت نہ تھی بلکہ مُدَّعِیانِ اسلام کے کرتوت نے اس کا اِفتتاح کیا تھا جس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے وہ ہوا۔ یعنی جوفوجِ مشرکین منھ پھیر چکی تھی وہ پلٹ پڑی اور ۱۳۴۲ھ میں مشرکوں کا حملہ پہلے سے زیادہ زوروشور سے ہوا اور میدانِ جہاد کا نقشہ یہ ہوگیا کہ مثلاً مشرقی جانب سے مشرکین کا ٹڈی دَل آرہا ہے اور مغربی محاذ پر جماعت رضائے مصطفیٰ مع اپنے شرکائے کارمجاہدین کے صف باندھے ہے اور شمال وجنوب کی طرف بھی کچھ شوروغل ہے۔

ان کی نگاہیں مشرکین کی طرف ہیں اور اُن کا نعرہ ''دشمن کو مارو'' اور اسلامی اتحاد'' ہے مگر ان کے قہر وغضب کا تیر اِسلامی لشکر ہی پر گرتا ہے۔ یہ لوگ ''دشمن'' اسلامی فوج کو کہتے ہیں اور ''اسلامی اتحاد'' سے ان کا مطلب شرک دوستی ہے۔

عَساکرِ اسلامیہ ان کی زَد پر ہیں اور انھوں نے مشرک فوج کے پہنچنے سے پہلے اسلامی فوج کی تباہی کا ارادہ کیا ہے تاکہ ان کے استاد اور دوستوں کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔

اس نقشۂ جنگ پر نظر کیجیے تو جماعت رضائے مصطفیٰ اگر میدانِ جنگ چھوڑ دے تو ہرگز اُس پر اِلزام نہیں آسکتا۔ ایک سال سے زیادہ ان دشواریوں کا مقابلہ کرنا اس کو رضائے مصطفیٰ صلَّی اللّٰہُ تَعالٰی علیہ وسَلَّم حاصل کرنے کو کافی ہے۔ مگر طالبینِ رضائے مصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ تَعالٰی علیہ وسَلَّم کے بلند حوصلوں کو دیکھو کہ شدید محاصرۂ اَعْدَا اور غیر معمولی بھوک پیاس کے باوجود سَربکف میدان میں کھڑے ہیں اور کرب وبلا کی ایک ایک ساعت کو بے مانگے کی دولت سمجھ رہے ہیں۔ اور یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ لیکن

اگر اسی نقشۂ جنگ پر قیامت قائم ہوجائے اور مالک ومولیٰ ہر ایک کی جزاوسزا کا اِستحقاق اَلَمْ نَشْرَحْ فرمائے تو بتاؤ وہ کون ہے جس کی گویائی گونگی ہوجائے گی اور لمبی لمبی زبان کترلی جائے گی؟

تم اس کے جواب میں صرف مُشرکینِ ہند کا نام نہ لوکہ اُن کے اِستحقاقِ عذاب کو اُن کا شرک کافی سے زیادہ حجت پہلے سے موجود ہے۔ تم اُن پُرفریب نام کے اتحادیوں کو نہ کہو کہ جنھوں نے اپنے علم وعمل کی نیرنگیوں سے آج سے برسوں پہلے جنت اپنے اوپر حرام کرلی ہے۔

ہاں! جَلالِ الٰہی سے ہم مسلمانوں، سنی بھائیوں، عقائدِ حَقّہ والوں، سَلفِ صالحین کے مُقلّدوں، اولیائے کرام کے نیازمندوں کو ڈرنا چاہیے کہ جنت جن کی مہمانی کے لئے بنی ہے اور وہ ایک گلاس پانی اور ایک مُٹھی اناج کو اس نعمتِ الٰہیہ پر بڑھا رہے ہیں۔

بھائیو! آؤ۔ ایک ماتم خانہ، برپا کریں۔ اُس میں جماعتِ مبارکہ کی رُوداد پڑھیں۔ اور کروروں مسلمانانِ ہند سے جن کا نام اُس میں نہ پائیں اُس کا مَرثیہ پڑھیں۔ پھر اُن کا غم منائیں جن کا نام پہلے تھا مگر اب اس لئے خارج ہوا کہ وہ ذلیل سے ذلیل مدد سے عملاً ہٹ گئے۔ اور پھر مسلمانانِ ہند کی قوتِ اسلام کا مرثیہ پڑھیں، اپنی بدبختی پر روئیں اور اتنا روئیں کہ آنسو رُکنے سے پہلے روح کو رخصت کردیں۔

اور یا آؤ۔ اسلام پر مَرمِٹیں۔ جان دے دیں۔ نثار ہوجائیں۔ خود مٹ جائیں مگر اسلام کو مٹنے سے بچائیں۔

خود بھوکے پیاسے رہیں مگر اسلامی لشکر ''جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی'' کو تازہ دَم رکھیں۔ اور پیڑ پتھر کے بندوں کے تنوں کو کاٹ کر رکھ دیں۔ اس کے سِوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

اگر تم اسلام اور غَیرت رکھتے ہو اور مشرکین ونمک خوارانِ مشرکین تمھاری غَیرت کا جو امتحان لے رہے ہیں اُس میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو لِلّٰہ اُٹھو اور بڑھ کر جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی کی مدد کرو۔ کیا اس کمزور آواز کو، کوئی کان والا سُنتا ہے؟

(ص۲۲ تا ص۳۴۔ روداد ۱۳۴۲ھ/۲۴۔۱۹۲۳ء۔ جماعت رضائے مصطفیٰ، بریلی)

ازمحدِّث اعظم سید محمد اشرفی جیلانی کچھوچھوی، وصال ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء)

جماعتِ رضائے مصطفیٰ بریلی ۱۳۴۲ھ کی مطبوعہ روداد جو اِس وقت راقم (یٰسٓ اختر مصباحی) کے پیشِ نظر ہے اس میں ایک صفحہ پر ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ تا ذوالحجہ ۱۳۴۲ھ کا اِجمالی حساب درج کرنے کے بعد ''شکریہ'' کے عنوان سے تحریر ہے کہ:

''جماعتِ مبارکہ اُن گرامی حضرات کی شکر گذار ہے، جنھوں نے دامے، دِرمے، قدمے، سُخنے، قلمے اِمداد فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت مولانا مولوی سید شاہ اسمٰعیل حسن میاں صاحب مارَہروی، حضرت مولانا سید شاہ اولادِ رسول محمد میاں صاحب مارَہروی، حضرت مولانا مولوی محمود جان صاحب جام جودھ پوری، حضرت مولانا مولوی سید محمد اشرف صاحب مُحدِث کچھوچھوی، جناب حاجی سیٹھ موسیٰ سلیمان صاحب رضوی مُربیِّ جماعت جام جودھ پور، جناب مولانا مولوی چودھری عبدالحمید خاں رئیسِ اعظم سُہاوَر، جناب مولانا مولوی محمد عبدالعزیز خاں صاحب رضوی ساکن کلکتہ، جناب حاجی یوسف علی خاں صاحب رئیسِ نجیب آباد، جناب عبدالرَّسول مولوی احمد حسن خاں صاحب رضوی نجیب آباد، جناب حاجی عبدالرحمٰن صاحب مارَہروی مُقیم کلکتہ، محبِّ جماعت جناب نظام الدین وفیض اللہ صاحبان سُورتی، مُحِبِّ جماعت ابوالفضل جان محمد صاحب رضوی مُقیم ہوڑہ، جناب حاجی عبدالکریم صاحب واعظ کان پوری، جناب حاجی مولوی نصیر الدین القادری ساکن بلہاری۔

ایڈیٹرانِ رسالہ اشرفی کچھوچھہ شریف، وعلی گڑھ گزٹ، واخبار دَبدبۂ سکندری رام پور، والفقیہ امرتسر، ومشرق گورکھ پور، ومنصور، بجنور۔ نیز اُن اخبارات ورسائل کا بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں کہ انھوں نے قلمی اِمداد فرمائی۔

ناظمِ جماعت رضائے مصطفیٰ۔ بریلی۔

(رودادِ جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی۔ مطبوعہ ۱۳۴۲ھ/۲۴۔۱۹۲۳ء)

☆☆☆☆

نہایت اہم تاریخی سوال

تحریکِ خلافت (۱۹۱۹ء) وتحریکِ ترکِ موالات (۱۹۲۰ء) وتحریکِ ھجرت (۱۹۲۰ء) کے اکثر عُلما وزُعَما وقائدین نیز جمعیۃُ العُلماء ہند نے اُصولِ شریعت کو نظر انداز اور مسلم جذبات کا اِستحصال کرتے ہوئے ''ہندو مسلم اتحاد'' اور بلفظِ دیگر ''مُشرِک نوازی'' کا جو ماحول بنایا تھا اس کے نتیجے میں:

(۱) آیاتِ قرآنی واحادیثِ نبوی کی غلط تعبیر وتشریح کی گئی اور اصطلاحِ خلافت ومسئلۂ موالات کے خود ساختہ معانی ومفاہیم بیان کیے گئے۔

(۲) بہت سے شعائرِ اسلام وحُرمتِ مسلمین کی پامالی ہوئی۔

(۳) مُشرِکوں کی رضامندی کے لئے شرعی حُدُود توڑے گئے۔

(۴) مُسلم قیادت کی باگ ڈور مُشرک لیڈر کے حوالے کردی گئی۔

(۵) جامع مسجد دہلی میں آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کا خطاب کرایا گیا۔

(۶) مسجد خیر الدین امرتسر، پنجاب میں ایک مشہور ہندو لیڈر کا لکچر دِلوایا گیا۔

(۷) مسجد ناخدا کلکتہ میں ایک دینی مدرسے کا اِفتتاح گاندھی سے کرایا گیا۔

(۸) مسلمانوں کی پیشانی پر قَشقے لگائے گئے اور انہوں نے جَے جَے کار کی صدائیں

بلند کیں۔وغیرہ وغیرہ

لیکن مقامِ حیرت بلکہ جائے عِبرت وغَیرت ہے کہ:

جب سُوَامی شردَھانَند و دیگر ہندو مبلّغوں اور ہندو تنظیموں نے ۱۹۲۳ء میں مَلکانہ (متھرا و آگرہ و بھرت پور و الوَرْ وغیرہ) میں شُدِّھی تحریک یعنی تحریکِ اِرتِدادِ مسلمین زور وزَر اور زور وشور کے ساتھ شروع کی اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی جہالت وغُربت کا فائدہ اٹھا کر انہیں مُرتد اور ہندو بنالیا تو تحریکِ خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات کے اندر کوئی جُنبِش ،کوئی حرکت ،کوئی سرگرمی پیدا نہیں ہوئی۔

اور جمعیۃُ العُلماء کی بھی کوئی اہم اور قابلِ ذکر سَرگرمی اس شُدِّھی تحریک کے خلاف ہمیں نظر نہیں آتی۔

نہ جانے کیا وجہ ہے کہ اِن تحریکات اور جمعیۃُ العُلماء کے عُلما وقائدین میدانِ عمل میں سرگرم ہو کر وہ کردار نہ ادا کر سکے جو اُن کے وسائل واَفراد کے لحاظ سے ان کے لئے بہت آسان تھا۔اور مقامِ حیرت ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کا اِرتِداد انہیں خوابِ غفلت سے بیدار اور متحرک کر کے میدانِ عمل میں لانے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکا؟

آخر اس کا سبب کیا ہے اور اس کے پسِ پردہ راز کیا ہے؟ کہاں تو وہ شورا شوری (در تحریکِ خلافت وموالات وہجرت) اور کہاں یہ بے نمکی۔(بہ مقابلہ شُدِّھی تحریک)

سمجھ میں کچھ نہیں آتا ،اِلٰہی ماجرا کیا ہے؟

شُدِّھی تحریک/فتنۂ اِرتداد کی فتنہ سامانیوں اور مُحرِّکات وعَوامِل کے بارے میں حضرت مولانا سید شرفُ الدین اشرف جائسی ''طُرُقُ الْهُدَىٰ وَالْاِرْشَادِ اِلٰی اَحکامِ الْاِمَارَةِ وَالْجِهَاد (۱۳۴۱ھ) مؤَلَّفہ مفتیِ اعظم مولانا الشّاہ مصطفٰی رضا قادری برکاتی نوری بریلوی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی نہایت اہم اور وقیع تحریر کے اِختتام میں فرماتے ہیں:

''آج یہ فتنۂ خبیثۂ اِرتِداد تمہارے اُسی نامُراد اِتحاد اور محبت وو داد اور غلامی واِنقیاد کا نتیجہ ہے۔

سچ کہو! کیا پہلے کسی نام کے مسلمان کو بھی ہندو ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟

اللّٰہُ اکبر! دھوتی پرشاد اور یہ ہمت؟ گھاس کھانے والوں میں یہ جرأت؟

اے مُدَّعِیانِ اسلام! تم نے انھیں جری کیا۔تم نے انھیں یہ ہمت دلائی۔تم نے انھیں دلیر بنایا۔ہاں! ہاں! تم نے انہیں اُبھارا۔نہ تم ان پر ایسے ہوش کھو کر حَواس گُما کر فدا و نثار ہوتے۔نہ وہ یوں تمہیں غافل پا کر تمہارے شکار کو تیار ہوتے۔

نہ تم اپنے ماتھے پر تِلک لگواتے،نہ تم قَشقے کھنچواتے۔نہ تم تِلک کی ٹِکٹی اُٹھاتے اور اسے مَرگھٹ تک پہنچاتے۔نہ تم رام رام سَت سَت کہتے جاتے۔نہ تم جَے کاری لگاتے۔نہ تم انھیں اپنی مسجدوں میں لے جاتے اور انھیں مسجد کے منبر پر مسلمانوں سے اونچا بٹھاتے۔نہ تم ان کو مسلمانوں کا واعِظ بناتے۔نہ تم یوں ان کے فوٹو کھنچواتے،تصویر اُترواتے۔

نہ تم یہ روزِ بَد دیکھتے اور اَوروں کو دِکھاتے کہ آج میدانِ اِرتداد میں منشی رام شَرَدھانَند کا وہ فوٹو جو جامع مسجد دہلی میں اس کے منبر پر بیٹھے ہونے اور لکچر دینے کا لیا گیا ہے،مَلکانوں کو دکھا دِکھا کر مُرتد کیا جا رہا ہے۔شرم،شرم،شرم۔فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْن ؟

نہ تم ہندوؤں کے طاغوت گاندھی کو اپنا ھادِی،اپنا راہبر،اپنا امام،اپنا پیشوا،اپنا رہنما اپنا فخر کہتے،نہ تم اس کا اندھا دُھند اِتباع کرتے،نہ تم اس پر قرآن وحدیث کی تمام عمر نثار کرتے،نہ تم اسے مذَکِّر مبعوث مِن اللہ جانتے،نہ تم اسے نبی بِالقوۃ مانتے،نہ تم اسے جبریلِ امین کا لقب روحِ اعظم دیتے،نہ تم اُسے خضر ومسیحا بلکہ تمام انبیا، بلکہ سید الانبیاء سے افضل بتاتے،نہ تم اس کے آگے ملائکہ کا سر جھُکاتے۔

نہ تم آج ہندوؤں کی ہمتیں اتنی بڑھاتے کہ وہ یہ کہنے پاتے کہ مسلمانوں کے تمام مقاماتِ مقدسہ بلکہ کعبۂ مکرمہ پر اُوم کا جھنڈا گاڑیں گے،نہ تم یہ کلمۂ خبیثہ خود سنتے نہ اَوروں کو سناتے۔شرم،شرم،شرم۔فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْن ؟

اے کاش! مسلمان اب بھی بیدار ہو جائیں تو ہم دعوٰی سے کہہ سکتے ہیں کہ:

ہنودِ بے بہبود کو اُن کی دَرِیدہ دِہنی،ان کی اس ناپاک حرکت،اور صریح گستاخی اور سخت بدلگامی اور ہرزہ سرائی کا مَزہ چکھا دیں۔چھٹّی کا دودھ یاد دلا دیں اور اپنے بزرگوں کی یاد تازہ کر دیں۔اسلام کا پرچم ان کے سَروں پر لہرا دیں۔خدا کے پسندیدہ دین کا علَم ان کے قلب ودماغ میں نَصب کرا دیں۔شجرِ اسلام ان کے سینوں میں لگا دیں۔

مسلمانو! اُٹھو! لِلّٰہ جلد اُٹھو! امتحان کا وقت ہے۔آزمائش کا عہد ہے۔دیکھو! کسوٹی

پر پورے اُترو۔ پیارے اسلام کی مدد کرو۔

اگر خدانخواستہ تم نے بے پَروائی کی اور اس کی مدد نہ کی تو وَاللّٰہ وَاللّٰہ ثُمَّ وَاللّٰہ کہ اسلام کا کچھ نہ بگڑے گا، اس کا ذرا نقصان نہ ہوگا۔ تم ہی بگڑ جاؤ گے۔ تم ہی خراب وَخستہ، دست وپابَستہ قیامت میں آؤ گے۔ بلکہ دنیا میں ہی اِس بے حمیتی، اس بے حیائی، اس بے غیرتی کا مَزہ پاؤ گے۔

اسلام کا مالک، اسلام کا حافظ اللہ واحِد قَہَّار ہے۔ وہ اس کی حفاظت فرمانے والا ہے۔ اس کے دُشمنوں کو برباد کردینے والا ہے۔ وہ خود فرماتا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۔

قومِ نوح کو کس نے ہلاک کیا؟ نَمرود کو مچھر سے کس نے تباہ کیا؟ عادوثمود کو کس نے برباد کیا؟ فرعون کو کس نے غرق کیا؟ اَصحابِ فیل کو چھوٹے سے پرندہ اَبابیل سے کس نے ''**عَصۡفٍ ماکُول**'' جیسا بنایا؟

وہی اِن ہنود کے اِس خواب کی تعبیر لائے گا۔ مگر دیکھنا تمہارا ہے کہ تم کیا کام کرتے ہو؟ تم کیسا درِ اسلام رکھتے ہو؟

بسا تعجب اُن مُدَّعِیانِ اسلام سے جو باوجود ہنودِ بے بَہبود کی ان نجس حرکاتِ شنیعہ کے آج تک وہی پُرانا بے ہودہ بےسُرا راگ گائے جاتے ہیں۔ وہی اِتحاد واتفاقِ حرام کی رَٹ لگائے جاتے ہیں۔

عُلمائے اہلِ سُنَّت **کَثَّرَھُمُ اللّٰہُ وَشَکَرَ مَسَاعِیَھِمۡ** نے بارہا ان کی جن اَباطیل کا رَدّ فرمایا۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دکھایا۔ جھوٹوں کو ان کے گھر تک پہنچایا۔ مگر وہ ہیں کہ وہی فرمائے جاتے ہیں۔

اسلام پر یہ وقت ہے مگر انھیں فتنہ پَردازی، جھگڑا بازی سوجھی ہے۔ جگہ جگہ یہ جھگڑے اٹھائے جاتے ہیں۔

شاہجہاں پوری و لاہوری سوالات کے جواب میں یہ رسالۂ مبارکہ **طُرُقُ الۡھُدٰی والۡاِرۡشَادِ اِلٰی اَحکَامِ الۡاِمَارَۃِ وَالۡجِھَاد** (١٣٤١ھ) جو باعتبارِ حجم بہت مختصر مگر نہایت مدلّل وجامع ہے، مخالفین کے زعمِ باطل وخیالِ عاطل اور وہمِ فاسِد وکاسِد کا

قامع ہے۔ اِن شاءَ اللّٰہ مسلمانوں کے لئے بہت ہی نافع ہے۔ حاضر ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مصنّف مُدَّظِلُّہٗ کی سَعی مشکور اور اُنھیں اَجرِ موفور بطفیلِ حضور پُرنور شافع یوم النُّشور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم عنایت کرے۔ آمین۔

وانا الفقیر ابوالشَّرف محمد شرف الدّین اشرف الجائسی۔ غَفَر لہٗ الۡمَولٰی القویُّ العَلِیُّ بجاہِ حبیبِہِ النَّبیِ الۡاُمِّی صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلَّم۔ آمین۔

(ص٢٢ تا ٢٥۔ **طُرُقُ الۡھُدٰی وَالۡاِرۡشَادِ اِلٰی اَحکَامِ الۡاِمَارَۃِ وَالۡجِھَاد** (١٣٤١ھ) ۔ مؤلّفہ مفتیِ اعظم مولانا الشاہ محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی۔ مطبوعہ باہتمام مولانا محمد حسنین رضا بریلوی، جماعت رضائے مصطفیٰ۔ حسنی پریس۔ بریلی)

☆☆☆☆

بعض عُلماے دیوبند کامَوقِف

تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے عُلما و قائدین کی حرکات کے بارے میں مولانا اشرف علی تھانوی (متوفی ١٩٤٣ء) کہتے ہیں:

''اوران لیڈروں کی کیا شکایت کی جاوے؟ بعض مولوی ایسے بدحواس ہوئے کہ نہ ان کو دنیا کی خبر رہی اور نہ ہی دین کی۔ ایمان تک قربان اور نثار کرنے کو تیار ہو گئے۔

اور ایک مولوی صاحب نے گاندھی کے عشق میں اپنے ایمان اور دین اور اس میں گذری ہوئی عمر کو اس پر نثار کرنے کا اس شعر میں اِقرار کرلیا ہے:

عمرے کہ بآیات واَحادیث گذشت رفتی و نثارِ بت پرستے کردی

ایک لیڈر صاحب نے یہ کہا کہ ''اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی مستحقِ نبوت تھا''۔ حیرت ہے کہ ایسا کم فہم نبی ہوتا؟ اگر فہیم ہوتا تو پہلے آخرت پر ایمان لاتا۔'' (ص:١٢٥۔حصہ پنجم۔اَلْاِ فاضاتُ الیومیہ۔مولانا اشرف علی تھانوی۔مطبوعہ کراچی)

''یہ پہلے ہی سے اسلام اور ایمان کو ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ اوپر سے طاغوت کا

سہارا مل گیا۔ سب کچھ اس کی نذر کردیا۔ ماتھے پر قَشقے لگوائے۔ جَے کے نعرے بلند کیے۔ ہندوؤں کی اَرتھیوں کو کاندھا دیا۔

مساجد میں منبروں پر کافروں کو بٹھا کر مسلمانوں نے مذ َکّر بنادیا۔ حضور ﷺ کے مصلیٰ کی بے حرمتی کی۔ آیات واَحادیث میں گذری ہوئی عمر کو ایک کافر بت پرست پر نثار کردیا۔

لیڈروں کی اجازت سے مسلمان والنیٹروں نے رام لیلا کا انتظام کیا۔ یہ علیٰ الْاِعلان شایع کیا گیا کہ: اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں طاغوت نبی ہوتا۔''

اَللّٰہُ اَکبر ! نبوت سڑک پر پڑی ہے کہ آ وَ لے لو؟

اِن کفریات اور شرکیات کا اِرتکاب اور پھر مسلمانوں کے مقتدا و پیشوا؟

یہ عاقِل نہیں آ ِکل ہیں۔ عَقل کی ایک بات بھی نہیں، ہر وقت اُکل کی بات ہے۔

خود گمراہ ہوئے اور مسلمانوں کو گمراہ کیا۔

اور یہ عوام بھی عجیب ہیں۔ جہاں کوئی نئی بات لے کر کھڑا ہوا، لبیک کہہ کر ساتھ ہولیے۔ دوست دشمن کی قطعاً شناخت نہیں۔ نہ اس کی پَروا کہ ہمارا یہ کام اللہ اور رسول کے خلاف تو نہیں؟

مسلمانوں کو توجہ کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ اس کے متعلق حکمِ شرعی ہے کیا؟ تب قدم آگے بڑھانا چاہیے۔

یہ ہَڑ بونگ تو عقلاً نقلاً کسی طرح مناسب نہیں۔'' (ص:٨٠و٨١۔اَلْاِ فاضاتُ الیومیہ، مولانا اشرف علی تھانوی۔جلد ہشتم، مطبوعہ تھانہ بھون)

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری (متوفی ١٣٤٦ھ/١٩٢٨ء) کے اَحوال و اَفکار کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ١٣٦٠ھ/١٩٤١ء) لکھتے ہیں:

''اسی طرح جس وقت گائے کے ذبیحہ کا ترک شروع ہُوا اور بہتیرے مولویوں نے بھی

اس کو مُباح قرار دے کر بہ مَصالحِ دینیہ تَرجیحِ تَرک پر فتویٰ دیے تو آپ نے سکوت پسند نہیں کیا۔ اور شِعارِ اسلام ہونے کے لحاظ سے اس کی ضرورت عِلماً وعَملاً محقّق فرمائی۔

اس وقت آپ پر سَب وشَتم ضرور ہوا مگر چند ہی روز بعد اس کا نتیجہ دیکھ کر ممانعت کا فتویٰ دینے والے خود فرضیت کا فتویٰ دینے لگے۔

غرض اِس اصول کے آپ ہمیشہ پابند رَہے کہ: ہر کارے و ہر مَردے۔

دُنیوی ضروریات پر جس طرح نظر لیڈرانِ قوم کی جائے گی اسی طرح دینی ضروریات پر اوّل نگاہ پڑنا عُلما ومشائخ کا منصب ہے کہ:

لیڈرانِ قوم کا فتویٰ جس میں وہ عُلما کو متفق کرنے کی کوشش کریں کسی طرح دین نہیں ہوسکتا۔

ایک بار آپ نے افسوس کے ساتھ فرمایا:

مسلمان اس شورِش میں ہلاک ہوجائیں گے کہ:

لیڈران کو کرلیا آگے اور مولوی ہو لیے ان کے پیچھے۔'' (ص ۲۱۸۔ تذکرۃُ الخلیل از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ مطبوعہ الخلیل مشین پریس۔ میرٹھ)

مولانا شبیر احمد عثمانی سابق شیخُ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات۔ وصدر مہتمم دارالعلوم، دیوبند (متوفی ۱۳۶۹ھ/ دسمبر ۱۹۴۹ء) تحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے حامی ہونے کے باوجود لکھتے ہیں کہ:

''بہت سے خیرخواہ ''ہندو مسلم اتفاق'' کے عَواقِب کے بعد عوامُ النّاس اور بعض لیڈروں کی ان غلط کاریوں پر متنبّہ فرمارہے ہیں جو اس اتفاق کے جوش سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً قربانیِ گاؤ میں بعض جگہ تشدُّد ومزاحمت کیا جانا، یا قربانی کے جانور کو سَجا کر رضا کارانِ خلافت کا گئو شالہ پہنچانا، یا قَشقہ لگانا، یا ہندوؤں کی اَرتھیوں کے ساتھ خصوصاً

''رام رام سَتّیہ ہے'' کہتے ہوئے جانا۔

یا یہ کہنا کہ امام مَہدی کی جگہ امام گاندھی تشریف لائے ہیں۔ یا یہ کہ اگر نبوت ختم نہ ہوگئی ہوتی تو مہاتما گاندھی نبی ہوتے۔ یا قرآن وحدیث میں بَسَر کی ہوئی عمر کو نثارِ بت پرستی کرنا......

بلاشُبہ میں بھی جب اپنی قوم کے بڑے بڑے سَر برآوردہ لوگوں کو سُنتا ہوں کہ وہ اِس قسم کے مُحرَّمات یا کفریات کے مُرتکب ہوتے ہیں اور وہ باتیں زبان سے بے دَھڑک نکال دیتے ہیں جن کو سُن کر ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، تو میرا دِل پاش پاش ہوجاتا ہے''۔ الخ (ص:۷۶۔ علاّمہ شبیر احمد عثمانی۔ مؤلّفہ ڈاکٹر علی ارشد۔ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۲۰۰۵ء)

☆☆☆☆

سید سلیمان اشرف (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور تحریکات و مَسائلِ دائرہ

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تحریکِ خلافت و تحریکِ تَرکِ موالات وغیرہ سے متعلق ایک نہایت وقیع علمی و تحقیقی کتاب ''النُّــور'' کے نام سے تحریر فرمائی جس کی پہلی طباعت واِشاعت باھتمام محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۳۳۹ھ/۲۱-۱۹۲۰ء میں ہوئی۔

آزادیِ ہند کے بعد لاہور، پاکستان سے بھی اس کی طباعت واِشاعت ہوئی۔ اسی اَلنُّور کو ''موالات ومعاملات کا شرعی حکم'' کے توضیحی نام سے ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں رضا اکیڈمی بمبئی نے بھی شائع کردیا ہے۔

تحریکِ خلافت اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی تحریکِ تَرکِ موالات اور وطنیت پرستی کے انجام کا فیصلہ فرماتے ہوئے مولانا سید سلیمان اشرف تحریر فرماتے ہیں:

''مسٹر گاندھی کی دوربیں نگاہوں نے جب یہ دیکھا کہ مادرِ وطن کا نام لے کر مسلمانوں

کو مِــن حیــث القــوم حرکت میں نہیں لایا جاسکتا۔ چاہے چند ذِی وجاہت یا شہرت پسند شریک ہوجائیں لیکن قوم کی شرکت مُتعذَّر رہے۔ تو وہ:

ہندوؤں کے سامنے آزادیِ ہند کو شفیع لائے۔ اور مسلمانوں کے سامنے مسئلۂ خلافت پیش کیا۔ اور اس ایک مرکز پر کہ انگریزوں کا وجود دونوں کی گرفتاری اور پائمالی کا موجب ہے —— ہندو مسلم دونوں متضاد قوموں کا اِجتماع کردیا۔'' (ص:۲۹، النُّــور (بنام توضیحی: موالات و معاملات کا شرعی حکم) مؤلّفہ سید سلیمان اشرف، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۳۳۹ھ/۲۱-۱۹۲۰ء ومطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء)

''شاید مسلمانوں کو ہندو لیڈروں کی اُس زمانے کی پالیسی ابھی یاد ہوگی جب کہ یورپ کے میدانِ کارزار میں جنگ کی ایسی آگ بھڑکی جس کے شعلے اور چنگاریوں سے ہندوستان کا مَصئون ومحفوظ رہنا بھی مَعرضِ خطر میں تھا۔ اُس وقت خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کی پالیسی مسلمانوں کے ساتھ ان کی ''مخلِصانہ محبت'' کا اچھا سُراغ بتاتی ہے۔''

(ص:۳۰، النُّور، مؤلفہ سید سلیمان اشرف، مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء)

''یہ عجیب کشاکش کا وقت ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لئے تھا۔

......اس عُقدۂ لاینحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخنِ تدبیر سے ایسا سُلجھایا کہ مسلمانوں کی عقلیں اُلجھ گئیں۔ اسی اُلجھن میں مسلمانوں نے اتحاد کا ہاتھ بڑھانے سے پیشتر مدغم ہوجانے کی کوشش کی۔ قشقہ کھینچا۔ مندروں میں گئے۔ چڑھاوے چڑھائے۔ بتوں پر پھولوں کا تاج رکھا۔ گئو ماتا کی جَے پکاری۔ قربانیِ گاؤ سے توبہ کی۔ منبر ومکبرَّہ پر ہنود کو تبلیغ وہدایت کے لئے جگہ دی۔

اب مضامین لکھے جاتے ہیں۔ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ وعظ کہے جاتے ہیں۔ جن کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ کفّار ومُشرکین میں جَذب ہوجانا عین اسلام ہے۔'' (ص:۳۰، النُّور)

''غالبًا خلافت کے متعلق تم یہ جواب دوگے کہ اب یہ مسئلہ طے ہوگیا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہ ہو اَور انگریزوں کا قدم یہاں سے نہ ہَٹے، مسلمان کچھ بھی خلافت کی مدد نہیں کرسکتے ہیں۔

ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ پہلے خلافت کے لئے ہندو تک سرگرمِ کار تھے۔ لیکن اسی قلیل مدت میں یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ خود مسلمان بجائے خلافت ''سوراج'' پکارنے لگے۔ شاید گاندھی کے باب میں تم یہ جواب دو کہ جب تک مسلمانوں میں کوئی صاحبِ سَجّادہ،

کوئی خانقاہ نشیں، کوئی واعظ وفقیہ، کوئی محدّث ومفسّر، حد یہ کہ کوئی جنٹلمین لیڈر مِسٹر گاندھی کے نہ ہوتو ہمیں اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ ہم اسی کی تقلید کریں؟

ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ گاندھی تمہارا پیشوا ہے اور تم اس کے پیرو......

ہاں! میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ تم ہندوؤں میں ''جَذب'' ہوگئے۔'' (النّور۔ ص ۴۹ ،مطبوعہ ، علی گڑھ ولاھوروبمبئی)

''جَذب'' کے اسی عالمِ رستاخیز میں علی برادران (مولانا محمد علی جوہر ومولانا شوکت علی) حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چوں کہ آپ اہلِ سُنَّت و جماعت کے پیشوا ومقتدیٰ تھے اس لئے کسی نہ کسی حیلے بہانے سے آپ کی حمایت اور تائید ضروری سمجھی جاتی تھی۔

علی برادران نے چاہا کہ آپ کی حمایت حاصل کرلیں۔ اس طرح ہماری آواز کا وزن کچھ اور بڑھ جائے گا۔ بلکہ ہم پوری قوت کے ساتھ اپنے مطالبات منوا سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ آپ ہماری تحریکِ عدمِ تعاوُن وغیرہ کا ساتھ دیں۔ جس کا جواب آپ نے اس طرح عنایت فرمایا:

''مولانا! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے۔ آپ ''ہندو مسلم اتحاد'' کے حامی ہیں۔ میں مخالف ہوں۔

اس جواب سے علی برادران کچھ کبیدہ خاطر ہوئے تو آپ نے تالیفِ قلب کے لئے مکرَّر ارشاد فرمایا:

''مولانا! میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں۔ ''ہندو مسلم اتحاد'' کا مخالف ہوں۔''

علی برادران کی یہ ملاقات اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ کیوں کہ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی جوش سے زیادہ ہوش کے قائل تھے اور انھیں کسی طرح یہ گوارہ نہ تھا کہ مسلمان جذبات کی رَو میں آکر اپنے ملّی تشخص سے دستبردار ہوکر غیروں کی گود میں چلے جائیں اور ایک حریف کے زیر کرنے کی فکر میں دوسرے حریف کے شکار ہوجائیں۔ جیسا کہ ان کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں اور زمانۂ مابعد نے ان کا موقف سچ کر دکھایا کہ مسلمانوں نے اپنے شعائر کی توہین کی۔ قشقے کھنچوائے۔ جے جے کار کی اور غیرمسلموں کو مسجدوں میں لاکر انھوں نے خود دعوتِ تقریر دی۔ **العیاذُ باللّٰہ۔**

۲۰۔ ۱۹۱۹ء کے اَحوال پر مشتمل ایک تحریر بقلم حضرت سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) گذشتہ صفحات میں قارئینِ کرام پڑھ چکے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ دوبارہ یہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے وقیع رسالہ (بنام ''اَلرَّشاد'' مؤلّفہ سید سلیمان اشرف مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/ ۲۱-۱۹۲۰ء) میں سید سلیمان اشرف تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشُّق وشیفتگی کا تھا۔ مسلمان ہمہ تن اُوس میں حُلول وجَذب ہوجانے کے لئے بیتاب تھے۔ لیڈرانِ قوم نے اُوس وقت نہایت بلند آہنگی سے یہ صُور پھونکا تھا کہ:

اگر باعزت وحُرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جَذب ہوجاؤ۔ مسلم ہستی بذاتِ خود قایم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑ و اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔

پھر کیا تھا! مسلمانوں کی شکل وصورت، لباس و پوشاک، طرزِ ماندو بود غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلّی تھی۔ حتی کہ نام تک یورپین تلفظ واملا میں شامل کرلیا گیا۔ ارکانِ اسلام سے بیگانہ وَشی لَوازِم تہذیب وتعلیم قرار پائی۔

اب چند سال سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ مسلمانوں نے دوسری کروٹ بدلی تو اس کی تلاش ہوئی کہ اس مرتبہ کس قوم میں مل کر فنائے کلّی کا مرتبہ حاصل کیا جائے تاکہ رہی سہی علامتِ اسلامی بھی مٹ جائے۔

بارے اس مرتبہ زیادہ سرگردانی کی نوبت نہ آئی۔ پاس ہی ملک میں ایک قوم ہمسایہ مل گئی۔ نہایت اطمینان سے اُوس میں جَذب ہونا شروع ہوگئے۔ لیڈروں نے پھر اُوسی تلقین کا اعادہ کیا کہ:

تم ہیچ، تمہارے مذہبی دستورُ العمل ہیچ، تمہارے اَسلاف کے کارنامے ہیچ، خبردار! مسلم ہستی کو بذاتِ خود قیام کی کوشش سخت حماقت وبے غیرتی ہے۔

یہ زرّیں موقعہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اِحسان مانو کہ اپنی رہی سہی قومیت مٹانے کے لئے ہمیں دور نہ جانا پڑا۔ خود اپنے ہمسایہ میں ایک ایسی قوم مل گئی جس میں جَذب ہوکر ہم نیست ونابود ہوسکتے ہیں۔

مسلمانوں نے بھی لیڈروں کی اس تلقین پر لبیک کہا۔اس دور سے پیشتر عیسائیت میں جذب ہونے کے لئے مسائلِ شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں۔آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطالب میں عجیب وغریب معنیٰ آفرینیوں سے کام لیا گیا۔اس دورِ جدید میں ہندوؤں کے لئے وہی باتیں کی جارہی ہیں۔

مذہب کا بہت بڑا حصہ یورپ پر سے نچھاور کیا جاچکا تھا جو باقی تھا وہ نہایت فیاضی سے ''ایک شریف قوم'' نے پہلے ہی قدمِ اتحاد پر قربان کردیا۔اب کہ اہلِ ہنود نے زبانی ہمدردی مسئلۂ خلافت میں مسلمانوں سے ظاہر کی ہے کہ ایک دو ہندوؤں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ سر دینے کو موجود ہیں۔

ان پُر کیف نغمات پر مسلمان تأسُّف وتحسُّر سے ہاتھ مَل رہے ہیں کہ: اب کیا باقی رہا جسے اس کے معاوضہ میں قربان کیا جائے؟

افسوس ہے مسلمانوں کی بدعقلی اور خام کاری پر۔دنیا طلبی ان پر ایسی چھائی کہ دین کی تباہی اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے اور اس کا اِحساس وشعور تک ان میں نہیں ہوتا کہ ہم کیا کررہے ہیں؟

مسلمانوں کا حقیقی نَصبُ العین دین ومذہب، اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے۔دنیا ان کے پاس دین کی رونق اور مذہب کی خدمت کے لئے ہے۔

جب دین ومذہب ہی نہ رہا تو:

''ملعون ہے وہ سلطنت جو ایمان کے عوض میں ملے اور صد ہا لعنت ہے اُس حکومت پر جو اسلام بیچ کر خریدی جائے۔'' (ص:۸تا:۱۰،اَلرَّشاد مؤلّفہ سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج،علی گڑھ ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء)

اس بحث کے آخر میں یہ حقیقت افروز اور چشم کشا تأثُّر وتبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک شاگرد، مُستقِل حاضر باش وفیض یافتہ اور اردو کے مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء۔علی گڑھ) نے اُس دَور کی عَکّاسی اپنے مخصوص اسلوب میں کی ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان اشرف نے ''النُّور'' کے نام سے جو محقِّقانہ کتاب لکھی تھی وہ ۱۹۲۰ء ہی میں انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی اور تحریکِ

خلافت وتحریکِ تَرکِ موالات کے سلسلے میں حضرت مولانا سید سلیمان اشرف کا وہی مَوقِف تھا جو امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کا تھا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی (وصال ۱۹۷۷ء۔علی گڑھ) لکھتے ہیں:

''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔''نان کوآپریشن'' کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔''گائے کی قربانی'' اور ''موالات'' پر بڑے بڑے جیّد اور مُستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اِظہار کردیا ہے۔اس زمانہ کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رُجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہوگیا؟

اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے اور جو کچھ کہا جارہا ہے، وہی سب کچھ ہے۔یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہوہی نہیں سکتی۔کالج (علی گڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) مَطعون ہورہے تھے لیکن چہرہ پر کوئی اثر نہ تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔

اس زمانے میں اسی دومنزلہ کے پچھلے کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم (سید سلیمان اشرف) کی نشِست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حدِّ فاصل تھی۔جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔دن میں کئی کئی بار ملنے کا اِتفاق ہوتا تھا۔

کہتے تھے: رشید! دیکھو علما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو گھروندا بنا رکھا ہے۔

میری سمجھ میں اس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں اور میں ان تفصیلات میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔وہ رَ رَہ کر ان ہی باتوں کو چھیڑتے تھے۔اور کہتے تھے کہ:

میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج (علی گڑھ) اس قسم کے مُناقشوں کا مرکز بنے۔لیکن کیا کروں؟ خدا کو تو بعد میں مُنہ دِکھانے کا موقع ملے گا۔اور اس دنیا کے پڑھے لکھے لوگ کیا کہیں گے؟

بالآخر مولانا (سید سلیمان اشرف) نے قلم اٹھایا اور قلم برداشتہ لکھتے رہے۔اکثر مجھے

بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔

کہتا: میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہیں کہ محاکمہ کرسکوں۔آپ جو کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

کہتے: یہ بات نہیں ہے۔تم پر اس ہڑکم کا اثر ہے۔اور سمجھتے ہو کہ یہ تمام عُلما جو کچھ کہتے ہیں، وہ ٹھیک ہے، اور میں کالج کا مولوی یوں ہی ہانکتا ہوں۔

یہ بات نہیں ہے۔ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔

سیلاب گذر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔لیکن مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی، اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔سارے عُلما سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔'' (ص۲۳و۲۴ گنجہائے گراں مایہ۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔جامعہ نگر۔نئی دہلی۔از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے مواقع پر خود امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اور ان کے ہم خیال عُلما و مشائخ نے کیا عملی اقدامات کیے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی (وصال ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء) کی یہ تحریر دوبارہ ملاحظہ فرمائیں:

'' آج (۱۳۴۰ھ) سے برسوں پہلے جنگِ بلقان (۱۹۱۱ء و۱۹۱۲ء) کے موقع پر انھوں (مولانا احمد رضا بریلوی) نے سلطنتِ اسلامی و مظلومین مسلمین کی اِعانت و اِمداد کی مناسب و صحیح شرعی تدابیر لوگوں کو بتائیں۔عام طور پر شائع کیں۔قولاً وعملاً ان کی تائید کی۔خود چندہ دے کر عوام کو اس کی طرف رغبت دلائی۔اور اب بھی لوگوں کو صحیح مفید شرعی طریقے اِعانتِ اسلام و مسلمین کے بتاتے رہے۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب جو عملی کوشش کر سکتے تھے، انھوں نے کیں۔خود چندہ دیا اور اپنے زیر اثر لوگوں سے دلایا۔مسلمانوں کو اسلامی سلطنت کی اِمداد و اِعانت پر توجہ و رَغبت دِلائی۔تحفُّظِ سلطنتِ اسلامی کی مفید و کارگر تدابیر بتائیں۔

یہ عملی کوشش نہیں تو کیا ہے؟'' (ص:۱۲۔ برکاتِ مارہرہ و مہمانانِ بدایوں۔مطبوعہ حسنی پریس بریلی۔از سید اولادِ رسول محمد میاں قادری برکاتی مارَہروی)۔

اس بحث کے آخر میں امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا یہ بیانِ ہدایت نشان بھی ملاحظہ فرمائیں:

'' آواب تمہیں قرآن عظیم کی تصدیق دکھائیں اور ان کی طرف سے اس میل اور میل کا راز بتائیں۔دشمن اپنے دشمن سے تین باتیں چاہتا ہے:

(۱) اول:۔اس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

(۲) دوم:۔یہ نہ ہو تو اس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس نہ رہے۔

(۳) سوم:۔یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پَری کہ عاجز بن کر رہے۔

مخالف نے یہ درجے ان پر طے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہی سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) اوّلاً:— جہاد کے اشارے ہوئے۔اس کا کھُلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا ہونا تھا۔

(۲) ثانیاً:— جب یہ نہ بنی تو ہجرت کا بھَرّ ادیا کہ:

یہ کسی طرح دفع ہوں۔ملک ہماری کبڈیاں کھیلنے کو رہ جائیں۔یہ اپنی جائدادیں کوڑیوں کے مول بیچیں۔یا یوں ہی چھوڑ کر جائیں۔ بہرحال! ہمارے ہاتھ آئیں۔ان کی مساجد، مزاراتِ اولیا، ہماری پامالی کو رہ جائیں۔

(۳) ثالثاً:— جب یہ بھی نہ نبھی تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملت پر اُبھارا ہے کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کونسل کمیٹی میں داخل نہ ہو، مال گذاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات واپس کر دو۔

اَمرِ اخیر تو صرف اس لئے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی مسلمان کے لئے نہ رہ جائے۔اور پہلے تین اس لئے کہ ہر شعبہ اور محکمے میں صرف ہنود رہ جائیں۔'' (المحجّۃ المؤتمنۃ۔مطبوعہ بریلی۔ص۵۳۶۔فتاویٰ رضویہ، جلد۱۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

□□□

سید سلیمان اشرف کی خودداری اور عظمت و استقامت

سید سلیمان اشرف اور مدن موہن مالویہ کا تاریخی مکالمہ

سید سلیمان ندوی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

سید فضلِ امام واقف عظیم آبادی

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) صدر شعبۂ علومِ اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے علی گڑھ کالج میں بڑے علمی وقار و عظمت، شان و شوکت اور جلال و جبروت کی زندگی گذاری۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت استاذِ اسلامیات آپ کا انتخاب شعبۂ دینیات علی گڑھ کالج میں ہوا تھا۔ استاذ الاساتذہ علاّمہ ہدایت اللہ جون پوری (وصال ستمبر ۱۹۰۸ء) کے شاگردِ رشید اور نہایت متبحر عالمِ دین تھے۔ اور علاّمہ جون پوری، امامُ الحکمۃ والکلام، قائدِ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال ۱۲/صفر ۱۲۷۸ھ/۲۰/اگست ۱۸۶۱ء) کے مخصوص شاگرد تھے۔ محلّہ میرداد۔ بہار شریف۔ پٹنہ۔ صوبہ بہار، علاّمہ سید سلیمان اشرف کا آبائی وطن تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیبُ الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی (ولادت ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء۔ وفات ۲۶/شوال ۱۳۶۹ھ/۱۱/اگست ۱۹۵۰ء) نے پٹنہ کی ایک ملاقات و گفتگو کے بعد سید سلیمان اشرف کی علمی اِستعداد و صلاحیت سے متأثر ہو کر آپ کو علی گڑھ آنے کی ازخود پیش کش کی تھی۔

اِنٹرویو میں آپ سے ''معجزہ'' پر ایک مقالہ لکھنے کو کہا گیا۔ آپ نے نمازِ عشا کے

بعد سے نمازِ فجر تک فُل اسکیپ سائز کے بائیس (۲۲) صفحات کا نہایت عالمانہ و محققانہ مقالہ لکھ کر سب کو محوِ حیرت کر دیا۔ اور منتظمینِ کالج کی خواہش پر کالج کی جامع مسجد میں بعد نمازِ جمعہ ''توحید'' کے موضوع پر بڑی مدلّل عالمانہ و فاضلانہ تقریر کی جس نے سامعین کو بے حد متأثر کیا۔ ان سامعین میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی و نواب وقارُ الملک مشتاق حسین اور دیگر ارکانِ کمیٹی بھی موجود تھے۔

حافظ غلام غوث نبیرۂ مولانا ہدایت اللہ جون پوری لکھتے ہیں:

''ایم اے او کالج علی گڑھ میں دینیات کے لکچرر کی ضرورت تھی۔ مولانا کو اطلاع دی گئی۔ انٹرویو میں ''معجزہ'' پر مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی اور ساتھ ہی کہا گیا کہ کتابوں کی ضرورت ہو تو (کتب خانہ) حبیب گنج (علی گڑھ) تشریف لے جائیں۔

مولانا نے فرمایا: بِحمدِ اللّٰہ! مجھے کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف کاغذ اور قلم دوات مُہیّا کر دیا جائے۔

چنانچہ نمازِ عشا کے بعد سے صبح کی نماز تک ایک ہی مجلس میں بائیس (۲۲) فُل اسکیپ صفحات پر مدلّل مضمون قلمبند کر دیا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔

پھر نمازِ جمعہ کے بعد ''توحید'' پر خطاب کرنے کے لئے کہا گیا۔ تو آپ نے تین گھنٹے تک اس موضوع پر تقریر فرمائی۔ جسے سُن کر پرستارانِ توحید جھوم گئے۔

اس تقریر میں دینیات کمیٹی کے تمام اراکین، نواب وقارُ الملک مشتاق حسین اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی موجود تھے۔ اسی دن پچاس روپے ماہوار پر آپ کا تقرر کر دیا گیا۔'' (سہ ماہی ''العلم'' کراچی۔ شمارہ اپریل تا جون ۱۹۷۴ء بقلم حافظ غلام غوث نبیرۂ مولانا ہدایت اللہ جون پوری۔)

زمانۂ تدریس میں آپ نے ''مجلسِ درسِ قرآن'' کی بھی ذِمّہ داری سنبھالی۔ یہ درسِ قرآن اِفادۂ عام کی غرض سے جاری ہوا تھا جو نمازِ عصر سے مغرب تک ہوا کرتا تھا۔

صدر یار جنگ مولانا نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی اس کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نواب وقارُ الملک کے زمانے میں علی گڑھ کالج میں پروفیسرِ دینیات کا عُہدہ قائم ہوا۔سید سلیمان اشرف کا تقرُّر بحیثیت پروفیسر دینیات عمل میں آیا۔

درسِ قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔اس کا ایک دَور ختم ہو چکا تھا۔

اُس وقت بھی عُلما ے کرام مدعو ہوئے تھے۔مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی،مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی،اور مولانا عبدالحق صاحب حقّانی (دہلوی) اور بزرگوں سے درخواستِ قُدوم کی گئی تھی۔

چنانچہ مولانا عبدالحق حقّانی صاحب تشریف لائے تھے۔چند گھنٹے امتحان لیا۔

جو تحریر بعدِ امتحان میرے نام بھیجی تھی،اُس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجۂ امتحان سے مَمدوح کو حیرت انگیز اطمینان ہوا تھا۔'' (ص ۸۰۔مقالاتِ شیروانی۔۱۹۴۶ء)

مولانا سید سلیمان اشرف جب تک علی گڑھ میں بقیدِ حیات رہے،آپ کا عالمانہ وقار سارے اہلِ علم و اہلِ ثروت و امارت پر حاوی رہا۔آپ کی قیام گاہ کی مجلس میں کچھ مخصوص اہلِ علم ہی کو باریابی کی سعادت و اجازت حاصل تھی۔جن میں سے چند حضرات کے نام درج ذیل ہیں:

صدر یار جنگ مولانا نواب حبیبُ الرحمٰن خاں شیروانی،محمد مقتدیٰ خاں شیروانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی،ڈاکٹر بُرھان احمد فاروقی،مولانا فضلُ الرحمٰن انصاری،ڈاکٹر سید بدرُ الدین علوی،ڈاکٹر سید عابد احمد علی،محمد اَنوار صمدانی،محمد اِکرامُ اللہ خاں،مولانا ابوبکر، سید زینُ الدین،سید بہاءُالدین وغیرھُم۔

آپ کی قیام گاہ کی پُر وقار یومیہ مجلس کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''مرحوم (سید سلیمان اشرف) خوش اَندام،خوش لباس،خوش طبع،نفاست پسند،سادہ مزاج اور بے تکلُّف تھے۔

ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خود داری اور اپنی عزتِ نفس کا پاس تھا۔

ان کی ساری عمر علی گڑھ میں گذری۔جہاں اُمَرَ اوارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا۔مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دَب کر یا جھک کر ملے۔ جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔

علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں۔

اُن کی قیام گاہ ایک درویش کا خانقاہ تھی۔جو آتا جھک کر آتا۔اگر مجلس ساز گار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا۔ورنہ اُلٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ان کی تقریر و وعظ میں بڑی دل چسپی اور گرویدگی تھی۔'' (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔شمارہ جون ۱۹۳۹ء۔بقلم سید سلیمان ندوی)

خانقاہِ سلیمانی میں نواب صاحب کی مستقل حاضری کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

''مرحوم (نواب حبیب الرحمٰن شیروانی) کی پابندیِ وضع کی ایک خاص یادگار علی گڑھ میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیام گاہ میں اخیر وقت کی حاضری تھی۔جو مغرب تک جاری رہتی۔

جب وہ (مولانا شیروانی) آتے،یہ حاضری بلا ناغہ ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی۔''

(ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔جون ۱۹۳۹ء۔بقلم سید سلیمان ندوی)

سید سلیمان اشرف کی مجلسِ علم و ادب کے ایک حاضر باش پروفیسر سید بدرُالدین علوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) لکھتے ہیں:

''نواب صدر یا جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ:

جتنے دن بھی علی گڑھ قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سید سلیمان اشرف کے یہاں تشریف لاتے۔ علمی ودینی مسائل، بزرگوں کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوعِ سخن رہتے۔"

(ماہنامہ "معارف"، اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۳۹ء۔ بقلم پروفیسر بدرُالدین علوی)

(۱) **المُبین** (۲) **اَلْاَنْهَار** (۳) **النُّور** (۴) **الرَّشاد** (۵) **الحَج** وغیرہ سید سلیمان اشرف کی علمی وتحقیقی یادگاریں ہیں۔

اردو کے صاحبِ طرز اور مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء۔ علی گڑھ) سید سلیمان اشرف کے شاگرد اور آپ کی مجلسِ علم وادب کے مستقل حاضر باش تھے۔ بارگاہِ سلیمانی میں پروفیسر صاحب کو تقرُّبِ خاص حاصل تھا۔ اپنی مشہور کتاب "گنجہائے گراں مایہ" (مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵) میں پروفیسر صاحب نے اپنے استاذِ محترم سید سلیمان اشرف پر بڑا وقیع اور طویل مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ اس مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا، جلسے ہوتے، مرحوم (سید سلیمان اشرف) ان میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ اس پر اکثر پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں لیکن مرحوم اپنی جگہ سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔

کہتے تھے:

یونیورسٹی میں دولت وامارت کا کیا ہیچ؟ ایسے لوگوں کے لئے ساری دنیا پڑی ہے۔ وہیں یہ ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم وفضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی صاحبِ فضل وکمال آئے تو البتّہ!

ایک بار کوئی مِٹنگ تھی۔ جس میں گفتگو تیز ہونی شروع ہوئی۔ ایسے موقع پر مرحوم کب قابو میں رہنے والے تھے؟ بعض لوگوں نے جو قریب بیٹھے تھے، مولانا کو دَبایا کہ

خاموش ہو جانا ہی مصلحت ہے۔

مرحوم نے چمک کر کہا: خاموش کیسے ہو جاؤں؟ وائسرائے کو ایڈریس نہیں کیا جا رہا ہے۔ علم وایمان کی آزمائش ہے۔ نیازمندی یا اِطاعت شِعاری کی نمائش نہیں ہے۔

مِٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا:

اور کیوں جی! یہ تم بھیگی بلّی بنے کیسے بیٹھے رہے؟

میں نے کہا: بس تھوڑی سی ہی کسر باقی تھی۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ بھیگی بلّی، "گربۂ عاجز" بن جاتی۔ زور سے ہنسے۔ پھر فرمایا: رہتے بلّی ہی۔

مرحوم مذھبی معتقدات میں بڑا غلُو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کُھلَّم کُھلاَّ ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بایں ہمہ مختلفُ الخیال لوگوں سے بقول اُن کے، کھاتہ کُھلا ہوا تھا۔" (ص ۴۲و۴۳۔ گنجہائے گراں مایہ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

"......... دینیات کے گھنٹے میں اکثر طلبہ لیکچر کم سنتے، حاضری کی فکر زیادہ رکھتے۔ اور تھوڑی بہت تفریح سے بھی باز نہ آتے۔ لیکن مولانا (سید سلیمان اشرف) کی کلاس میں نظم وسکوت قائم رہتا۔ مرحوم (سید سلیمان اشرف) سے طلبہ مسرور بھی رہتے اور مرعوب بھی۔

ایک دن کسی طالب علم نے کلاس میں دریافت کیا:

جنابِ والا! حضرت عمر نے حضرت خالد بن ولید کو فوج کی سرداری سے جب مَعزول کر دیا تو حضرت خالد نے حضرت عمر سے مَعزولی کے وجوہ کیوں نہ دریافت کیے؟

اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا: حضرت خالد نے تو جب وجوہ دریافت نہ کیے، تیرہ سو سال کے بعد آپ کو وجوہ دریافت کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی؟

سمجھے نہ بندہ نواز! ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالا کیجیے۔ آگے بڑھیے۔" (ص ۴۴و۴۵ گنجہائے گراں مایہ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵)

............''علم و مذہب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں آ جاتے ۔ لیکن اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ۔

ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے وہ علم یا مذہب کے بَل پر یا ان کے ناموس کی حفاظت میں آمادۂ جہاد ہیں ۔ تکبّر یا تبختُر کا شائبہ تک نہ ہوتا ۔ لیکن جب بے تکلّف دوستوں کے حلقے میں ہوتے تو ان کی باتوں میں شگفتگی ، رنگینی و زیبائی ہوتی ۔

مرحوم یاد آتے ہیں تو ذہن میں ''عَجم کا حُسنِ طبیعت ، عرب کا سُوزِ دروں'' کا نقشہ پھر جاتا ہے ۔'' (ص ۴۵ ۔ گنجہائے گراں مایہ)

........''اُس وقت جب کہ (سید سلیمان اشرف کی) نمازِ جنازہ کا مسئلہ زیرِ غور تھا ، مرحوم کی ایک بات یاد آئی ۔

عرصہ ہوا ، ایک بار فرمایا تھا: دیکھو! دینیات کے پرچے میں نمازِ جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ دیتا ہوں ۔ اس کا سبب جانتے ہو؟

میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ:

ہر مسلمان جو اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے ، وہ نمازِ جنازہ ہے ۔ میں مَرنے لگوں تو مجھے اطمینان رہے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالبِ علم میری نمازِ جنازہ پڑھائے گا ۔''

اس وقت جب کہ یہ نہیں طے ہو پا رہا تھا کہ نمازِ جنازہ کون پڑھائے ؟ مجھے مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی ۔ اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد نماز پڑھائے ۔

کاش! میں ہی پڑھا سکتا ۔ لیکن توفیق ہوئی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نمازِ جنازہ پڑھانی چاہیے تھی ، وہیں تعزیت کا ریزولیشن پڑھ کر گھر واپس آیا ۔ اور نمازِ جنازہ کا بدل تعزیت کا ریزولیشن رہ گیا ۔'' (ص ۵۱ ۔ گنجہائے گراں مایہ)

............''مرحوم جسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر ، آگے بڑھ کر ، جی کھول

کر ملتے اور کوئی خوش دِلی کا فقرہ ضرور کہتے ۔

مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے ۔ کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے ۔ مذہبی عقائد میں کٹّر ، سُلوک میں بے لَوث ، جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے ملتے ۔ بڑا ہوتا تو اس سے کہیں بڑا ہو کر ملتے ۔ علم کا وقار ان کے دَم سے تھا ۔ معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا ۔'' (ص ۳۰ گنجہائے گراں مایہ ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی)

...............آواز میں کڑک اور لچک دھمک بھی ۔ خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صَفیں اُلٹ دیں گے ۔ نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک ، دونوں کی عظمت کا اِحساس ہے ۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے ۔ جاڑے کے دن تھے ۔ یَخ بھری ہوائیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رگ و ریشہ میں سوئیاں بن کر اتر جاتی ہیں ۔............

مرحوم امامت کے لئے آگے بڑھے ۔ تکبیر ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولانا نے کہا: اللّٰہُ اکبر ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس صدا نے فضا کی ہر صدا کی لَرزِش چھین لی ۔

اس کے بعد جو قرأت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا ، جیسے خالد کی تلوار میدانِ جہاد میں : کوندتی ، لرزتی ، گرتی ، لچکتی ، کاٹتی ، سمٹتی ، تیرتی ، اُبھرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔

کوئی لمبی سورت تھی ۔ جب تک ختم نہ ہوئی ، یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان میں بجلیاں بھر گئی ہیں ۔ اور شوقِ خود سپاری میں ہمیں نہیں ، در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں ۔

اس وقت کی نماز اب بھی یاد ہے ۔ اور یہ بھی کہ وقت آ گیا تو شوقِ شہادت دنیا کے ہر نشیب و فراز اور زندگی کے ہر تَأمُّل و تَذَبذُب کو خَس و خاشاک کی طرح بَہا لے جائے گا ۔

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گھمنڈ ہے ۔ یا علم کی گہرائی یا وزن نصیب نہیں ہے ۔ یا صرف دنیوی اِقتدار کا حامل ہے ۔

اگر کوئی چھیڑ بھی دیتا تو ٹال جاتے۔ ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجیے۔ آپ کو اِن باتوں سے کیا سروکار؟

اَلْمُبِین شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم کو بھیجا۔ اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اقبالؔ مرحوم اپنے لیکچروں کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی ملاقات ہوگئی۔

اَلْمُبِین کا ذِکر چھڑ گیا۔ سر اقبالؔ نے بڑی تعریف کی۔ اور فرمایا:

مولانا! آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔

گفتگو ہوتے ہوئے ایک موقع ایسا آیا جب سر اقبالؔ مرحوم نے فرمایا کہ:

مولانا! دوسرے ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجیے تو بہتر ہوگا۔

ایک ذی وجاہت بزرگ جن کو یونیورسٹی کے نظم و نسق میں کافی دخل تھا اور اپنے سِن و سال کے اعتبار سے بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی، مرحومین سے ذرا فاصلے پر دسترخوان پر موجود تھے۔

وہیں سے آواز آئی: ہاں مولانا! میری بھی وہی رائے ہے جو سر اقبالؔ نے دی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں..........

اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ مرحوم نے لِلکارا:

صاحب! بس کیجیے۔ آپ کھانا کھائیے۔ آپ کو اِن باتوں سے کیا نسبت؟ ان باتوں میں نہ پڑیے۔ کھانا کھائیے۔ ملاحظہ فرمایا۔ ہاں! بس کھانا کھاتے جائیے۔

ایک اور بزرگ دینیات کے نصاب سے دلچسپی لینے لگے۔ مقرّرہ نصاب کی کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ توقع یہ تھی کہ مرحوم تبادلۂ خیالات

سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔

مرحوم نے تحریری کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک صاحب سے یہ البتّہ کہلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انھوں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔

ایک دن حلقۂ چائے نوشی میں آ کر شریک ہوئے اور تھیالوجی (دینیات) کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

مرحوم نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا: آپ کو دینیات سے کیا واسطہ؟ آپ کے اپنے مَشاغِل کیا کم ہیں کہ دینیات کی طرف توجہ فرمائیں؟

وہ صاحب خَفیف ہو کر خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں آموں کا تذکرہ آ گیا۔ اس میں اس نو وارِد نے بڑے اِنہماک سے حصہ لینا شروع کیا۔

مرحوم نے فرمایا: یہ ٹھیک ہے۔ اس پر گفتگو کیجیے۔ ملاحظہ فرماتے ہونا۔ یہ آپ کا حق ہے'' (ص۳۰ تا ۳۲ گنجہائے گراں مایہ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

....''ایک زمانے میں کلاس میں لَوائِح جامیؔ اور گلشنِ راز پڑھایا کرتا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی دِقّتیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بہت خوش ہوتے۔ کہتے: بیٹھو۔

میں عرض کرتا: کلاس شروع ہونے والی ہے۔ صرف چند مقامات ہیں جہاں اَٹکتا ہوں۔

فرمایا: یہی تو مصیبت ہے۔ تفصیل سے نہیں سنتے۔ تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے۔ طالب علم یہ نہیں کرتے۔ یہ کام اُٹھائی گیروں کا ہے۔ پگڑیاں ہوں یا ڈِگریاں، علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالبِ علم میں سعادت کہاں سے آئے؟

میں نے کہا: مولانا! گھنٹہ ہونے والا ہے۔ آخر اُٹھائی گیروں پر بھی تو بُرا وقت آتا ہے۔

کہتے: اچھا اچھا۔ بولو! پڑھو!

میں پڑھنا شروع کرتا۔ بیچ میں روک دیتے۔ کہتے: معلوم ہے؟ پھر اس کی وضاحت

کر دیتے۔ چلنے لگتا تو کہتے: دیکھو! پھر کہتا ہوں کہ قرآن پڑھ ڈالو۔ لَوائحِ جامی اور گلشنِ راز کلاس میں پڑھا دو گے۔ لیکن قرآن پڑھے بغیر لکھے پڑھے لوگوں کے مجمع میں ان مباحث کو مَت چھیڑنا۔ آگے تم جانو تمھارا کام۔

اور ہاں! ایک پان کھاتے جاؤ۔ میں نے کہا: جی نہیں۔ کلاس بھاگ جائے گی۔

کہتے: ٹھہرو ٹھہرو۔ پڑھانا آتا ہے تو کلاس بھاگ جائے تو بھاگ جائے۔ پڑھنے والے انتظار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ۔

ایک بار چائے نوشی کی محفل گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خانقاہِ سلیمانی میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا۔ لیکن اکثر بار پا جاتے تھے۔

مولانا لطفُ اللہ صاحب مرحوم (علی گڑھ) کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ مُتذکّرۂ الصّدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطفُ اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے۔ چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔

مرحوم (سید سلیمان اشرف) نے چائے کا ایک دہکتا مہکتا نیم جُرعہ لیتے ہوئے فرمایا:

بھئی! میں تو مولانا لطف اللہ مرحوم کی کرامت کا قائل ہو گیا۔

نو وارد نے تعجب میں آکر پوچھا: یہ کیوں کر؟

مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: اور جو انھوں نے آپ کو پڑھا دیا۔ یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ (ص ۳۳۲و۳۳۳۔ گنجہائے گراں مایہ۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

..........'' آج کم و بیش گیارہ سال ہوئے، یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا (سید سلیمان اشرف) خاص طور پر زَد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ نَفسی نَفسی کا عالَم تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ حال گذر چکا ہے۔

اس زمانے میں مولانا کو دیکھا۔ کیا مجال کہ روزمَرَّہ کے معمولات میں فرق آجاتا۔ جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اُس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔

شام کے وقت برآمدے میں لوگ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرتا۔

ایک شب مَیں حاضر ہوا۔ مرحوم (سید سلیمان اشرف) کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تأمل کرتے۔

عرض کیا: مولانا! کیا ہونے والا ہے؟ خدانخواستہ نوعِ دیگر ہوا تو کیا ہوگا؟

کہنے لگے: رشید! تم بھی ایسا کہتے ہو؟

مجھے خیال تھا کہ تم اس قسم کا ذِکر نہ چھیڑو گے۔

ہوگا کیا؟ وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔

مومن کی شان یہی ہے کہ اس پر ہَرَاس طاری نہ ہو۔ تم ڈرو گے تو اُن کا کیا حال ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔ پھر ڈرنے جھجھکنے سے کیا فائدہ؟

مرحوم پر اس وقت جلال سا طاری تھا۔ شہنشاہیتِ روما کا وہ عہد یاد آگیا جب گاگس نے روم پر قبضہ کیا اور وحشیوں نے فتح کے نشے میں آکر سینیٹ کا رُخ کیا۔ جہاں کا ہر رُکن اپنی متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جن میں سے ہر ایک کو وحشیوں نے نشست ہی پر ذبح کر ڈالا لیکن سینیٹرس نے اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ و زاری کی۔

وہ دن گذر گئے جو ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا۔ مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ آج اس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ:

کیسا مَرد تھا اور کتنا بڑا سردار تھا جو ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا۔ اس وقت صرف مرحوم کی ذات ایسی تھی

جو اپنی جگہ پہاڑ کی طرح قائم تھی۔

مجھے یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کی تاریخی دومنزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بَم برساتے ہوتے تو بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا۔

۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ ''نان کوآپریشن'' کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔ ''گائے کی قربانی'' اور ''موالات'' پر بڑے بڑے جیّد اور مُستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اِظہار کر دیا ہے۔ اس زمانے کے اَخبارات، تقاریر، تصانیف اور رُجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا؟

اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ:

جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے، وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

کالج (علی گڑھ) میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم (سید سلیمان اشرف) مَطعون ہو رہے تھے مگر چہرے پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔

اس زمانے میں اسی دومنزلہ کے پچھلے کمروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کی نشست کے کمروں میں صرف ایک دیوار حدِّ فاصل تھی۔ جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کئی کئی بار ملنے کا اتفاق ہوتا۔

کہتے تھے: رشید! دیکھو، عُلما کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں؟ اور لیڈروں نے مذھبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھروندا بنا رکھا ہے؟

میری سمجھ میں اس وقت ساری باتیں نہ آتی تھیں۔ اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رَہ رَہ کر ان ہی باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ:

میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مُناقشوں کا مرکز بنے۔ لیکن کیا کروں؟ خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقعہ ملے گا۔ اس دنیا کے پڑھے لوگ کیا کہیں گے؟

بِالآخر مولانا نے قلم اٹھایا اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہے۔

اکثر مجھے بٹھا کر سناتے اور رائے طلب کرتے۔ کہتا: میری مذھبی معلومات اِتنی نہیں ہیں کہ محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کہتے ہیں، ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

کہتے: یہ بات نہیں ہے۔ تم پر اس ہَڑکَم کا اثر ہے۔ اور سمجھتے ہو کہ یہ تمام عُلما جو کچھ کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ اور میں کالج کا مولوی، یوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ رہیں گے تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق پر۔

سیلاب گذر گیا۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہدِ سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔

آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔ سارے عُلما سیلاب کی زد میں آ گئے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔

اس کا اِعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مرحوم نے کہا کہ:

آپ نے اُن کی اِس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہ کیا؟

ایک مرتبہ دریافت کیا تو مرحوم نے ہنس کر فرمایا: لیکن میں ان کلمات کو دُہرانا نہیں چاہتا۔ اس سے بَدمزگی اور پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

تیس (۳۰) سال سے زیادہ کا زمانہ گذرا۔ جون پور میں سیرتِ رسول کی تقریب تھی۔ مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی۔ زبردست اِجتماع تھا۔ مرحوم اپنے والہانہ جوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے۔ حاضرین کی خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی مُتنفِّس ہو۔

اتنے میں دور سے ایک بوڑھا، پستہ قد، منحنی شخص، جھکا ہوا، اَنبوہِ کثیر کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گذرتا وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم (اسٹیج) پر پہنچ گیا۔

مرحوم کو سینے سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔

یہ مولانا ہدایتُ اللہ خاں جون پوری، مرحوم (سید سلیمان اشرف) کے استاذ تھے اور جون پور میں اُس وقت علم وفضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرحوم میں اپنے استاذ ہی کا جبروت وطنطنہ تھا۔ ان کی شفقت میں بھی جبروت کارفرما تھا۔ مرحوم کو جھجک کر اور گول مول باتیں کرتے کبھی نہ پایا۔'' (ص ۲۲ تا ۲۶۔ گنجہائے گراں مایہ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

.........مرحوم اجمیر شریف جارہے تھے۔ اتفاقِ وقت کہ جس گاڑی سے مرحوم سفر کرنے والے تھے، اسی سے ایک بڑے ذی وجاہت بزرگ کا یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مرحوم آزردہ تھے۔

انھوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولانا بھی ان کی پذیرائی کے لئے تشریف لائے ہیں۔ دل میں خوش ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

مرحوم نے بغیر کسی پس وپیش کے فرمایا: جی! اِس سعادت کے لئے دوسرے آئے ہوئے ہیں۔ میں ہاتھ نہیں ملاتا۔ یہ کہہ کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گئے۔

آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسے میں شریک نہ ہوئے۔ کسی بڑے آدمی کے گھر نہ جاتے تاوقتیکہ اس سے یارانہ نہ ہوتا۔

مرحوم کی ایسوں سے بھی دوستی تھی جو اپنے وقت کے جیّد عالمِ دین سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص محبت واحترام کے جذبات لے کر آتا تھا۔ اور مطمئن ومسرور واپس جاتا۔

جس سے طبیعت نہ ملتی، کبھی اس کی ہمت ہی نہ ہوتی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے۔ اس معاملے میں بڑے کھرے تھے۔ دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیفِ قلب نہ کی۔ لیکن جن سے خاص تعلقات تھے ان پر جان دیتے تھے۔ اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اس کی خوشی

سے باغ باغ ہو جاتے۔

مرحوم کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعقول مضامین نکلے۔ اور اکثر ایسے نارَوا اور رَکیک حملے کیے گئے کہ انھیں یاد کر کے آج تک میرا دِل کُڑھتا ہے اور لکھنے والوں سے قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن مولانا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

آج تک میں نے ان کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہو کہ ان پر اس کا کوئی اثر ہو۔

ایک دن معلوم نہیں کون سا موقع تھا کہ اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو فرمایا اور اپنے مخصوص قلندرانہ انداز سے:

چلو! آگے بڑھو۔ یہ نہیں دیکھتے کون کہہ رہا ہے؟ صاحب زادے ہو۔ یہی دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہہ رہا ہے؟ لڑائی مجھے پسند ہے لیکن بہادروں سے، بیسَواؤں سے نہیں۔'' (ص ۲۵و۲۶ گنجہائے گراں مایہ۔ مؤلّفہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵)

پروفیسر رشید احمد صدیقی (متوفی ۱۹۷۷ء علی گڑھ) نے اپنے مضمون میں جس المُبین کی اشاعت اور اس پر ڈاکٹر اقبالؔ کی تعریف وتحسین کا ذِکر کیا ہے اُسے محمد مقتدیٰ خاں شیروانی علی گڑھی نے ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب پر ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد جو ہر سال کسی وقیع ادبی کتاب کا انتخاب کر کے اسے انعام دیا کرتی تھی، اس اکیڈمی نے ۱۹۲۹ء کا انعام المُبین کو دیا۔ جب کہ بعض دوسرے حضرات اس کے متمنی تھے اور سید سلیمان ندوی شعرُ الھند مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کو انعام دِلانے کے خواہش مند تھے۔

اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی نے حکیم عبدالحکیم دسنوی کے نام اپنے ایک مکتوب محرّرہ ۲۵ مئی ۱۹۳۰ء میں لکھا ہے کہ:

............ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے نئے سال کی اَدبی کتابوں پر انعام کے لئے جو سَب کمیٹی

بنائی ہے اُس میں سات آدمیوں میں ایک مَیں بھی تھا۔

دوصاحبوں نے ان میں سے اپنی کتابیں خود پیش کی تھیں، وہ رائے سے محروم رہ گئے۔ باقی پانچ رہ گئے۔ رشید صدیقی، ماجد میاں، سجاد حیدر، نیاز فتح پوری اور مَیں۔

رشید صدیقی صاحب نے تین اور صاحبوں کو ہموار کرلیا تھا۔ ماجد میاں کی رائے الگ تھی۔ میں مُذَبذَب کہ شعرُ الھند رہ گئی۔ اس لئے کثرتِ رائے المُبین پر ہوگئی اور انعام اس کو ملا۔"

(ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ۔ شمارہ نومبر ۱۹۵۵ء)

عربی زبان وادب کی خصوصیات پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ جتنا مدلّل مَوادسید سلیمان کی اِس کتاب اَلمُبین میں ہے۔ اردو تو خیر! عربی زبان میں بھی ایسی کوئی وقیع کتاب شاید ہی تالیف کی گئی ہو۔

بہرحال! علاّمہ سید سلیمان اشرف کے حالات وخیالات اور چند اَربابِ علم وادب کے تأثرات وبیانات سے قارئین اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ اپنے موقف پہ ثبات واستقلال کا آپ کے اندر کتنا دَم خَم تھا اور کسی کے علم سے، عقل سے، سیاست سے، اِقتدار سے، وجاہت سے، مرعوب ہونے کا آپ کی زندگی میں کوئی خانہ ہی نہ تھا۔

سید سلیمان اشرف کی خطابت اور شگفتہ بیانی بھی شہرۂ آفاق اور اپنی مثال آپ تھی۔ جسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے خواجہ حسن نظامی دہلوی (متوفی ۱۹۵۴ء) لکھتے ہیں:

"تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای آئی آر کی ڈاک گاڑی۔

دورانِ تقریر صرف درود پڑھنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے ورنہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھارا نکلی ہے جو ہَری دُوار تک کہیں رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔

بیان کی ایسی رَوانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔

تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔"

(درویش جنتری ۱۹۲۳ء مطبوعہ دہلی۔ از خواجہ حسن نظامی دہلوی)

بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دَہائی کے اِنقلابی دَور کو قارئین سامنے رکھیں کہ حالات کے دھارے میں مسلم قائدین ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے عُلما بھی بَہے چلے جارہے تھے اور سحرِ سامری نے انھیں کس طرح متأثر ومرعوب کررکھا تھا۔ جب کہ سید سلیمان اشرف نے ملک کے سیاسی میدان کے بڑے بڑے سُورماؤں کو اپنی علمی وفکری صلاحیت اور قوتِ تحقیق وتنقید وتنقیح واِستدلال سے ساکت ومَبہوت ومُہر بہ لَب کردیا۔

اس سلسلے کا ایک تاریخی واقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں جسے اسی ہنگامی دور کے مُقتدر صاحبِ علم وفضل نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ ہیں سید فضلِ امام واقفؔ عظیم آبادی جو اپنی تاریخی یادداشت سے اس طرح قوم ومِلّت کو باخبر اور مستفید فرمارہے ہیں:

"مولانا سید سلیمان اشرف کتنے دل چسپ آدمی تھے اس کا اندازہ اس تاریخی واقعہ سے ہوگا کہ:

"ہندو مَہاسَبھا" گائے کی قربانی بجَبر واکراہ وبہ زور وتَشدُّد بند کرانا چاہتی تھی۔ اور گاندھی جی جنھیں گاندھوی فرقہ کے اَفراد "امامِ شیخ وبَرَھمن" کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے، گائے کی قربانی مسلمانوں کی رضامندی سے بند کرانا چاہتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ٹائپ کے کانگریسی عُلماے ہند کی پوزیشن کچھ عجیب اول فول تھی۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

ان سارے خلافتی حضرات میں مولانا فاخر الہ آبادی سب سے زیادہ صحیح الدماغ، سب سے زیادہ سلیم العقل اور بہادر عالمِ دین اور درویش تھے۔

الہ آباد میں گاؤکشی یا گائے کی قربانی کے مہتم بِالشان مسئلہ پر ایک غیر رَسمی مصالحتی کانفرنس شروع ہوگئی۔ پنڈت مَدَن مُوہَن مالوِی ہندو نقطۂ نظر کی ترجمانی کررہے تھے۔ وہ ڈاکٹر مونجے سے مختلف مزاج رکھنے والے آدمی تھے۔ لاٹھی ڈنڈے پر جتنا یقین ڈاکٹر مونجے

کوتھا، مالوی جی کو نہ تھا۔ اگر چہ دونوں بنیادی طور پر ایک ہی جیسی ذہنیت کے حامل تھے۔

گاندھی جی ''درمیانی انسان'' کا رول ادا کر رہے تھے۔ اور ان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ ''دشمن ہلاک نتواں کرد الاّ بدوستی۔'' کہ دشمن ہلاک نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ دوستی نہ کی جائے۔

ان (گاندھی) کے سارے ''ہندو مسلم اتحاد'' کی روح بھی غالباً یہی تھی۔ جس کو حضرت امام احمد رضا بریلوی نے پکار کر کہہ دیا تھا اور صاف فرما دیا تھا کہ دشمن اپنے دشمن کے لئے تین باتیں چاہتا ہے:

پہلی بات تو یہ کہ میرا دشمن مَر جائے کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کہیں چلا جائے۔ تا کہ اس کی آواز میرے کانوں میں نہ پڑے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ کہ ذلیل ہو کر رَہے۔

حضرت امام احمد رضا نے کہا تھا کہ گاندھی کی کانگریس اسی اصول پر کاربند ہے۔

مولانا سید سلیمان اشرف نے اسی نکتۂ بلیغ کی وضاحت میں وہ ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا نام ''النُّور'' ہے۔ اور جس نے کانگریسی امام الہند جناب مولانا ابوالکلام آزاد کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

بہرحال! سارے ہندوستان کی نگاہیں الہ آباد کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

ہم لوگ آرہ (بہار) میں بیٹھے ہوئے ڈر رہے تھے کہ صلح کی میز پر مسلمان شکست نہ کھا جائیں۔ میدانِ جنگ کی ہار جیت تو روزانہ کا کرشمہ ہے۔ مشاہدہ ہے۔

الہ آباد میں مولانا فاخر الہ آبادی کو سوجھی اور خوب سوجھی کہ اِس کانفرنس میں مولانا سید سلیمان اشرف کا علی گڑھ سے آنا ضروری ہے۔ ورنہ ہم لوگ اس میں شریک نہ ہوں گے۔

مولانا سید فاخر الہ آبادی کی دھونس بھی کم نہ تھی۔ گاندھی جی ان کی باتوں کو رَدّ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پنڈت موتی لال نہرو کو مولانا فاخر الہ آبادی کے اشارۂ چشم واَبرو کے بغیر دو قدم بھی چلنا دُشوار ہے۔

سارے الہ آباد میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا عبدالکافی بانیِ مدرسہ سُبحانیہ الہ آباد نے آرہ (بہار) میں عرصہ کے بعد مزے لے کر سارا قصہ مجھ کو سنایا تھا۔

اس کے بعد۔ مدتوں بعد۔ دہلی میں مولانا شاھد فاخری الہ آبادی سے بھی اس واقعہ کی حرف بہ حرف تصدیق ہوئی۔ سُنیے اور دل تھام کر سُنیے کہ مولانا سید سلیمان اشرف الہ آباد پہنچ گئے۔

سارے مسلمانوں میں شبِ برأت کے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ اور مولانا فاخر الہ آبادی کی تو نہ پوچھیے کہ کیا کیفیت تھی۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے:

آیا مری محفل میں غارت گرِ ہوش آیا
صد جام بکف آیا، صد شیشہ بدُوش آیا

مولانا سید سلیمان اشرف نے ''دوازدہ منزل'' میں قیام فرمایا۔ جو اُن کے ایک مُرید تاجرِ اعظم نے ان کے مواعظِ سیرت اور مجلسِ میلاد کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ الہ آباد کی خوب صورت عمارتوں میں اس کا شمار کل بھی ہوتا اور آج بھی ہوتا ہے۔ ربیعُ الاول کی پہلی سے بارہویں تک مولانا سید سلیمان اشرف کی تقریریں ہوتی تھیں۔ (دوازدہ منزل کو اب تاج شاہی بھی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ جب اپنے آخری دورۂ الہ آباد میں ۲۹۔۳۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء کے اِجلاسِ مسلم لیگ میں شرکت کے لئے الہ آباد پہنچے تو اسی دوازدہ منزل، نخاس کہنہ، الہ آباد میں قیام ہوا تھا اور اِجلاسِ لیگ کے اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر اقبالؔ نے ہندوستان کے اندر ایک مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ مصباحی)

الہ آباد کے علاوہ دور دراز کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے اور (سید سلیمان اشرف کی تقریروں سے) فیض یاب ہو کر رخصت ہوتے تھے۔

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ساغر کا ایک جام
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دوسرے دن جب ''دوازدہ منزل'' سے مولانا سید سلیمان اشرف اس مقام تک جانے لگے تو ان کے ساتھ جانے والوں کی کثیر در کثیر اور اَنبوہ در اَنبوہ تعداد نے ''ھُجومِ

عاشقاں'' کی شکل اختیار کر لی۔

سُلطانِ خوباں می رَود گِردَش ھُجومِ عاشقاں

چابُک سواراں یک طرف، مسکیں گدایا یک طرف

مولانا فاخر الہ آبادی اولین سابقین میں تھے۔مسلمانوں میں ہر طرف خود اعتمادی بڑھ رہی تھی۔اور کانگریسی کیمپ میں سراسیمگی پھیلتی جا رہی تھی۔

''دارُ المُکالَمَہ'' میں پہنچ کر مولانا سید سلیمان اشرف نے پوچھا کہ: بھئی! قصہ کیا ہے؟ میں مالوی جی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔

مالوی جی نے بہت اچھی اور دوستانہ تقریر کی۔اور گائے کے ''فضائل ومناقب'' بیان کیے۔اس کی ''اِفادیت'' اور اس سے ہندوؤں کے گہرے مذھبی جذبات کی والہانہ وابستگی پر بہت مؤثر انداز میں روشنی ڈالی۔

سارے ہندو مسلمان لیڈروں نے ''ہاں میں ہاں'' ملائی۔صرف مولانا فاخر الہ آبادی خاموشی کے ساتھ مولانا سید سلیمان اشرف کی طرف دیکھتے رہے۔

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے بڑی نرم گفتاری کے ساتھ مجمع سے کہا کہ:

میں بھی چاہتا ہوں کہ ہندوؤں کے کسی دیوتا، کسی دیوی کو مسلمان قتل وذبح نہ کرنے پائیں۔مگر آپ حضرات، پنڈت مدن موہن مالوی سے ان ''دیوی دیوتاؤں'' کی ایک مکمل فہرست طلب کریں۔اور ہم لوگ باہمی گفت وشنید سے ایک صحیح فیصلے تک پہنچیں۔رات دن کے جھگڑے اچھے نہیں۔

جب تک مکمل فہرست میرے سامنے نہیں آئے گی میں گفتگوئے مصالحت کو تضیع اوقات سمجھوں گا۔

ہر گوشے سے آواز آئی کہ: ہاں! ہاں! بہت صحیح ہے۔یہی ہونا چاہیے۔

مگر مالوی جی کچھ فکر مند نظر آنے لگے۔

مولانا سید سلیمان اشرف نے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

کل مالوی جی اور ان کے ہم نوا یہ مطالبہ کر بیٹھیں کہ:

مسلمان اپنے بچوں کا ختنہ نہ کرائیں۔کیوں کہ ہم لوگ ''لِنگ'' کی پوجا کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی اِس حرکت سے ہمارے نازک مذھبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

تو بتایئے! اُس وقت مسلمان کس دشواری میں مبتلا ہو جائے گا؟

مولانا نے اس ''نکتہ'' کو اپنی مشہورِ زمانہ باوقار سنجیدگی کے ساتھ کہا۔مگر ساری ''مجلسِ مصالحت'' مُنہ پر رومال رکھ کر ہنسنے لگی۔

گاندھی جی آہستہ سے کِھسک گئے۔مالوی جی شرم سے پانی پانی ہو گئے۔اور اُٹھ کر مجلسِ مصالحت سے خاموشی کے ساتھ اپنے مُستقر کی طرف چلے گئے۔

مولانا فاخر الہ آبادی اپنا قہقہہ ضبط نہ کر سکے۔ان کا ہنسنا تھا کہ ہر شخص دل کھول کر ہنسنے لگا۔

مولانا سید سلیمان اشرف کے لَبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی ہمیشہ فرماتے تھے کہ:

''سید سلیمان اشرف صاحب جس وقت مباحثہ میں تنقیحات قائم کرتے ہیں، اُسی وقت حَرِیف کو شکست دے دیتے ہیں۔'' (ماہنامہ حجازِ جدید، دہلی۔شمارہ ماہِ شعبان ۱۴۰۹ھ/مارچ ۱۹۸۹ء۔وماہنامہ رفاقت، پٹنہ، بہار۔شمارہ جنوری۔۱۹۸۹ء)

اپنے استاذ مولانا ہدایت اللہ جون پوری (وصال ستمبر ۱۹۰۸ء) شاگرد رشید علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال ۱۸۶۱ء) کے ساتھ مولانا سید سلیمان اشرف کے تعلُّقِ خاطر اور حُسنِ عقیدت کا ذِکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ:

اپنے استاذ کے ساتھ عقیدت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ان کے حالات جب کبھی وہ

سُناتے تو ان کے طرزِ بیان اور گفتار کی ہر اَدا سے ان کی والہانہ عقیدت ٹَراوش کرتی تھی۔''

(ماہنامہ ''معارف''اعظم گڑھ۔شمارہ جون ۱۹۳۹ء)

اور اپنے مُرشدِ اجازت وخلافت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے ساتھ مولانا سید سلیمان اشرف کی قلبی وابستگی کا ذِکر کرتے ہوئے آپ کے ایک شاگرد ڈاکٹر سید عابد احمد علی سابق لکچرر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وسابق ڈائرکٹر بیتُ القرآن لاہور لکھتے ہیں:

''استاذِ محترم سید سلیمان اشرف پر حضرت مولانا بریلوی کا اتنا اثر تھا کہ:

میں نے موانا احمد رضا خاں قُــدِ سَ سِــرُّہٗ کی عظیم شخصیت کا اندازہ دراصل استاذِ محترم کی شخصیت سے ہی لگایا۔ مجھے مولانا سلیمان اشرف سے شرفِ تلمُّذ کے علاوہ ان کا انتہائی قُرب بھی حاصل رہا اور میں دیکھتا کہ:

اکثر مولانا بریلوی کا ذکر چھیڑ دیتے اور یوں محسوس ہوتا کہ اکثر ان کے ہی تصور میں مگن رہتے ہیں۔حتی کہ استاذِ محترم کی طبیعت ان کے ہی رنگ میں رنگ گئی تھی۔اور اپنے معتقدات وایمانیات میں منطقی اِستدلال اور علومِ عقلیہ میں خوش کلامی اور قوتِ بیان میں مولانا (بریلوی) کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔

غیر اسلامی شعائر کی مذمّت میں تشدُّد، کانگریس اور ہندوؤں کی ہم نَوائی کرنے والے لیڈروں اور عالموں کے متعلق سخت گیر رَوَیّہ ،مشرکین کو نجس سمجھنا،اوران کے معاملے میں کسی قسم کی مُداھَنت رَوانہ رکھنا، یہ سب صفات دونوں بزرگوں میں مشترک تھیں۔

اسی طرح عشقِ رسول کے معاملے میں طبیعت کا ایک والہانہ انداز بھی سید صاحب میں حضرت فاضلِ بریلوی ہی کی طرف سے آیا تھا۔

لباس اور وضع قطع میں بھی استاذِ محترم (سید سلیمان اشرف) حضرت مولانا

(بریلوی) کا ہی تَتَبُّع فرماتے۔یہاں تک کہ مجھے یاد ہے کہ:

آپ عمامہ بھی اسی انداز کا رکھتے جیسا کہ حضرت مولانا بریلوی مرحوم استعمال فرماتے تھے۔''

(ص۱۰۹۔مقالاتِ یوم رضا۔مطبوعہ لاہور۔بقلم ڈاکٹر سید عابد احمد علی ڈائرکٹر بیتُ القُرآن۔لاہور)

حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صدر شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (وصال ۱۳۵۸ھ/۱۹۳۹ء) کے یہی شاگرد وحاضر باش ڈاکٹر سید عابد احمد علی اپنی ایک عینی شہادت کی تحریری روایت اس طرح کرتے ہیں کہ:

''غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ:

علاّمہ اقبالؔ مسلم یونیورسٹی میں موجود تھے۔ایک مجلس جس میں مَیں بھی موجود تھا، دورانِ گفتگو مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا تذکرہ آ گیا۔

علاّمہ مرحوم نے مولانا بریلوی کو خراجِ عقیدت وتحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طبّاع وذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔

.........سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ:

.........میں نے ان کے فتاوٰی کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔اور ان کے فتاوٰی ان کی ذِہانت وفَطانت،جَودتِ طبع،کمالِ فقاہت،اور علومِ دینیہ میں تجرِعلمی کے شاھدِ عَدل ہیں۔

نیز فرمایا:مولانا بریلوی ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے،اُس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے۔یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور وفکر کے بعد کرتے تھے۔لھذا اپنے شرعی فیصلوں اور فتاوٰی میں انھیں کبھی کسی تبدیلی یا رُجوع کی ضرورت نہیں پڑی۔''الی آخرہٖ ۔عابد احمد علی۔یکم اگست ۱۹۶۸ء۔

(اس پورے تحریری بیان کا عکس، ہفت روزہ اُفُق کراچی۔شمارہ ۲۳/تا ۲۸ جنوری ۱۹۷۹ء میں مطبوع وموجود ہے۔)

☆☆☆☆

صِحَّتِ مَوقِف کی تاریخی شہادت

یہاں میں تاریخِ ماضی کا ایک ورق اُلٹنا اور تاریخی اعتبار سے بھی قارئین کو یقین دلانا چاہوں گا کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) وعلاّمہ سید سلیمان اشرف علی گڑھ وصدرُ الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی اور ان کے ہم خیال وہم نَوا دیگر عُلماے اہلِ سُنّت نے جومَوقِف اختیار کیا اور جو کچھ لکھا، اس کی شہادت، مذہب کے ساتھ تاریخِ ہند بھی دے رہی ہے کہ ان حضرات کا موقف بالکل صحیح اور مبنی بر حقیقت تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی (متوفی ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں:

''۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی تھی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ تأمُّل ہو تو شمال مغربی اَضلاع کی نسبت کسی کو بھی تأمُّل نہیں ہوسکتا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہے۔

یہ صوبہ ان دوشہروں سے گھِرا ہوا ہے جو اردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی دہلی اور لکھنؤ۔

اس صوبہ کے ہندو عموماً اردو سے ایسے مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرتِ تعصُّب وہ ذاتِ شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ 'مَن بجہنم لیکن تختۂ یاراں تباہ گردد'۔

فرانس کے مشہور اور ینٹلسٹ گارسان دتاسی، جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صَرف کی، وہ اس متنازعہ مسئلہ کی نسبت ایک لیکچر میں لکھتے ہیں:

''ہندو اپنے تعصُّب کی وجہ سے ہر ایک ایسے اَمر کے مُزاحم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دِلائے۔''

اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوالِ سلطنت کے بعد اسی طرح، مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں، مگر انھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا۔ اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔'' (ص ۱۴۴۔ حیاتِ جاوید از خواجہ الطاف حسین حالؔی۔ مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو۔ نئی دہلی۔ طبعِ پنجم ۲۰۰۴ء)

''اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی سے صرف کسی قدر اَسما اِس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بِنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جائے۔ اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے کہ:

یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ:

''اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے، ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے''۔

ان کا بیان ہے کہ:

''انھیں دِنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شکسپیر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔

آخر انھوں نے کہا کہ:

یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذِکر سنا ہے۔ اِس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔

میں نے کہا:

''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے اس سے زیادہ مخالفت وعِناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔''

انھوں نے کہا کہ: ''اگر آپ کی یہ پیش گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔''

میں نے کہا: ''مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔''

(ص:۱۴۱۔ حیاتِ جاوید از خواجہ حالیؔ - مطبوعہ نئی دہلی)

''مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں (۲۷) کو سرسید نے دنیا سے رِحلت کی، حضور سر مکڈانل لفٹننٹ گورنر اَضلاع شمال مغرب واَوَدھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے اور معزّز سَر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گذارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے، ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔

اگرچہ اس زمانہ میں سرسید پر ہجومِ رنج والم کے سبب ایسا سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹/ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو (۹) دن پہلے شایع ہوا۔

اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الٰہ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی، اس کو اس باب میں بذریعۂ تحریر کچھ مشورے دیے۔ اور لکھا کہ: اگرچہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہو گا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔

ان کو یقین ہو گیا تھا کہ:

''ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصُّب پر مبنی ہے اس لئے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔'' (ص:۱۴۲-۱۴۳۔ حیاتِ جاوید از خواجہ حالیؔ، مطبوعہ نئی دہلی)

چوٹی کے ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے نے اپنے ایک مکتوب بنام سی آر داس میں لکھا ہے کہ:

''ایک اور چیز جو عرصہ سے میرے لئے وجہِ اضطراب ہو رہی ہے، وہ ''ہندو مسلم اتحاد'' کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور وفکر دوں۔

گذشتہ چھ ماہ میں، مَیں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صَرف کیا ہے اور اس سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ:

''یہ چیز یعنی ''ہندو مسلم اتحاد'' ایک نا قابلِ عمل شئ ہے۔ وہ مسلمان رہنما جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی میرے خیال میں ان کا مذہب ''ہندو مسلم اتحاد'' کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہو گا۔'' (ص:۳۰و۳۱، کانگریسی مسلمان اور حقائقِ قرآن، مؤلَّفہ سید مصباح الحسن، مطبوعہ آگرہ ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء)

''ہندو مسلم اِتحاد'' یعنی مُشرک نوازی کے مُضر اَثرات سے عاجز آ کر چند سال بعد ہی مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرتؔ موہانی وغیرہ نے جو موقف اختیار کیا اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی (کراچی) فرزندِ مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی نے جو راہ اختیار کی، اس سے اہلِ علم و اصحابِ مطالعہ اچھی طرح واقف ہیں۔ گویا عملی طور پر ان حضرات نے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے موقف پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

رفتہ رفتہ حقائق سے پردے اٹھتے رہے اور دوسرے حلقے بھی امام احمد رضا کی مومنانہ بصیرت وفراست اور استقلال واستقامت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی ہند کے افکار ونظریات کا ایک ترجمان ماہنامہ الحسنات رام پور (یوپی۔ انڈیا) لکھتا ہے:

''احمد رضا خاں کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا تھا۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ اور دوسرے ہی سال ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ تَرکِ موالات کا آغاز ہوا۔ احمد رضا خاں نے اس سے اختلاف کیا۔ اور ایک رسالہ اَلمَحَجَّةُ المُؤتَمَنَةُ فی آیةِ المُمتَحَنة (۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے کفار ومشرکین سے اِختلاط اور ان کے ساتھ سیاسی اتحاد کے خطرناک نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔

ان کے معتقدین نے ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اور اس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی جس کا دوسرا نام ''جمہوریتِ

اسلامیہ مرکزیہ'' رکھا گیا۔ اس کے ایک اہم رُکن اور بانی نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) تھے۔ جو احمد رضا خاں کے خلیفہ تھے۔

سیاست کے اس نازک دور میں وہ جوش وخروش سے زیادہ سلامت رَوِی کو مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔'' (شخصیات نمبر، ماہنامہ الحسنات، رام پور۔۱۹۷۹ء)

آخر کار ایک وقت ایسا آیا کہ خلافتی وموالاتی لیڈروں کو بھی ہوش آیا۔ عُلمائے اہلِ سُنَّت کی مسلسل تنبیہ وہدایت کے ساتھ حالات وواقعات، مشاہدات وتجربات کے تلخ نتائج وثمرات نے خلافتی وموالاتی لیڈروں کو ندامت وپشیمانی میں مبتلا کر دیا اور ۱۹۳۰ء آتے آتے وہ اپنے ماضی کی غفلتوں اور نادانیوں پر کفِ افسوس ملنے لگے۔

حضرت مفتی محمد عمر نعیمی مرادآبادی (وصال ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) کی ایک تحریر بغور ملاحظہ فرمائیں:

''۲۱۔۱۹۲۰ء میں جب خلافت کمیٹیاں کانگریس میں ضَم ہوگئی تھیں، اس وقت بھی بتایا گیا تھا کہ ہندوؤں کی دوستی پر اعتماد خلافِ قرآن، خلافِ عقل، خلافِ تجربہ ہے۔ مگر خود رائے لیڈر کب مانتے تھے؟

عُلمائے دین کے درپئے آزار ہوگئے۔ ان کی زندگی اور عزت کے لئے خطرے پیدا کر دیے۔ انہیں طرح طرح کے بہتانوں سے مُتَّہم کیا۔ ان کے ساتھ وہ عِناد بَرتا جو کسی سخت سے سخت کافر کے ساتھ بھی بَرتنا انھیں اپنی زندگی میں کبھی نصیب نہیں ہوا ہے۔

لیکن چند سالوں کے تجربوں نے انہیں یقین دلا دیا کہ عُلما برسرِ حق تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد اور ان پر اعتماد خطرناک اور تباہ کن غلطی تھی۔

مسٹر محمد علی، شوکت علی، سید حبیب، اور دوسرے لیڈر، ہندوؤں کی بے وفائیوں کا رونا رو رہے ہیں۔ اور جو حضراتِ عُلما نے فرمایا تھا، ہو بہو ویسا ہی پا کر اتحاد کے زہریلے اثر سے دور بھاگ رہے ہیں۔

وہی مولوی اور وہی لیڈر جو گاندھی کی اطاعت فرض سمجھتے تھے، آج گاندھی کو مسلمانوں کا بدخواہ مان رہے ہیں۔'' (ص۱۰،۱۱، السَّوادُ الاعظم، مرادآباد۔ شمارہ ربیع الاول ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء)

□□□

خلاصۂ کلام

مذکورہ تمام دینی وفکری مسائل ومباحث اور سیاسی تنظیموں، تحریکوں کے افکار ونظریات اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے شرعی نقطۂ نظر کا اِجمالی جائزہ لینے کے بعد ہر انصاف پسند انسان مندرجہ ذیل نتائج سے مکمل طور پر اتفاق کرے گا کہ مردِ حق آگاہ فقیہِ اسلام امامِ اہلِ سُنَّت مولانا احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قُدِّسَ سِرُّہٗ (اور آپ کے ہم خیال وہم نوا عُلمائے کرام)

(۱) ہر اس فتنہ کے زبردست مخالف تھے جس سے اسلام وایمان کو کچھ بھی خطرہ لاحق ہو۔

(۲) متوقع خطرات کو پہلی ہی نظر میں اپنی مومنانہ بصیرت کے ذریعہ بھانپ لیا کرتے تھے۔

(۳) جدید افکار وتحریکات کے سبھی گوشوں کو مَدِّ نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ فرماتے، اس لئے آپ مدۃُ العمر اپنے موقف پہ جبلِ مستقیم کی طرح جَمے رہے۔ اور کبھی آپ کو بعض دیگر اصحابِ علم اور دانشورانِ قوم ومِلَّت کی طرح تبدیلیِ رائے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

(۴) آپ کے فیصلے وقتی جذبات اور عارضی اَسباب ومُحرِّکات کی نذر نہیں ہوئے۔

بلکہ آپ کی ہر بات اور آپ کا ہر قدم سُنَّت کی اِقتدا اور شریعت کی اِطاعت واِتباع کی راہ پر تاحیات گامزن رہا۔

(۵) آپ نے دین و مذہب کے حکم اور فکر و مزاج کے ساتھ استقلال واستقامت کا ہمیشہ ثبوت دیا اور ان سے ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی اِنحراف نہیں کیا۔ کیوں کہ تَمَسُّک بِالدِّین اور اِستِقَامَتُ عَلیٰ الحَق آپ کا جوہرِ امتیاز تھا۔

(۶) بعض اوقات اپنے جذبۂ دینی کے تحت آپ نے از خود پیش قدمی کر کے گمراہیوں کی نشان دِہی فرمائی۔ اور اصلاحی کوششوں کے باوجود جب مخالفین کا اپنے رَوَیہّ پر ضِد اور اِصرار بڑھا تب ہی آپ نے ان کے خلاف کوئی شرعی فتویٰ صادر فرمایا۔

(۷) آپ کی زندگی میں جلالِ فاروقی کا جلوہ صاف عیاں ہے۔ کیوں کہ باطل تحریکوں کے مقابلے میں آپ نے ذرا بھی رُو رِعایت سے کام نہ لیا۔ بلکہ صف شکن مجاہد کی طرح آپ کی شمشیرِ خارا شگاف قہرِ الٰہی بن کر اَعْدَ اے اسلام و مسلمین اور مُتجاوِزین و مُنحرِفین کے سَروں پہ ہمیشہ لٹکتی رہی۔

(۸) دینی مسائل اور ملکی معاملات میں آپ واضح فکر کے حامل تھے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر آپ کی گہری نظر رہا کرتی تھی۔

(۹) تحریکوں، تنظیموں کے نمائندے آپ سے ملاقات کر کے یا کسی طرح آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرتے لیکن آپ نہایت بصیرت واحتیاط سے کام لیتے ہوئے وہی کہتے جس کی شریعتِ مطہَّرہ اجازت دیتی اور وہی حکم صادر کرتے جو مفادات ومصالحِ مسلمین کے مطابق ہوتا۔

(۱۰) اپنے عہد کے مشاہیر عُلما ومشائخ کرام سے آپ کے دوستانہ مَراسم اور قریبی رَوابِط وتعلقات تھے اور وہ لوگ آپ شخصیت، آپ کے علم وفضل اور آپ کی رائے کا نہایت احترام کرتے۔

(۱۱) مسلمانانِ اہل سُنَّت اُس وقت کے حالات کے پیشِ نظر مختلف تحریکات کے تعلق سے آپ کی بارگاہ میں ہِدایت کے طالب ہوتے اور آپ ان کی صحیح

رہنمائی کرتے ہوئے ہمیشہ حق وصَواب کی راہوں سے آشنا کرتے اور سلامت رَوِی اختیار کرنے کی انھیں تاکید وتلقین فرماتے۔

(۱۲) آپ نے جادۂ حق واِعتدال سے مُنحرِف خیالات ونظریات اور باطل تحریکات وجَمعِیَّات سے اختلاف پر ہی اِکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی طور پر ان کی اِصلاح کی مخلصانہ کوشش کی اور نئے ماحول میں کام کرنے کے مُفید ومناسب طریقے بھی بتائے۔

(۱۳) خدمتِ قوم ومِلَّت کے لئے عملی طور پر ''جماعت رضائے مصطفیٰ'' (تشکیل در ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) قائم فرمائی جس نے مصالح ومفاداتِ اُمَّت ومِلَّت کی راہ میں متعدد محاذوں پر قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے۔

(۱۴) مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشی ہر محاذ پر آپ کی ہدایات سے قوم مستفید ہوئی۔

(۱۵) آپ کی حق گوئی و بے باکی اور تبلیغ وہدایت سے ایک عالَم متأثر ہوا۔ نہ جانے کتنے گم گشتگانِ راہ منزلِ مقصود تک پہنچے اور فلاح وسعادت سے ہم کنار ہوئے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی اور آپ کے ہم خیال وہم نوا عُلمائے اہلِ سُنَّت کے جذباتِ صادقہ وخدماتِ جلیلہ ومساعیِ جمیلہ کے مفید نتائج برآمد ہوئے اور ہنگامی وبُحرانی حالات کے تحت جن حضرات کے قدم شریعت کی راہ سے ڈگمگا گئے تھے، ان میں سے باتوفیق لوگوں کو رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے جُرم وخطا اور غفلت و تقصیر کی معافی اور اس کی بارگاہ میں توبہ واِستغفار کی سعادت حاصل ہوئی۔

چنانچہ مرکزی تحریکِ خلافت کے روحِ رواں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۴۴ھ/جنوری ۱۹۲۶ء) سے امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کی طویل مُراسلت ہوئی تھی اور آپ نے ان کی بعض لغزشوں کی نشان دِہی کر کے حسبِ حکمِ شرع ان سے توبہ و رُجوع کا مطالبہ فرمایا تھا جس کے بعد انھوں نے اپنا حسب ذیل توبہ نامہ شائع کیا:

''میں نے بہت گناہ دانستہ کیے اور بہت سے نادانستہ، سب سے توبہ کرتا ہوں۔

اے اللہ! میں نے جو اُمور قولاً وفعلاً وتحریراً وتقریراً بھی کیے۔ جن کو میں گناہ نہیں سمجھتا تھا، مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ان کو کفر یا ضلال یا معصیت ٹھہرایا۔ ان سب سے اور ان

کے مانند اُمور سے جن میں میرے مشائخ اور مرشدین سے میرے لئے کوئی قُدْوَہ نہیں ہے، محض مولوی صاحب موصوف پر اعتماد کر کے توبہ کرتا ہوں۔

اے اللہ! میری توبہ قبول کر۔ فقیر عبدالباری عُفی عنہ۔ (ص:۳۰۔ مطبوعہ ہمدم لکھنو، جمعہ ۱۱رمضان ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰رمئی ۱۹۲۱ء۔ وعلی گڑھ گزٹ۔ شمارہ ۲۴رجون ۱۹۲۱ء)

مولانا محمد جلال الدین قادری (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات، پنجاب، پاکستان) اپنی وقیع تاریخی کتاب (''محدّثِ اعظم پاکستان'' ازص:۱۰۵ تا ۱۰۷۔ جلدِ اول۔ مکتبہ قادریہ لاہور ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء) میں انجمن خُدَّامُ الحرمین لکھنؤ (تشکیل ۱۹۲۵ء) کی جانب سے منعقد ہونے والے نہایت اہم اِجتماع کے وقت کا ایک تاریخی واقعہ لکھتے ہیں کہ:

''اس سلسلے کا ایک واقعہ یوں ہے:

جب نجدیوں نے مدینہ منورہ پر بم باری کی تھی اور مقابر و مآثر کے اِنہدام کا سلسلہ شروع کیا تھا اس وقت لکھنؤ میں ''خُدَّامُ الحرمین'' کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس کے سربراہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء) علیہِ الرَّحمہ تھے۔

اس وقت مسلمانوں میں بہت زیادہ اضطراب و ہیجان تھا۔ حرمین شریفین کی حفاظت و صیانت کے لئے ایک بڑا اِجتماع لکھنؤ میں بلایا گیا۔ اس میں بریلی سے جماعت رضائے مصطفیٰ کا عُلما پر مشتمل وفد زیر قیادت حضرت حُجۃُ الاسلام (مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی) لکھنؤ پہنچا۔ وفد کے حضرات یہ تھے:

حضرت حُجۃُ الاسلام (مولانا حامد رضا قادری برکاتی بریلوی) حضرت مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا نوری بریلوی، حضرت مولانا سید محمد میاں مارہروی، حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور حضرت مولانا حشمت علی خاں لکھنوی، و دیگر عُلما و اراکین جماعتِ رضائے مصطفیٰ۔ بریلی۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے اپنے مالدار و رؤسا مُریدین و مُعتقِدین کے ہمراہ حضرت حُجۃُ الاسلام کے شاندار استقبال کا اِہتمام کیا۔ جب حُجۃ الاسلام ٹرین سے اُتر رہے تھے تو مولانا عبدالباری نے مصافحہ کی کوشش کی مگر آپ نے ہاتھ روک لیا اور مصافحہ نہ کیا۔ بلکہ فرمایا:

''مصافحہ ہوگا مگر پہلے وہ مسئلہ شرعی طریقے سے طے ہوجانا چاہیے جس کی وجہ سے ہماری اور آپ کی علیٰحدگی ہوئی ہے۔ مسئلہ کے طے ہونے تک آپ کے ہاں قیام نہ کروں گا۔ میرے ایک دوست یہاں پر ہیں، ان کے ہاں میرا قیام ہوگا۔''

یہ واقعہ ایک عظیم استقبال کے موقعہ پر ہوا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ناکام واپس آ گئے۔ ان کے لئے یہ صورتِ حال انتہائی ناگوار تھی۔

اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ تحریکِ خلافت اور تحریکِ تَرکِ موالات کے دور میں مولانا عبدالباری، ہندو لیڈر گاندھی سے بہت متأثر ہوئے۔ اسی دور میں ان سے کچھ ایسے کلمات و حَرکات صادر ہوئے جو ایک مسلمان کی شان کے خلاف تھے۔

امام احمد رضا نے اُنہیں توجہ دلائی کہ آپ ان کلمات سے توبہ کریں۔ دونوں حضرات کے درمیان مراسلت (اَلطّارِیُّ الدّارِی لِھَفَواتِ عبدِالبارِی کے نام سے مفتیِ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی نے اس مُراسلت کو مرتَّب کر دیا تھا جس کی اشاعت ۱۹۲۰ء۱۹۲۱ء ہی میں جماعت رضائے مصطفیٰ بریلی کی طرف سے ہوگئی تھی۔ مصباحی) جاری رہی مگر معاملہ طے نہ ہوسکا۔ اس بِنا پر عُلمائے اہلِ سنّت اُن سے خوش نہ تھے۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی ناگواری دیکھ کر حضرت صدرُ الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور مولانا عبدالقدیر بدایونی ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ:

مولانا! آپ کو ناگوار نہ ہو، اس میں ناراضی کی کوئی بات نہیں۔ چوں کہ امام احمد رضا کا شرعی فتویٰ آپ کے خلاف موجود ہے۔ آپ نے ان کے اِنتباہ کے باوجود اپنی غیر شرعی حرکات سے (بالکلیہ) رجوع نہیں کیا۔ اس لئے حضرت حُجۃُ الاسلام نے اس شرعی ذِمّہ داری کی بِنا پر، محض دین کی خاطر ایسا کیا ہے۔

اگر انہیں دُنیا رکھنی منظور ہوتی تو لکھنؤ میں آپ کی وجاہت اور آپ کے ساتھیوں کی کثرت کو دیکھ کر ضرور آپ سے مصافحہ فرما لیتے مگر انھوں نے اس کی قطعاً کوئی پروانہ کی بلکہ شرعی فتویٰ کا احترام کیا اور حکمِ شرعی پر علانیہ عمل کر کے دکھایا ہے۔

حضرت صدرُ الافاضل کی اس تقریر پُر تاثیر کا مولانا عبدالباری پر گہرا اَثر ہوا۔ انھوں نے اس سے متأثر ہو کر نہایت اِخلاص سے توبہ نامہ تحریر فرما دیا۔

جب یہ ''توبہ نامہ'' حضرت حجۃ الاسلام، حضرت مفتیِ اعظم اوران کے رُفقا کے پاس پہنچاتو اُن کی خوشی کی کوئی انتہانہ رہی۔سب کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چھلکنے لگے۔ادھر مولانا عبدالباری نے فوراً کاروں کا اِہتمام فرمایااور حجۃ الاسلام، مفتیِ اعظم اوران کے رُفقا کو نہایت محبت واحترام کے ساتھ اپنے دارُالعلوم میں لائے۔

اس موقعہ پرجب حضرت حُجۃ الاسلام اورمولانا عبدالباری کا آپس میں مصافحہ ومعانقہ ہواتو وہ منظرنہایت ہی پُرکیف، ایمان افروزاور قابلِ دید تھا۔

حضرت حُجۃ الاسلام کی اِستقامت علیٰ الشریعت، حضرت صدرالافاضل کی پُرخلوص مساعی اورمولانا عبدالباری کی لِلّٰہیت نے مل کرایک عجیب نورانی سماں باندھ دیا۔

بعدازاں مولانا عبدالباری کے زیرِ اہتمام محفلِ میلاد ہوئی۔حضرت حُجۃ الاسلام کے ہمراہ دارالعلوم منظرِ اسلام، بریلی کے طالبِ علم (جو بعد میں شیخ الحدیث بنے) مولانا محمد سردار احمد بھی تھے۔حضرت حُجۃ الاسلام کے ارشاد پرحضرت شیخ الحدیث نے مولانا عبدالباری کی خدمت میں فتاویٰ رضویہ کی جلدِ اوّل پیش کی، جسے مولانا عبدالباری نے نہایت مسرت و احترام کے ساتھ قبول کیا۔'' (ص ۷۔ہفت روزہ رضائے مصطفیٰ۔گوجرانوالہ، پنجاب، پاکستان۔شمارہ ۱۸/ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ۔ومکتوب مولانا تقدس علی بریلوی متوفی ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء بنام محمد جلال الدین قادری محرَّرہ یکم صفرالمظفر ۱۴۰۷ھ)

ابوالفیض مولانا محمد عبدالحفیظ حقّانی مفتیِ شاہی جامع مسجد آگرہ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء۔کراچی) لکھتے ہیں:

''میں خود فرنگی محل مدرسہ نظامیہ (لکھنؤ) کا ادنیٰ طالب علم ہوں۔حضرت مولانا عبدالباری (فرنگی محلی) رحمۃُ اللّٰہ علیہ سے خاص طور پر ''شرح چغمینی'' پڑھی ہے۔مگر زمانۂ (تحریکِ) خلافت میں کچھ باتیں ان سے سَرزد ہوگئیں جن پر اعلیٰ حضرت (مولانا احمدرضابریلوی) نے گرفت فرمائی۔آخرکاروصال سے کچھ پہلے خُدَّامُ الحرمین (لکھنؤ) کے جلسے میں عُلمائے بریلی شریک ہوئے۔اس وقت حُجۃ الاسلام مولانا حامدرضا خاں صاحب نے مولانا عبدالباری صاحب سے مصافحہ نہ کیا اوران کے یہاں قیام سے بھی اِنکار کردیااورفرمایا کہ:

اعلیٰ حضرت (مولانا احمدرضابریلوی) رحمۃُ اللّٰہ علیہ نے آپ پر جواعتراضات کیے ہیں، ان باتوں سے رُجوع کیجیے۔

چنانچہ صدرُالافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی رَحمۃُ اللّٰہ علیہ کی کوشش سے (مولانا عبدالباری نے) تحریر دی۔

اس کے بعدحضرت مولانا حامدرضاخاں صاحب رحمۃُ اللّٰہ علیہ، فرنگی محل (لکھنؤ) گئے۔دونوں میں مصافحہ ومعانقہ ہوا۔

حضرت مولانا حامدرضا نے حضرت مولانا عبدالباری کے ہاتھ چومے۔اس لئے کہ وہ صحابی کی اولاد ہیں۔اور وہیں قیام فرمایا۔

فقیراس موقع پرحاضرتھا۔اس خوشی میں دارُالشفاء (لکھنؤ) کی برفیاں آئیں۔باقاعدہ فاتحہ ہُوا اور تقسیم ہوئیں۔'' (ص: ۹۳و۹۴، شمع ہدایت، ازمفتی محمد عبدالحفیظ حقّانی، مطبوعہ کراچی)

اسی طرح علی برادران (مولانا محمد علی جوہر ومولانا شوکت علی) بھی جوتحریکِ خلافت وتَرکِ موالات کے نشہ میں چور تھے اوران کی زبان وقلم سے بہت سے ایسے اقوال وافعال سَرزد ہوچکے تھے جو شرعاً قابلِ مؤاخذہ تھے۔ان کی تنبیہ، اِتمامِ حجت اور خوفِ آخرت سے ہوشیار کرنے کے لئے حضرت امام احمدرضا قادری برکاتی بریلوی کے خلیفۂ ارشد صدرُالافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی قُدِّسَ سِرُّہٗ (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) مولانا جوہر مرحوم (متوفی ۱۹۳۱ء) کے سفرِ لندن سے پہلے ان کی قیام گاہ پر دہلی پہنچے اوران کو اسلامی احکام سے روشناس کراتے ہوئے آخرت کے عذاب وخُسران سے ڈرایا۔

مولانا جوہر، صدرُالافاضل مرادآبادی کی تبلیغِ حق سے متأثر ہوئے اوران کو گواہ بناکر توبہ کی۔ اور ان کے بھائی شوکت علی مرحوم (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بھی مرادآباد آکر صدرُالافاضل کے دستِ حق پرست پرتوبہ کی۔ (حیاتِ صدرالافاضل: مؤلّفہ مولانا غلام معین الدین نعیمی۔مطبوعہ لاہور)

ندوہ کے اجلاسِ بریلی کے موقعہ پر مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی جوندوہ کے سرگرم رُکن تھے اور بعد میں بھی اس سے ان کا کچھ تعلق رہا۔وہ حضرت امام احمدرضا قادری برکاتی بریلوی کے اِنتباہ پران کے نام یہ تحریر ۱۳۱۳ھ میں بھیجتے ہیں جو بشکلِ اشتہار اُسی سال چھپ

چکی ہے۔

''اِس میں شک نہیں کہ میں ندوہ کا حامی و رُکن ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنی دیانت و عقیدہ کو خراب کر ڈالا۔

مخدوما! میں تو آپ کا ہم خیال ہوں۔ کابِراً عَن کابِرٍ میں بلاتقیّہ پکار پکار کر کہوں گا کہ:

ندوۃ العُلماء کے الف لام سے مراد یہی عُلماے اہلِ سُنَّت ہونا چاہیے۔ نہ رَوافض و خَوارج و نیچریہ و وَہابیہ۔ خَذَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُوفکُون۔

آپ کا خادم محمد سلیمان قادری چشتی از پھلواری شریف، ۱۴؍شوال ۱۳۱۳ھ۔ (تحریر ختم شد)

حضرت مولانا مولوی سید شاہ ابوسلیمان محمد عبدالمنان قادری ابوالعلائی منعمی صدرُ المدرِّسین مدرسہ عربیہ محمدیہ عظیم آباد (بہار) حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مجھ فقیر کو بھی ۱۳۳۹ھ کے موسمِ بہار میں زیارت کا موقع ملا۔ یوں تو عرصۂ دراز سے آپ کے رسائلِ مُفیدہ و تحریراتِ اَنیقہ دیکھا کرتا تھا اور جُزئیاتِ فقہیہ پر اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) کو جو یدِ طولیٰ حاصل تھا، اس کا قائل بھی تھا اور درحقیقت انھیں رسائل و تحریرات نے زیارت کا ولولہ بھی اس فقیر کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔

بالآخر جب یہ فقیر درسِ نظامی کی تکمیل کر رہا تھا اور تعلیم کا آخری سال گذار رہا تھا تو برسوں کی تمنائے دِلی بر آئی۔ بریلی شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ طالب عالمانہ شان سے اعلیٰ حضرت (مولانا احمد رضا بریلوی) کے مدرسہ میں پہنچا۔ حضراتِ اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور دلی تمناؤں کے اظہار کا موقع ہاتھ آیا۔

اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو کہوں گا کہ جناب مولانا مولوی قاضی رحم الٰہی صاحب مدرسِ مدرسہ نے مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمتِ فیض درجت میں پہنچایا۔ اور میری پوری رہبری کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات اپنے پورے شباب پر تھی اور جماعتِ کثیرہ ان تحریکوں میں شامل تھی۔ بِناءً عَلَیہ یہ فقیر بھی شدت کے ساتھ ان تحریکات کا حامی تھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی تحریروں نے جو وقتاً فوقتاً مجھے مل جایا کرتی تھیں اور جناب مولانا سید سلیمان اشرف صاحب اور ابوالکلام (آزاد) کی باہمی گفتگو نے مجھے ان تحریکات سے

برگشتہ کر دیا تھا اور ایک قسم کی دل میں خلِش پیدا ہو گئی تھی جس نے بریلی شریف پہنچانے میں معاونت کی کہ اعلیٰ حضرت رَضِیَ اللّٰهُ تَعالیٰ عنهُ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو اور مسائلِ حاضرہ بھی سمجھ لوں۔

چنانچہ جیسا سُنا کرتا تھا اور تحریروں سے معلوم کرتا تھا کہ علمی تبحر میں آپ کا کوئی ثانی نہیں اور اخلاقِ نبویہ ﷺ کی ایک زندہ مثال ہیں۔ آپ کی زیارت نے بتمام و کمال فقیر پر یہ ثابت کر دیا کہ جو کچھ بھی آپ کی تعریفیں ہوئی ہیں وہ کم ہیں۔

اعلیٰ حضرت رَضِیَ اللّٰهُ تَعالیٰ عنهٗ کو جب معلوم ہوا کہ یہ فقیر سادات سے ہے تو آپ نے بڑی عزت بخشی اور جملہ شکوک کو چند منٹوں میں اس طرح رَفع فرما دیا۔ گویا کہ شکوک کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔

پھر اَخلاق کا یہ عالم کہ دو دن مجھے آپ کے اَخلاقِ کریمانہ نے روک رکھا اور ان دو دِنوں میں اس فقیر نے بہت کچھ فیوض و برکات حاصل کیے۔ پھر رخصت ہوتے وقت خاص کرم فرمایا کہ کچھ نقد روپے جو الہ آباد کی آمد و رفت میں صَرف ہو سکتے تھے بلکہ کچھ زائد ہی تھے، مَرحمت فرمائے۔ فقیر نے پہلے تو انکار کیا لیکن اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا کہ:

''یہ تو آپ کے گھر ہی کے عنایت کردہ ہیں۔ اسے لے لیجیے''۔

تو فقیر نے وہ رقم لے لی اور واپسی کے بعد ان تحریکات سے کُلّیۃً علٰیحدگی اختیار کر لی۔

پھر بعدِ وصالِ اعلیٰ حضرت رَضِیَ اللّٰهُ تَعالیٰ عنهُ چند مرتبہ عرسِ اعلیٰ حضرت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بعدِ وصال بھی اعلیٰ حضرت کی روحانیت نے اپنے فیوض و برکات سے محروم نہ رکھا۔

وَلِلّٰهِ الحَمدُ و الصَّلاۃُ و السَّلام علیٰ رسولِهِ الکریم۔ و اٰخرُ دَعوانا اَنِ الْحَمدُ لِلّٰهِ ربِّ العَالَمین۔

(ص، ۲۲۹ و ۲۳۰ حیاتِ اعلیٰ حضرت، حصہ اول۔ مطبوعہ رضا اکیڈمی بمبئی۔)

☆☆☆☆

تدبیرِ فلاح ونجات واِصلاح

ازامام احمدرضا قادری برکاتی بریلوی
(وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

نَحمدہٗ ونُصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

مسئلہ:۔ از کلکتہ، کولوٹولہ اسٹریٹ نمبر ۶۵۔ مسئولہ جناب حاجی منشی لعل خان صاحب۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۲ء)

قبلہ وکعبہ حضرت مُرشدی ومولائی دَامَ ظِلُّکُمُ العَالِی۔

تمنائے قدم بوسی کے بعد مؤدّبانہ گزارش۔

اَلــمُـؤیّــد کے پرچے برائے ملاحظہ مُرسَل ہیں۔ ارشاد ہو کہ آج کل مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور اِمدادِ تُرک کا کیا طریقہ ہو؟

الــجــواب: بملاحظہ مُکرّمی حامیِ سُنّت ماحیِ بدعت برادرِ طریقت حاجی لعل خان صاحب دَامَ مَجدُھُم۔ وعلیکمُ السَّلامُ ورحمۃُ اللّٰہ وبرکاتُہ۔

الـمُؤیّد کے چھ پرچے آئے۔ انہیں بالاستیعاب دیکھا۔ گمان یہ تھا کہ شاید کوئی خبر خوشی کی ہو مگر اس کے برعکس اس میں رنج وملال کی خبریں تھیں۔

بے گناہ مسلمانوں پر جو مظالم گذر رہے ہیں اور سلطنت اُن کی حمایت نہیں کرسکتی، صدمہ کے لئے کیا کم تھے کہ اس سے بھی بڑھ کر تُرکوں کی اس تازہ تبدیلِ رَوِش کا ذِکر تھا جس نے میرے خیال کی تصدیق کردی۔

اِنَّ اللّٰہَ لا یُغَیِّرُ مَابِقَوْمٍ حتیٰ یُغَیِّرُوا مَابِاَنْفُسِھِمْ ۔(القرآن الکریم۔سورۂ

رَعد ۱۳۔آیت ۱۱)

بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو گردش میں نہیں ڈالتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدل ڈالیں۔

اللّٰہ اَکرَمُ الاکرَمِین اپنے حبیبِ کریم صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے طفیل سے ہماری اور ہمارے اسلامی بھائیوں کی آنکھیں کھولے۔ اِصلاحِ قلوب و اَحوال فرمائے۔ خطاؤں سے درگذر کرے۔ غیب سے اپنی مدد اُتارے۔ اسلام و مسلمین کو غلبۂ قاہرہ دے۔ آمین اِلٰہَ الحَقِّ، آمین۔

وَحَسْبُنَااللّٰہُ ونِعْمَ الوَکِیل۔ ولاحَولَ ولاقُوَّۃَ اِلاّبِاللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیم۔

مگر بے دِلی نہ چاہیے۔

وَلاتَایْئَسُوامِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِنَّہٗ لایَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّاالْقَوْمُ الْکٰفِرُونَ۔(القرآن الکریم۔سورۂ یوسف ۱۲۔آیت ۸۷)

اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بے شک اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ (ت)

اللہ واحد قہّار غالب علیٰ کُلِّ غالب اس دین کا حافظ وناصر ہے۔

وَکَانَ حَقًّاعَلَیْنَانَصْرُ الْمُؤمِنِین (القرآن الکریم۔سورۂ روم۔آیت ۴۷)

وَاَنتُمُ الاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِین۔(القرآن الکریم۔سورۂ آلِ عمران۔آیت ۱۳۹)

اور ہمارے ذِمّۂ کرم پر ہے مسلمانوں کی مدد فرمانا۔

تمہیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔

حضور سیدنا سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لایَزَالُ طائِفۃٌمن اُمَّتِی ظاھِرِین عَلیٰ الحَق لایَضُرُّھُم مَنْ خَذَلَھُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَھُم حَتّٰی یأتِی اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ عَلیٰ ذٰلِکَ غالِباً۔(کتاب المناقب، صحیح البخاری)

میری اُمّت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا۔ ان کی مخالفت اور رُسوائی چاہنے اور کوشش کرنے والا ان کو ضرر نہ پہنچا سکے گا۔ حتیٰ کہ وہ گروہ اس کا حکم آنے تک اس پر غالب رہے گا۔

یہاں اَمرُ اللّٰہ وہ وعدۂ صادقہ ہے جس میں سلطانِ اسلام شہید ہوں گے اور رُوئے

زمین پر اسلامی سلطنت کا نام نہ رہے گا۔ تمام دنیا میں نصاریٰ کی سلطنت ہوگی۔

اگر معاذَ اللّٰہ وہ وقت آ گیا ہے جب تو کوئی چارۂ کار نہیں۔ شُدنی ہو کر رہے گی۔ مگر وہ چند ہی روز کے واسطے ہے۔ اس کے متصل ہی حضرت امام کا ظہور ہوگا، پھر سیدنا روحُ اللّٰہ **عیسیٰ مَسِیح علیہِ الصَّلوٰۃُ والسَّلامُ** نزولِ اجلال فرمائیں گے اور کفر تمام دنیا سے کافور ہوگا۔ تمام روئے زمین پر مِلّت ایک مِلّتِ اسلام ہوگی اور مذہب ایک مذہبِ اہلِ سُنّت۔

غیب کا علم **اللّٰہ عَزَّ وجَلَّ** کو ہے۔ پھر اس کی عطا سے اس کے حبیب **صَلّی اللّٰہُ تَعالیٰ علیہ وسَلّم** کو۔

فقیر جہاں تک نظر کرتا ہے، ابھی اِن شاءَ اللّٰہُ وہ وقت نہیں آیا۔ اگر ایسا ہے تو ضرور نُصرتِ اِلٰہیہ نُزول فرمائے گی اور کُفّارِ مَلاعِنہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔

بہر حال! بندگی، بیچارگی، دُعا کے سِوا کیا چارہ ہے؟ وہی جو ہمارا رب ہے، ہماری حالتِ زار پر رحم فرمائے اور اپنی نُصرت اتارے۔ یعنی جھٹکے جو پہنچ گئے ہیں انہیں پر **زُلْزِلُوا زِلْزَالاً شَدِیداً** (القرآن الکریم. ۳۳/ ۱۱) (خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے۔ ت) کو ختم فرماوے۔ اور **اَلاَ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ** (سُن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے) کی بشارت سُنادے۔ حَسْبُنااللّٰہُ ونِعْمَ الوَکِیل۔

آپ پوچھتے ہیں؟ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟، اس کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں؟

اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ نے تو مسلمانوں کے جان ومال، جنت کے عوض خریدے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَریٰ مِنَ الْمُؤْمِنِینَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃُ۔ (القرآن الکریم۔ ۹/ ۱۱۱)

بے شک! اللہ نے مسلمانوں کی جان اور مال خرید لیے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔

مگر ہم ہیں کہ مبیع دینے سے انکار اور ثمن کے خواستگار۔

ہندی مسلمانوں میں یہ طاقت کہاں کہ وطن ومال واہل وعیال چھوڑ کر ہزاروں کوس دور جائیں اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں؟ مگر مال تو دے سکتے ہیں۔ اس کی حالت بھی سب آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

وہاں مسلمانوں پر یہ کچھ گزر رہی ہے یہاں وہی جلسے ہیں۔ وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی اُمنگ، وہی تماشے، وہی بازیاں، وہی غفلتیں، وہی فضول خرچیاں۔ ایک بات کی بھی کمی نہیں۔

ابھی ایک شخص نے ایک دنیاوی خوشی کے نام سے پچاس ہزار دیئے۔ ایک عورت نے ایک چُنیں وچُناں جرگہ کو پچیس ہزار دیئے۔ ایک رئیس نے ایک کالج کو ڈیڑھ لاکھ دیئے۔ اور یونیورسٹی کے لئے تو تیس لاکھ سے زائد جمع ہوگیا۔ ایک رات میں ہمارے اس مُفلس شہر سے اس کے لئے چھبیس ہزار کا چندہ ہوا۔ بمبئی میں ایک کم درجے کے شخص نے صرف ایک کوٹھری چھبیس ہزار روپے کی خریدی، فقط اس لئے کہ اس کے وسیع مکانِ سُکونت سے ملحق تھی۔

اور مظلوم اسلام کی مدد کے لئے جو کچھ جوش دکھائے جارہے ہیں، آسمان سے بھی اونچے ہیں۔ اور جو اصلی کارروائی ہورہی ہے، زمین کی تہ میں ہے۔ پھر کس بات کی امید کی جائے؟

بڑی ہمدردی یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو۔

اوّل تو یہ بھی کہنے ہی کے الفاظ ہیں۔ نہ اس پر اتفاق کریں گے نہ ہرگز اس کو نباہیں گے۔

اس عہد کے پہلے توڑنے والے جَنٹْل مَین حضرات ہی ہوں گے۔ جن کی گزر بغیر یورپین اَشیا کے نہیں۔ یہ تو سارا یورپ ہے۔ پہلے صرف اٹلی کا بائیکاٹ ہوا تھا۔ اِس پر کتنوں نے عمل کیا اور کتنے دن نباہا؟ پھر اس سے یورپ کو ضَرر بھی کتنا؟ اور ہو بھی تو کیا فائدہ کہ وہ سَوتر کیبوں سے اس سے دَہ گنا ضَرر پہنچا سکتے ہیں۔

لِھٰذا ضَرر رَسانی کا ارادہ صرف وہی مثل ہے کہ: کمزور اور پٹنے کی نشانی۔

بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت رَوِی پر قائم رہیں۔ کسی شریر قوم کی چال نہ سیکھیں۔ اپنے اوپر مُفت کی بدگمانی کا موقع نہ دیں۔

ہاں! اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو اِن لڑائیوں ہی پر کیا موقوف تھا؟ ویسے ہی چاہیے تھا کہ:

اَوَّلاً: باستثنا اُن مَعدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصل کرتے۔

یہ کروڑوں روپے جو اِسٹامپ ووکالت میں گُھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ ہوگئے اور ہوئے جاتے ہیں، محفوظ رہتے۔

ثانیاً: اپنی قوم کے سِوا کسی سے کچھ نہ خریدتے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حِرفت وتجارت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے۔

یہ نہ ہوتا کہ یورپ وامریکہ والے چھٹا نک بھر تانبا کچھ صنّاعی کی گڑھنت کرکے گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اوراس کے بدلے پاؤ بھر چاندی آپ سے لے جائیں۔

ثالثاً: بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تونگر مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لئے بنک کھولتے۔

سُود، شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے، مگر اور سو (۱۰۰) طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں جن کا بیان کتبِ فقہ میں مفصّل ہے۔ اوراس کا ایک نہایت آسان طریقہ کتاب **کِفلُ الفَقِیهِ الفَاهِم** میں چھپ چکا ہے۔

ان جائز طریقوں پر بھی نفع لیتے کہ انہیں بھی فائدہ پہنچتا اوران کے بھائیوں کی بھی حاجت بَر آتی۔ اورآئے دن جو مسلمانوں کی جائیدادیں بَنیوں کی نذر ہوئی چلی جاتی ہیں ان سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر بَنیوں کی جائداد ہی لی جاتی مسلمان ہی کے پاس رہتی۔ یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بَنیئے چنگے۔

رابعاً: سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصلِ اعظم وہ دینِ متین تھا جس کی رَسّی مضبوط تھامنے نے اگلوں کو ان مدارجِ عالیہ پر پہنچایا۔ چار دانگِ عالم میں ان کی ہیبت کا سِکّہ بٹھایا۔ نانِ شبینہ کے محتاجوں کو بلند تاجوں کا مالک بنایا۔ اوراسی کے چھوڑنے نے پچھلوں کو یوں چاہِ ذِلّت میں گرایا۔ **فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون — وَلا حَولَ وَلا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیم**۔

دینِ متین، علمِ دین کے دامن سے وابستہ ہے۔ علمِ دین سیکھنا پھر اس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہاں کی زندگی چاہتے، وہ انہیں بتادیتا۔

اندھو! جسے ترقی سمجھ رہے ہو، سخت تنزلی ہے۔ جسے عزت جانتے ہو، اَشد ذِلّت ہے۔

مسلمان اگر یہ چار (۴) باتیں اختیار کرلیں تو **اِن شَاءَ اللّٰہُ العَزِیز** آج ان کی حالت سنبھل جاتی ہے۔

آپ کے سوال کا جواب تو یہ ہے۔ مگر یہ فرمایئے کہ سوال وجواب سے حاصل کیا؟

جب کوئی اس پر عمل کرنے والا نہ ہو؟

عمل کی حالت ملاحظہ ہو:

اوّل: پر یہ عمل ہے کہ گھر کے فیصلہ میں اپنے دعویٰ سے کچھ بھی کمی ہو تو منظور نہیں۔
اور کچہری جاکر اگرچہ گھر کی بھی جائے، ٹھنڈے دل سے پسند۔

گرہ گرہ بھر زمین پر طرفین سے دو دو ہزار بگڑ جاتے ہیں۔ کیا آپ اِن حالتوں کو بدل سکتے ہیں؟ **فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُون** (تو کیا تم باز آئے؟ ت)

دوم: کی یہ کیفیت کہ اوّل تو خاندانی لوگ حِرفت وتجارت کو عیب سمجھتے ہیں اور ذِلّت کی نوکریاں کرنے، ٹھوکریں کھانے، حرام کام کرنے، حرام مال کھانے کو فخر وعزّت۔

اور جو تجارت کریں بھی تو خریداروں کو اتنی حِس نہیں کہ اپنی ہی قوم سے خریدیں اگرچہ پیسہ زائد سہی کہ نفع ہے تو اپنے ہی بھائی کا ہے۔

اہلِ یورپ کو دیکھا ہے کہ دیسی مال اگرچہ ولایتی کی مثل اوراس سے اَرزاں بھی ہو، ہرگز نہ لیں گے۔ اور ولایتی گراں خریدلیں گے۔

ادھر بیچنے والوں کی یہ حالت کہ ہندو آنہ روپیہ نفع لے۔ مسلمان صاحب چوَنی سے کم پر راضی نہیں۔ اور پھر لطف یہ کہ مال بھی اس سے ہلکا بلکہ خراب۔

ہندو تجارت کے اصول جانتا ہے کہ جتنا تھوڑا نفع رکھے اتنا ہی زیادہ ملتا ہے۔ اور مسلمان صاحب چاہتے ہیں کہ سارا نفع ایک ہی خریدار سے وصول کرلیں۔

ناچار خریدنے والے مجبور ہوکر ہندو سے خریدتے ہیں۔ کیا تم یہ عادتیں چھوڑ سکتے ہو؟
فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُونَ۔ (تو کیا تم باز آئے؟ ت)

سوم: کی یہ حالت کہ اکثر اُمَرا کو اپنے ناجائز عیش سے کام ہے۔ ناچ رنگ وغیرہ بے حیائی یا بیہودگی کے کاموں میں ہزاروں لاکھوں اُڑادیں۔ وہ ناموری ہے، ریاست ہے۔ اور مَرتے بھائی کی جان بچانے کو ایک خفیف رقم دینا ناگوار۔

اور جنہوں نے بَنیوں سے سیکھ کر لین دین شروع کیا وہ جائز نفع کی طرف توجہ کیوں کریں؟ دین سے کیا کام؟ اللہ ورسول کے اَحکام سے کیا غرض؟

خَتنہ نے انہیں مسلمان کیا اور گائے کے گوشت نے مسلمانی قائم رکھی۔ اس سے زائد

کیا ضرورت ہے؟

نہ انہیں مَرنا ہے، نہ اللہ وَحدَہٗ قہّار کے حضور جانا، نہ اَعمال کا حساب دینا ہے۔ **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیہِ رَاجِعُون۔**

پھر سُود بھی لیں تو بَنیا اگر بارہ آنے مانگے، یہ ڈیڑھ دو سے کم پر راضی نہ ہوں۔ ناچار حاجت مند بَنیوں کے ہَتھّے چڑھتے ہیں اور جائدادیں ان کی نذر کر بیٹھتے ہیں۔

چہارم: کا حال ناگفتہ بہ ہے کہ اِنٹر پاس کو رَزّاقِ مُطلق سمجھا گیا ہے۔

وہاں نوکری میں عمر کی شرط، پاس کی شرط، پھر پڑھائی وہ مفید کہ عمر بھر کام نہ آئے، نہ اس نوکری میں اس کی حاجت پڑے۔

اپنی ابتدائی عمر کہ وہی تعلیم کا زمانہ ہے، یوں گنوائی۔ اب پاس ہونے میں جھگڑا ہے۔ تین تین بار فیل ہوتے ہیں اور پھر لپٹے چلے جاتے ہیں۔ اور قسمت کی خوبی کہ مسلمان ہی اکثر فیل کیے جاتے ہیں۔

پھر تقدیر سے پاس بھی مل گیا تو اَب نوکری کا پتا نہیں اور ملی بھی تو صریح ذِلّت کی۔ اور رفتہ رفتہ دُنیوی عزت کی پائی تو وہ کہ عندَ الشرع ہزار ذِلّت۔

کہیے پھر علمِ دین سیکھنے اور دین حاصل کرنے اور نیک و بد میں تمیز کرنے کا کون سا وقت آئے گا؟ لاجَرم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دین کو مضحکہ سمجھتے ہیں۔ اپنے باپ دادا کو جنگلی، وحشی، بے تمیز، گنوار، نالائق، بیہودہ، احمق، بے خود جاننے لگتے ہیں۔

بفَرضِ غلط اگر یہ ترقی بھی ہوئی تو نہ ہونے سے کروڑ درجے بدتر ہوئی۔

کیا تم علمِ دین کی برکتیں ترک کروگے؟ **فَھَلْ اَنْتُمْ مُنْتَھُونَ۔** (تو کیا تم باز آئے؟ ت)

یہ وُجُوہ ہیں۔ یہ اَسباب ہیں۔ مَرض کا علاج چاہنا اور سبب کا قائم رکھنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟ اس نے تمہیں ذلیل کردیا، اس نے غیر قوموں کو تم پر ہنسوایا، اس نے، اس نے، اس نے، جو کچھ کیا وہ اس نے۔

اور آنکھوں کے اندھے اب تک اس اوندھی ترقی کا رونا روئے جاتے ہیں۔ ہائے قوم، وائے قوم۔ یعنی ہم تو اسلام کی رَسّی گردن سے نکال کر آزاد ہوگئے، تم کیوں قُلّی بنے ہوئے ہو؟ حالاں کہ حقیقۃً یہ آزادی ہی سخت ذِلّت کی قید ہے جس کی زندہ مثال یہ تُرکوں کا تازہ

واقعہ ہے۔ **ولاحولَ ولاقُوَّۃَ اِلَّا باللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیم۔**

اہلُ الرائے اِن وُجُوہ پر نظر فرمائیں۔ اگر میرا خیال صحیح ہو تو ہر شہر وقصبہ میں جلسے کریں اور مسلمانوں کو ان چار باتوں پر قائم کردیں۔ پھر آپ کی حالت خوبی کی طرف نہ بدلے تو شکایت کیجیے۔

یہ خیال نہ کیجیے کہ ایک ہمارے کیے کیا ہوتا ہے؟ ہر ایک نے یوں ہی سمجھا تو کوئی کچھ نہ کرے گا۔ بلکہ ہر شخص یہی تصور کرے کہ مجھی کو کرنا ہے۔ یوں **اِن شاءَ اللّٰہُ تعالیٰ** سب کرلیں گے۔ چند جگہ جاری تو کیجیے پھر خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ خدا نے چاہا تو عام بھی ہو جائے گا۔ اُس وقت آپ کو اس کی برکات نظر آئیں گی۔

وہی آیۂ کریمہ کہ اِبتدائے سخن میں تلاوت ہوئی۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ۔ الآیۃ۔** جس طرح بُرے رَوَیَّہ کی طرف اپنی حالت بدلنے پر تازیانہ ہے، یوں ہی نیک رَوِش کی طرف تبدیلی پر بشارت ہے کہ:

اپنے کرتب چھوڑوگے تو ہم تمہاری اس رَدِی حالت کو بدل دیں گے۔ ذِلّت کے بدلے عِزّت دیں گے۔

اے رب ہمارے! ہماری آنکھیں کھول اور اپنے پسندیدہ راستہ پر چلا۔ صدقہ رسولوں کے سورج، مدینہ کے چاند کا۔

صَلّی اللّٰہُ تعالیٰ علیہِ وعَلیٰ آلِہٖ وصَحْبِہٖ وبارک وسَلّم، آمین!

خیر! یہ مرثیہ تو عمر بھر کا ہے۔ مسلمان ان چار باتوں سے ایک کو بھی اختیار کرتے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر ضرورتِ امدادِ تُرک کی نسبت کہیے؟

مرثیے ہزاروں پڑھے گئے۔ مگر سوا بعض غُرَبا کے اُمَرَا اور رُؤَسا بلکہ دنیا بھر کے والیانِ ملک نے بھی کوئی قابلِ قدر حصہ لیا؟

وہ جو فوجی مدد دے سکتے تھے۔ وہ جو لاکھوں پونڈ بھیج سکتے تھے۔ وہ ہیں اور بے پَروائی۔ گویا انہوں نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

انہیں جانے دیجیے، وہ جانیں اور ان کی مصلحت۔

آپ بیتی کہیے؟ کتنا چندہ ہُوا ہے جس پر ہمدردیِ اسلام کا دعویٰ ہے؟ مَصارِفِ جنگ کچھ ایسے ہلکے ہیں؟ جتنا چندہ جا چکا ہے، ایک دن کی لڑائی میں اس سے زیادہ اُڑ جاتا ہے۔

اب بھی اگر تمام ہندوستان کے جُملہ مسلمان، امیر فقیر، غریب رئیس اپنے سچے ایمان سے ہر شخص اپنے ایک مہینہ کی آمدنی دے دے تو گیارہ مہینہ کی آمدنی میں بارہ مہینے گذر کر لینا کچھ دشوار نہ ہو۔ اور اللہ عزوجل چاہے تو لاکھوں پونڈ جمع ہو جائیں............ الیٰ آخرِہٖ۔

وَحَسْبُنا اللّٰهُ ونِعْمَ الوَكِيل—ولاحَولَ ولاقوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ العَلِيّ العَظِيم۔

واللّٰهُ تَعالىٰ اَعْلَمُ وعِلْمُهٗ جَلَّ مَجْدُهٗ اَتَمُّ وَاَحْكَمُ۔

كتبهٗ: عبدُهٗ المُذْنِب احمدرضا البريلوی عفی عنه بمحمدٍ النَّبِيّ الاُمِّی صَلّی اللّٰهُ تعالىٰ عليهِ وسَلّم۔

مہر دارُالافتا مدرسہ اہلِ سُنَّت و جماعت، بریلی۔

تصحیح کردہ: اعجاز الرضوی، از کاظمی مقیم دربار داتا صاحب (لاہور)

صَحَّ الجَواب۔ واللّٰهُ تعالىٰ اَعْلَمُ ۔محمد رضاالقادری عفی عنه، (بریلی)

الجَواب صحيحٌ: فقير حسين احمد العاشقی النَّهوارِی عَفَا عنهُ المَولىٰ القَوِیُّ۔

اَصابَ المُجِيبُ ۔جَزَاهُ اللّٰهُ جَزَاءً وَّيُثِيب (مُجیب نے جواب درست دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجیب کو جزا و ثواب عطا فرمائے۔) فقير مصطفى رضا القادری النُّورِی غَفِرلَهٗ ولِوَالِدَيهِ۔

صَحَّ الجَوابُ ۔واللّٰهُ تعالىٰ اَعلم بِالصَّوَاب (جواب صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے۔) فقير اَمجد عَلى الْاَعْظَمِی الرّضوِی عفی عنهٗ۔

وانا علىٰ ذٰلِک مِنَ الشَّاهِدِين (اور میں اس حوالے کے صحیح ہونے پر گواہ ہوں۔) فقیر نواب مرزا رضوی بریلوی عَفَا عنهُ المَولىٰ القَوِیُّ۔

(رسالہ ''تدبیرِ فلاح ونجات و اصلاح''۔ (۱۳۳۱ھ) از امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی۔ مطبوعہ بریلی و لاہور و بمبئی۔ و مشمولہ فتاویٰ رضویہ، جلد ۱۵۔ ص: ۱۴۱ تا ص: ۱۴۸۔ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

☆☆☆☆

تحریکِ آزادیِ ہند اور عُلمائے اہلِ سُنَّت

عُلمائے اہلِ سُنَّت کی فِکری و سیاسی بصیرت و قیادت اور مِلّی و اِجتماعی خدمت کا کچھ ذِکر و بیان ''عُلمائے اہلِ سُنَّت کی بصیرت و قیادت'' میں قارئینِ کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء اور عُلمائے اہلِ سُنَّت کے بارے میں مزید تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی اور انقلاب ۱۸۵۷ء (۲) ممتاز عُلمائے انقلاب ۱۸۵۷ء (۳) ۱۸۵۷ء! پس منظر و پیش منظر۔ بقلم یٰسٓ اختر مصباحی۔ دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵۔

راقمِ سطور (یٰسٓ اختر مصباحی) کی ایک زیرِ تدوین کتاب ''صدرُالافاضل مرادآبادی! اَحوال و آثار'' جلد ہی اِن شاءَ اللّٰہ منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ جس میں تحریکِ آزادی (۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۷ء) کا اِجمالی ذکر ایک نئے پہلو سے شاملِ کتاب ہے۔

صدرُ الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مرادآبادی بانیِ جامعہ نعیمیہ مرادآباد (وصال ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) کی دینی و علمی اور صحافتی و سیاسی خدمات نیز آپ کے مقتدر اساتذہ و شیوخ و معاصر عُلمائے کرام اور خُلَفا و تلامذہ پر اس کتاب میں خاطر خواہ معلومات و مَواد کا ذخیرہ جمع کیا جا رہا ہے۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۷ء تک صدرُالافاضل مرادآبادی اور آپ کے معاصر عُلما و مشائخِ کرام کی سرگرم مَساعی اور مسلمانانِ ہند کی فکری و سیاسی قیادت کا قابلِ افتخار تذکرہ بھی اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس طرح اس کتاب کے ذریعہ قارئین کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہو جائے گا کہ آزادیِ ہند کی ہنگامہ خیز تحریک میں عُلمائے اہلِ سُنَّت کے قائدانہ کردار بالخصوص حضرت صدرُالافاضل مرادآبادی کی تحریکی و تنظیمی و صحافتی و فکری صلاحیت اور آپ کی نمایاں سرگرمی و کارکردگی نے مسلمانانِ ہند کے مفادات و مصالح کے مطابق اس بُحرانی دور میں ان کی بالکل صحیح اور بروقت قیادت و رہنمائی کا عظیمُ الشان فریضہ انجام دیا۔ فَالحَمدُ لِلّٰهِ عَلىٰ ذالِک۔

قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بَنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا، سَدا، ایک ہی شخص

یٰسٓ اختر مصباحی۔ دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی

سَوادِ اعظم ومَسالِک وسَلاسِلِ این وآں، نیست مَحلِّ چُنیں وچُناں

سَوادِ اَعظم اہلِ سُنَّت وجماعت کے فِقہی مذاہبِ اَربعہ (حَنَفیت وشافعیت ومالکیت وحَنبلیت) اورجُملہ طُرُق وسَلاسِلِ تصوف، مثل قادریہ وچشتیہ ونَقشبندیہ وسُہر وَردِیہ ورِفاعیہ وشاذلیہ اوران سے وابستہ جُملہ قدیم وجدید عُلما وفُقَہا وفُضَلا وصوفیہ ومشائخِ کرام ودَاعیانِ اسلام جومذہبِ سَوادِ اعظم اہلِ سُنَّت وجماعت پر اِستقامت کے ساتھ حِمایت وتائیدِ اسلام وخدمتِ دینِ حنیف ونَشر واشاعت وترویجِ مذہب ومسلک ومشرب کے کسی بھی شعبہ سے وابستہ اورکسی بھی خِطہ وعلاقہ میں اِخلاص ودیانت کے ساتھ مصالح ومفاداتِ مِلَّت وجماعتِ حق واھلِ حق ونُصرت واِعانتِ سَوادِ اعظم میں سرگرم تھے اوران کے اَخلاف آج بھی سرگرم ہیں۔ان سب کے ساتھ حُسنِ ظن، ان سب کی تشجیع وتحسین، ان سب کی ممکن نُصرت وحمایت واِعانت واِمداد، اوران سب کے حق میں جذبۂ خیراوران کاذکرِ خیر، سَوادِاَعظم کے ہرفَرد پرحسبِ صلاحیت ووُسعت واِستطاعت، نہایت اہم مذھبی ومِلّی فریضہ، اِنفرادی واِجتماعی شعوروإحساس کی واضح علامت، اوردینی ودُنیوی فَوزوفَلاح وسعادت ونجات کی بہترین ضمانت ہے۔

بَرِصغیر ہندوپاک کے قادری برکاتی، چشتی اشرفی، برکاتی رضوی اوران کی شاخوں سے منسلِک اہلِ سُنَّت وجماعت اپنے اَکابر واسلاف کے ارشادات، ان کی ھِدایات اوراِس روحانی وقلبی یگانگت کوخصوصیت کے ساتھ ہرلمحہ یادرکھیں کہ:

شمسُ العارفین سیدشاہ آلِ احمداچھے میاں قادری برکاتی مارَہروی (وصال ربیعُ الاول ۱۲۳۵ھ)قُدِّسَ سِرُّہٗ نے

اپنے خلیفۂ ارشدحضرت مولاناشاہ عینُ الحق عبدالمجیدقادری برکاتی بدایونی (وصال محرم الحرام۱۲۶۳ھ)قُدِّسَ سِرُّہٗ کے بارے میں ارشادفرمایاکہ:

''حضرت نظام الدین اولیامحبوبِ الٰہی قُدِّسَ سِرُّہٗ نے فرمایاتھاکہ:

خداوندتعالیٰ نے اگرقیامت کے دن مجھ سے پوچھاکہ:

نظام الدین! میرے لئے دنیا سے کیالایاہے؟ تومیں اس اَوَدِھی نوجوان نصیرالدین محمود(چراغ دہلی) کوپیش کردوں گا۔''

اسی طرح آلِ احمد سے بروزِقیامت اگرسوال ہُواتو:

مولوی عبدالمجید بدایونی کوپیش کردوں گا۔''

خاتمُ الاکابرسیدشاہ آلِ رسول قادری برکاتی مارَہروی (وصال ذوالحجہ ۱۲۹۶ھ) قُدِّسَ سِرُّہٗ نے:

مُحِبِّ الرَّسول تاجُ الفُحول مولاناعبدالقادرعثمانی قادری برکاتی بدایونی (وصال ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) قُدِّسَ سِرُّہٗ فرزندوخلیفۂ سیفُ اللہِ المسلول علاّمہ فضلِ رسول عثمانی قادری بدایونی (وصال۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)قُدِّسَ سِرُّہٗ کے بارے میں

اپنے عارف بِاللہ پوتے سیدشاہ ابوالحسین احمدنوری مارَہروی (وصال ۱۱/رجب ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء)قُدِّسَ سِرُّہٗ سےارشادفرمایا:

برخوردارمولوی عبدالقادرکاعلم تازہ اورحاضرہے۔ان کی دیانت اورتَقویٰ پرپوراپورا اِطمینان ہے۔

تم مسائلِ فقہ وکلام اورعلومِ ظاہرمیں ان سےمشورہ کرلیاکرو۔''

نیزحضرت خاتمُ الاکابرمارَہروی نے اپنے دومشاہیرخُلَفاےِ کرام

فقیہِ اسلام اِمامِ اہلِ سُنَّت مولانااحمدرضا قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء)قُدِّسَ سِرُّہٗ فرزندِگرامی حضرت مولانانقی علی قادری برکاتی بریلوی (وصال ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء)قُدِّسَ سِرُّہٗ

کے بارے میں ارشادفرمایاکہ:

''اگرخدائے بزرگ وبرترمجھ سے قیامت کے روزسوال فرمائے گاکہ:

اےآلِ رسول! میرے لئے کیالائے ہو؟

تومولوی احمدرضاکوپیش کردوں گا۔''

شیخُ المشائخ حضرت سیدشاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (وصال ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء)

قُدِّسَ سِرُّہٗ

خاتم الاکابر سید شاہ آلِ رسول احمدی مارَہروی قُدِّسَ سِرُّہٗ کے خاتم الخُلَفا تھے۔

حضرت خاتم الخُلَفا کا یہ ایمان افروز وگراں قدر ارشاد وفرمانِ ھدایت نشان ہے کہ:

’’فقیر کو حضرت مولانا سید شاہ آلِ رسول مارَہروی قُدِّسَ سِرُّہٗ سے شرفِ خلافت حاصل ہے اور مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی بھی ان کے دربار سے فیض یاب ہیں۔

فقیر اور وہ اس رشتے سے پیر بھائی ہوئے۔ میرا مُرید اُن کا مُرید ہے اور اُن کا مُرید فقیر کا مُرید ہے۔ جو اِس کے خلاف ہے، فقیر اُس سے بَری ہے۔‘‘

گویا حسبِ ارشادِ خاتم الخُلَفا شیخُ المشائخ حضرت اشرفی میاں کچھوچھوی قُدِّسَ سِرُّہٗ:

سلسلہ ایک ہے ہم عشق کے دیوانوں کا
قد وگیسو سے چلے دار ورَسَن تک پہنچے

یٰسٓ اختر مصباحی۔ بانی وصدر دارُالقلم، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

☆☆☆☆

سَوادِ اعظم اور سلسلۂ ولی اللّٰہی عَزیزی

مُتَّحِدہ ہندوستان کے طبقۂ عُلما میں اِمامُ المحدِّثین مُحقِّق علی الْاِطلاق، عاشقِ رسول، شیخُ الھند شاہ عبدالحق مُحدِّث دہلوی (وصال ۱۰۵۲ھ) کا نام سرِ فہرست ہے۔ آپ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ علمِ حدیث میں کمالِ مہارت کے ساتھ اس کی نشر واشاعت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف کا سب سے زیادہ منظّم ومسلسل اور باضابطہ خدمتِ علمِ حدیث کا سرزمینِ ہند میں اولین اِعزاز حاصل ہوا۔

اسی خدمتِ علمِ حدیث کی دوسری کڑی کا نام شاہ ولی اللہ مُحدِّث دہلوی (وصال ۱۱۷۶ھ) ہے جن کے قابلِ اِفتخار فرزند سراجُ الھند شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (وصال ۱۲۳۹ھ) نے ساٹھ (۶۰) سال تک دہلی میں بیٹھ کر درسِ حدیث دیا اور متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے اور چپے چپے کو علمِ حدیث کی شمعِ فروزاں سے روشن ومنوّر کر دیا۔

دہلی کے ساتھ اَوَدھ کا خانوادۂ فرنگی محل بھی دو ڈھائی صدی تک علم وفضل کا نمایاں ترین مرکز رہا ہے۔ دہلی میں منقولات اور اَوَدھ میں معقولات کا سِکّہ ہندوستان بھر میں اسی خانوادۂ ولی اللّٰہی عزیزی وخانوادۂ فرنگی محل کا جاری تھا۔ اور دونوں خانوادوں کو دینی وعلمی سطح پر سَوادِ اعظم اہلِ سُنَّت وجماعت کی قیادت ورہنمائی کا اِعزاز حاصل تھا۔

موجودہ ہندوپاک وبنگلہ دیش کے تقریباً سبھی دینی وعلمی خانوادے اور مدارس ومراکز، دہلی واَوَدھ کے انھیں دونوں منقولی ومعقولی سلسلوں سے وابستہ ہیں۔

’’سَوادِ اعظم اور سلسلۂ ولی اللّٰہی عزیزی‘‘ اسی تعارف وتذکرہ پر مشتمل ہے جو اِن دینی وعلمی سلاسل سے تعلق رکھنے والے اہلِ ذوق کے لئے خصوصاً اور دیگر حضرات کے لئے عموماً قابلِ مطالعہ ہے۔ کتاب کے صفحات تقریباً پانچ سو ہیں۔

یٰسٓ اختر مصباحی۔ بانی وصدر دارُالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

شاہ راہِ سَوادِ اعظم

سَوادِ اعظم کے نظریاتی وشخصیاتی تَوارُث وتَسلسُل کا ایک اِجمالی خاکہ

صَلُّوا عَلَی النَّبِیِّ الحَبِیبِ المُختار (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وعَلٰی آلِہٖ وصَحبِہٖ وسَلَّم)

☆☆☆

کلمۃ المجلس

حافظ محمد شمس الحق رضوی ڈائرکٹر: مجلس فکر رضا، لدھیانہ (پنجاب)

مجلسِ فکر رضا، لدھیانہ (سالِ قیام رجب المرجب ۱۴۳۱ھ/مطابق ۶/جولائی ۲۰۱۰ء) اپنے روزِ آغاز ہی سے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے اندر تحریک وعمل کے جذبے کو بیدار کرنے والی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں سرگرم عمل ہے۔ اور اپنے قلیلُ المدت اشاعتی سفر میں اب تک پانچ کتابیں اشاعت پذیر ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے جس کے اچھے اثرات بھی سامنے آئے۔

قارئین پر یہ مخفی نہیں ہوگا کہ صوبہ پنجاب کا معروف شہر لدھیانہ آزادی سے قبل اہلِ سنت وجماعت کے معتقدات اور معمولات کے پیروکاروں کی آماج گاہ رہا ہے لیکن آزادی کے بعد مسلمانانِ اہل سنت کی نقل مکانی کی وجہ سے یہاں دوسرے مکاتب فکر نے اپنی جڑ بہت حد تک مضبوط کر لی تھی مگر اب نہایت خوش آئند بات یہ ہے کہ یوپی و بہار سے بغرضِ ملازمت وتجارت آئے ہوئے مسلمانانِ اہل سنت جگہ جگہ مساجد ومدارس کے ذریعے یہاں اشاعتِ مسلکِ اہل سنت کا گراں قدر فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ البتّہ فکری وقلمی تحریک نہ ہونے کی وجہ سے اشاعتی سطح پر جو کمی محسوس کی جارہی تھی، پچھلے تین سالوں سے اس سمت میں مجلس فکرِ رضا اپنے مخلص ومتحرک ارکان کی عملی رفاقت اور ممتاز اہلِ قلم کے قلمی تعاون سے اپنا سلسلۂ خیر وبرکت جاری رکھے ہوئے ہے۔

مجلسِ فکرِ رضا کی یہ خوش قسمتی کہی جائے گی کہ شروع ہی سے جماعتِ اہلِ سُنَّت کے مستند ارباب فکر وقلم نے اس تنظیم کے قیام پر ہدیہ تبریک وتحسین پیش کیا اور اپنی قیمتی ہدایات سے ادارے کو سرفراز فرمایا۔ چنانچہ پہلی اشاعت ''فضائل ومسائل'' مرتبہ راقم الحروف کے بعد اہل سنت کے ممتاز صاحبِ قلم، مفکرِ اہلِ سُنَّت حضرت علاَّمہ یٰسٓ اختر مصباحی مدظلہ العالی بانی وصدر دارُ القلم دہلی نے ہماری خواہش وگذارش پر اپنی ایک اہم تصنیف ''بارگاہِ خواجۂ ہند میں امام احمد رضا کی حاضری'' اشاعت کے لئے مرحمت فرمائی جو چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس کے بعد مصلحِ قوم وملت حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی قادری مصباحی مدظلہ العالی نے سیرتِ رسول کے موضوع پر حضرت پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مجدّدی مظہری (کراچی) علیہ الرحمۃ کی تحریر جو انہوں نے جدید ترتیب کے ساتھ کتابی شکل دی تھی، اِشاعت کے لئے عطا فرمایا۔ یہ کتاب بھی بے حد پسند کی گئی۔

عرسِ رضوی ۲۰۱۱ء میں ہندوستان کی دو عظیم خانقاہوں (۱) خانقاہ عالیہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ اور (۲) خانقاہِ عالیہ قادریہ بریلی شریف کے مشائخ ومرشدان اور عُلما وفیض یافتگان کے درمیان دینی وعلمی اور روحانی رشتہ اور روابط وتعلقات پر مشتمل ساڑھے تین سو صفحات (اردو وہندی) میں ایک اہم کتاب ''مارہرہ سے بریلی تک'' مجلس کی جانب سے لائی گئی۔ اس کتاب کو بھی ہندوستان گیر مقبولیت

حاصل ہوئی اور قارئین نے مجلس کی اس تاریخی پیش کش کو داد وتحسین سے نوازا۔

یہ کتاب دراصل ساداتِ مارَہرہ مطہرہ ومشائخِ بریلی شریف کے روحانی رَوَابِط وتعلقات پر ہندوستان کے معروف اصحاب فکر وقلم کے مقالات کا خوبصورت گلدستہ ہے۔

''مارہرہ سے بریلی تک'' کی اشاعت کے بعد اسی طرح کوئی اہم اور جامع کتاب کی تلاش تھی۔ محبِّ گرامی مولانا محمد ارشاد عالم نعمانی مصباحی دارُ القلم ذاکر نگر نئی دہلی نے ابھی پچھلے ہفتہ یہ خوش خبری سنائی کہ مفکرِ اہلِ سُنَّت حضرت علاَّمہ یٰسٓ اختر مصباحی مدظلہ العالی کی ایک تازہ تصنیف ''عُلماے اہلِ سُنَّت کی بصیرت وقیادت'' چار سو بتیس (۴۳۲) صفحات میں تقریباً تیار ہے۔ یہ اگر مجلس کی جانب سے اشاعت پذیر ہو جائے تو یہ مجلس کی جانب سے قارئین کی خدمت میں ایک بیش قیمت تحفہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے اُن کے مشورے سے حضرت مصباحی صاحب کی خدمت میں اس کی اِشاعت کی منظوری کے لئے عرض کیا تو حضرت نے کمالِ شفقت وعنایت اور خندہ پیشانی کے ساتھ اشاعت کی اجازت مرحمت فرما دی۔

۲۰۰۷ء میں ۱۸۵۷ء میں عُلماے اہلِ سُنَّت کے مجاہدانہ کردار پر حضرت مصباحی صاحب کی متعدد اہم تصانیف اہلِ سُنَّت کے ذخیرہ کتب میں بیش بہا اِضافہ ثابت ہوئیں اور ہندوپاک میں زبردست پذیرائی سے سرفراز ہوئیں اور آپ کی تحریک پر ۲۰۱۱ء کا پورا سال ہندوستان بھر میں علاَّمہ فضلِ حق خیرآبادی کے ڈیڑھ سو سالہ یادگاری سال کے طور پر منایا گیا۔

رضویات پر ۱۹۷۶ء سے ۲۰۱۲ء تک حضرت مصباحی صاحب نے تسلسل سے ہزاروں صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ یوں ہی خیرآبادیات پر بھی آپ کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ رضویات وخیرآبادیات کے باب میں حضرت مصباحی صاحب امتیازی وانفرادی حیثیت وشخصیت کے مالک ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''عُلماے اہلِ سُنَّت کی بصیرت وقیادت'' میں جن شخصیات اور مشاہیرِ اسلام کی فکری قیادت وبصیرت کو پیش کیا گیا ہے وہ اہل سنت وجماعت کے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی افراد ورِجال ہماری علمی ومذہبی تاریخ کی ممتاز شخصیات ہیں۔ ان کی بصیرت وفراست ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

مجھے قوی امید ہے کہ حضرت کی یہ قیمتی تصنیف اہلِ سُنَّت کے ذخیرۂ کتب میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہوگی اور عوام وخواص اہلِ سُنَّت کی فکری وعملی رہنمائی میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

مولیٰ عَزَّ وجَلَّ کی بارگاہ میں صمیم قلب کے ساتھ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو درازیِ عمر اور صحتِ کاملہ کے ساتھ رکھے اور اسی طرح دینِ متین کی بیش بہا خدمات کی توفیق مرحمت فرماتا رہے۔ آمین۔

ایں دعا از مَن واز جملہ جہاں آمین باد

خاک پائے عُلما واولیا **محمد شمس الحق رضوی** ڈائرکٹر مجلس فکر رضا لدھیانہ

بروز دوشنبہ۔ ۴/محرم الحرام ۱۴۳۴ھ۔ ۱۹/نومبر ۲۰۱۲ء